# سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

Salman Saleem 03067163117

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

**آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:**

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

**گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔**

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کر دیا جائے گا۔

**نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے**


| 0306-7163117 | 0343-7008883 | 0333-8033313 |
| --- | --- | --- |
| محمد سلمان سلیم | پاکستان زندہ باد | راؤ ایاز |


پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

### واقعہ معراج

○ واقعہ معراج کی حقیقت و اہمیت ○ سفر معراج کی غرض و غایت ○ روایات معراج میں اختلاف کی حقیقت ○ سفر معراج کی عقلی توجیہہ ○ آیہ اسراء کی تشریح و توضیح ○ عبدیت و رسالت میں فرق مراتب ○ چند وضاحت طلب پہلو ○ واقعہ معراج، حدیث نبویؐ کے آئینے میں ○ مشاہدات معراج کا ذکر ○ معراج اور رویت باری تعالیٰ ○ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی کا مفہوم ○ حدیث معراج کا تسلسل ○ اُمت کے لیے معراج کے تحفے ○ مشرکین کا ردِ عمل ○ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تصدیق ○ ہجرت مدینہ کا فیصلہ

صفحہ نمبر 65 تا صفحہ نمبر 102

## مدنی دور

### ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک

### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے میں

○ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر ○ مواخات ○ یہودی قبائل سے معاہدے ○ فوجی مہمات کا آغاز ○ عبداللہ بن اُبی کی بدبختی ○ غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات ○ مسلح تصادم کا آغاز: واقعہ نخلہ ۔

صفحہ نمبر 105 تا صفحہ نمبر 123

### غزوۂ بدر

○ غزوۂ بدر سے قبل مشاورت ○ حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ کی آخری کوشش ○ مشرکین کی دُعائیں ○ غزوۂ بدر کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ○ فرار نہیں ہجرت ○ غزوۂ بدر کا معرکہ کارزار ○ سنت اللہ کا ظہور ○ غزوۂ بدر کے اثرات ۔

صفحہ نمبر 124 تا صفحہ نمبر 141

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

## فتح مکہ کے بعد



## مشرکین عرب کو آخری تنبیہ

Salman Saleem 03067163117

# پیش لفظ

''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''---ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر خطبات کا مجموعہ ہے' جو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام شائع کی گئی مختلف کتب کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ محترم ومکرم خالد محمود خضر' شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم اور محبوب الحق عاجز کے علاوہ شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی کی ساری ٹیم تحسین اور تشکر کی مستحق ہے جنہوں نے ان خطبات کو صفحۂ قرطاس پر اتار کر ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزارا۔ ان خطبات میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف پہلو بیان کیے گئے تھے' اس کتاب میں ان خطبات سے منتخب کیے گئے حصوں کو زمانی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ان کے اس جہاں سے پردہ فرما جانے تک کے دورِ عظیم کو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے جس انداز میں بیان کیا' وہ منفرد بھی ہے اور کئی اعتبارات سے نہایت مفید بھی۔ ڈاکٹر صاحب محض واقعات کو بیان کر کے آگے نہیں بڑھ جاتے بلکہ اپنے مخصوص اسلوب میں ان کے ایسے پہلو بھی سامنے لاتے ہیں جن تک ہر خاص وعام کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ انہوں نے واقعات کے بجائے ان میں مضمر علمی ودینی نکات کو زیادہ توجہ دی ہے۔ اس اعتبار سے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' سیرت کی دیگر تمام کتابوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ ساری زندگی ایک مفکر' مفسر اور داعئ اسلام کی حیثیت سے سرگرمِ عمل رہے۔ جدید تعلیم نے روایت کے ساتھ مل کر جو اسلوب اختیار کیا' اس کی سب سے عمدہ مثال ہمیں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ہماری یہ کتاب

Salman Saleem 03067163117

جہاں بنیادی طور پر سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متعارف کرانے کا ذریعہ ہے' وہاں جدید ذہن میں اٹھنے والے سوالات اور شبہات کے ازالے کا سبب بھی ہے۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت آپ کو اس کتاب کے ہر صفحے پر نظر آئے گا۔

میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے ذمہ داران کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پہلی اشاعت میں پائی جانے والی تسامحات و اغلاط کی نشاندہی کی اور اس اشاعت کے لیے اغلاط کی اصلاح میں نہایت فراخدلانہ اعانت فراہم کی۔

اس کتاب میں جو فٹ نوٹ لگائے گئے ہیں وہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف اور مستند کتب سے لیے گئے ہیں۔

آخر میں حافظ عبدالحنان ہاشمی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے پروف خوانی کی۔
محترم جہانزیب (ماسٹر مائنڈ)' محترم معاذ ہاشمی اور محترم عظیم احمد بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

آپ کی آراء کا منتظر

حذیفہ حسن ہاشمی
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی
مدار المہام
بک فیئر پبلشرز
فون: 0309 5005471

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117
سکین بائے ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

# مکی دور

بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک

# بعثت محمدی

## صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقصد بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات (۱) پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے، جبکہ پورے قرآن مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور تالیف "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں مفصل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقصد بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہرنوع آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظ مبارکہ پر غور وتدبر لازمی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا: ایک "الہدیٰ" اور دوسرے "دین حق"۔

---

(۱) التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸ اور الصف: ۹۔ ترجمہ: "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تا کہ غالب کر دے اسے کل دین پر"۔

Salman Saleem 03067163117

''الہدیٰ''

''الہدیٰ'' کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی، لیکن نظائر قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے ''قرآن حکیم''۔ اس لیے کہ وہی هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ [۱] بھی ہے اور هُدًى لِّلنَّاسِ [۲] بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط [۳] اور یہ بھی کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ [۴] اور وہی ہے کہ جسے جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اٹھے کہ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط [۵]

مزید برآں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ''ارسالِ رسل'' کے ضمن میں فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان''۔

ظاہر ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں جس طرح اَلْمِيْزَانَ کو دِيْنِ الْحَقِّ کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح اَلْكِتٰبَ ٹھیک اسی مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیہ زیر بحث میں اَلْهُدٰى کا لفظ آیا ہے۔ گویا اَلْهُدٰى سے مراد بعثت محمدیؐ کے ضمن میں سوائے اَلْقُرْاٰنَ کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحدید اُمُّ الْمُسَبِّحَات کا درجہ رکھتی

---

(۱) البقرۃ:۲: ''ہدایت پرہیزگاروں کے لیے''۔

(۲) البقرۃ:۱۸۵: ''ہدایت پوری نوع انسانی کے لیے''۔

(۳) الشوریٰ:۵۲: ''لیکن بنادیا ہم نے اسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے''۔

(۴) بنی اسرائیل:۹: ''یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے''۔

(۵) الجن:۱،۲: ''ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف تو ہم ایمان لے آئے اس پر''۔

Salman Saleem 03067163117

ہے اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ الصف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیر بحث الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔)

"دین الحق"

اسی طرح دِین الْحَقِّ کو بھی خواہ ظاہری ترکیب اضافی پر محمول کرلیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اسے ترکیب توصیفی بشکل ترکیب اضافی مان کر ترجمہ کرلیا جائے "سچا دین" (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی ومراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہر صورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہوسکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذات باری تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (الحج: ۶، ۶۲)

"یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے حق" (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

(۲) وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ (النور: ۲۵)

"اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھلا حق"۔

گویا "دین الحق" بالکل مساوی ومترادف ہے "دین اللہ" کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیت زیر بحث کے ضمن میں "دین الحق" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ "دین اللہ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں!)[۱] لفظ "دین" پر توجہ کو مرکوز کیجیے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ "اساس القرآن" یعنی سورۃ الفاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ[۲]

(۱) آل عمران: ۸۳، النور: ۲، النصر: ۲

(۲) یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت "کما تدین تدان" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوان حماسہ کے مشہور مصرع کے الفاظ "دناھم کما دانوا" (ہم نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کرلیں اور اسے بھی کہ عربی میں "دَین" کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

Salman Saleem 03067163117

(جولامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں )(۱)

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزاء وسزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جیسے:

(۱) اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ (الماعون)

''تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزاء وسزا کو؟''

(۲) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ (التین)

''تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزاء وسزا کے جھٹلانے پر؟''

(۳)) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ (الانفطار:۹)

''کوئی نہیں بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزاء وسزا کو!''

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ "یوم" کی اضافت کے ساتھ یومِ قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزاوسزا کا دن!

پھر چونکہ بدلے اور جزاوسزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی اطاعت ومتابعت کے تصور کو، لہٰذا لفظ ''دین'' نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اولاً اطاعت کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اور ایک بار مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ اور چھ مرتبہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے الفاظ اطاعت اور بندگی وفرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں' جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے۔ حَنِيْفًا یا حُنَفَآءَ کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ کا: اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر:۳) اور وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (النحل:۵۲) اور بالآخر اس نے نظامِ اطاعت کی صورت اختیار کر لی جس کی اضافت حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظامِ زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو، جیسے

---

(۱) جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا ''پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا!''

Salman Saleem 03067163117

سورۂ یوسف میں فرمایا:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف:۷۶)

”اس طرح ہم نے تدبیر کر دی یوسف کے لیے، ورنہ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھا کہ اپنے بھائی کو روک سکے“۔

گویا مصر کے اُس دور کے رائج الوقت نظامِ ملوکیت کو جس میں مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہ یا مَلِكٌ کو حاصل تھی، قرآن حکیم دِيْنِ الْمَلِكِ سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم (Sense) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں ”دِيْنِ اللّٰهِ“ کے الفاظ سورۃ النصر میں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

”جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح، اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج“۔

گویا آنحضور ﷺ کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ اللہ ہی کو مطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے ”دِيْنِ اللّٰهِ“ کے الفاظ سے تعبیر کیا...... (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح بہرحال نظری طور پر حاکمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں جمہور، تعبیر کیا جائے ”دینُ الجُمھور“ کے الفاظ سے!)

البتہ قرآن حکیم میں ”دین“ کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافت مجازی قرار دیا جانا چاہیے، جیسے دِيْنِيْ یا دِيْنُكُمْ یا دِيْنُهُمْ۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا اس کا دین بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دعا کے الفاظ میں: اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ.... الخ۔ اسلام اصلاً تو دین اللہ ہے لیکن مجازاً دین محمد بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فِدَاهُ اٰبَاءُنَا وَاُمَّهَاتُنَا۔

Salman Saleem 03067163117

حاصلِ کلام یہ کہ دین الحق سے مراد ہے ''دِیْنِ اللہِ'' یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی ومطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ دراصل خاتم النبیین وآخر المرسلین ﷺ کو عطا شدہ اتمامی وتکمیلی صورت ہے اس اَلْمِیْزَان کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو، عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ...... اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس ''نظامِ عدلِ اجتماعی'' کی جس میں ہر ایک کے حقوق وفرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے ''تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر''(۱)

## آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین وانتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختم نبوت' اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمت الٰہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسل انسانی گویا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی: (۱) ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسل انسانی عقلی وفکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور جنہوں نے مذاہب عالم' فلسفہ' تصوف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا' گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیح تک کا عرصہ فکر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل وشعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعتاً نیا مذہب وجود

(۱) لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:۲۵)

Salman Saleem 03067163117

میں آیا ہے نہ حقیقتاً جدید مکتب فکر یا مدرسہ فلسفہ۔ اور فلسفۂ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں...... اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ''نوعِ انساں را پیامِ آخریں!'' یعنی قرآن حکیم اَلْھُدٰی بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱- اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ (الاسراء:۹)

''یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''۔

۲- وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (الاسراء:۱۰۵)

''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا''۔

۳- قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ○ (الاسراء:۸۸)

''کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں''۔

اور اس نے پوری نوعِ انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ (البقرہ:۲۳)

''اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورۃ!''

افسوس کہ تاحال قرآن حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی

Salman Saleem 03067163117

ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت' تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں' بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اس کے قدموں میں ڈال دی گئیں' درآں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً اَلْھُدٰی ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی فکری و عملی رہنمائی ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکر انسانی بطور خود(as such) اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے بالغ ہو گیا تھا!

(۲) آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئت اجتماعیہ بھی ارتقا کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اولاً قبائلی زندگی اور اس کے بعد شہری ریاستوں (City States) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوری شدت کو پہنچ چکی تھی' اور انسان کو تمدن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں فرد بمقابلہ جماعت' مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالم انسانیت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور to be or not to be کی سی اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا۔ لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظام عدل اجتماعی عطا کر دیا جائے جو واقعتا اَلْمِیْزَان کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وسط کا تعین کر دے اور معاشرت' معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کو پوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی (Social Perversion) کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال (Economic Exploitation) کا اور نہ سیاسی جبر ( Political

Salman Saleem 03067163117

(Repression) کا، اور ارسالِ رسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا' یعنی لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وہ نبی آخر الزماں ﷺ پر تکمیل دین حق کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے پورا ہو جائے بفحوائے آیت قرآنی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو''۔

## لِيُظْهِرَهٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور لِيُظْهِرَهٗ پر غور فرمایئے۔ تو بحمد اللہ یہاں ''اظہار'' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی غالب کر دینا[1] البتہ یہاں فعل اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ اگرچہ ان سے مراد و معنی میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعل اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعل ارسال کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ میں ضمیر فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب ہو تو دور جانا صحیح نہیں الا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو' سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالم واقعہ میں قرآن حکیم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہار

---

۱) ظَھر کہتے ہیں پیٹھ کو...... اور ظاہر استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ جیسے قرآن مجید میں سورۃ الصف کے آخر میں ہے فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (پس وہی ہوئے غالب!) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے' اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے۔ اظہار باب افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعل متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

Salman Saleem 03067163117

دین حق کیلیے عالم واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شدید محنت و مشقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے کی، اگرچہ فاعل حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے، بفحوائے آیت قرآنی:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷)

"تو انہیں (کفار قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) جب آپ نے ان پر خاک پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی (وہ مشت خاک) بلکہ اللہ نے پھینکی تھی!"

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصور ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعم خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دین حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں، وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیت متذکرہ بالا نازل ہوئی اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی و جہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رخ بہتا؟ اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولت ایمان اور نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہئے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آ گئے؟ اور صورتِ حال وہ تو نہیں جو "خوئے بدرا بہانہ بسیار!" کی کہاوت میں بیان ہوئی یا جگر مرادآبادی کے اس شعر میں کہ:

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف جن میں آیت زیر بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۃ الصف تو از اول تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر اور اس میں اس آیہ مبارکہ یعنی

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (الصف: ۹) کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبہ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں؟ اور پھر صاف صاف سنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُرصعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط (الصف: ۱۰، ۱۱)

"اے اہل ایمان! کیا میں رہنمائی کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب سے؟ ایمان (محکم) رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی"۔

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی' اخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرتِ الٰہی و رسول ﷺ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیت خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی...... بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی' عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی امید موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ ﷺ کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں ان کے خلوص و اخلاص کا اصل امتحان (Test) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسول ﷺ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب و کامران ہیں، ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!!

چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرما دی:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ط (الحدید: ۲۵)

"اور تا کہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب کے باوجود"۔

اور سورۃ الصف کا اختتام بھی ہوا اس آیہ مبارکہ پر!

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ (الصف:١٤)

"اے اہل ایمان! بنو مددگار اللہ کے جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف!"

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔

لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیر مفعولی کے بارے میں بھی دو آراء ہیں: ایک یہ کہ اس کا مرجع ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسول ﷺ کی جانب...... اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے غلبے کا مطلب بھی ان کی ذات یا ان کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دین حق ہی کا غلبہ ہے۔

## عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا ترجمہ اکثر و بیشتر مترجمین نے "تمام ادیان پر" کیا ہے۔ گویا "الدِّين" کے لامِ تعریف کو لامِ استغراق قرار دیا ہے، حالانکہ یہاں جس قدر امکان لامِ استغراق کا ہے اتنا ہی لامِ جنس کا بھی ہے' چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "سب دین پر" یا "سارے دین پر" یا "کل دین پر" یا "پورے جنس دین پر" بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کے اولین اردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جلیل القدر صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایت لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر و بیشتر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چین ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تو اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اردو کے محاورے میں

Salman Saleem 03067163117

جو تبدیلی آ گئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا ترجمہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں تو ''ہر دین سے'' کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصف میں ''دینوں سے سب سے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التوبہ میں ''اوپر دین سب کے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصف دونوں مقامات پر ''اوپر دین سارے کے'' کی تعبیر اختیار کی ہے۔

گویا جہاں تک ٹھیٹھ عربی قواعد کا تعلق ہے، یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں' البتہ اگر حسب ذیل حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تر اور موزوں تر ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ ہی کا ہے:

(۱) پورے قرآن مجید میں نہ کہیں 'ادیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے' نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں الدِّيْن کا ترجمہ ''تمام ادیان'' کرنا ممکن ہو۔

(۲) تفسیر قرآن کے اہم اصول القراٰن یفسّر بعضُه بعضًا کے پیش نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے کہ الدّین کے ساتھ کُلّه کا تاکیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسب ذیل آیہ مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال:۳۹)

''اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے''۔

اور یہاں ظاہر ہے کہ ''سارے ادیان'' کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے، بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی ''پورے کا پورا دین'' یا ''سارے کا سارا دین'' اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں جبکہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ اور وَلَهُ الدِّيْنُ

Salman Saleem 03067163117

وَاصِبَا ؕ کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب الدِّیْنُ کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کا ترجمہ کیجئے تو وہ یوں ہوگا:

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو 'الھدیٰ' (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی کے اصول پر مبنی نظامِ زندگی یعنی اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کردے وہ (یعنی رسول ﷺ) اسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظام اطاعت یا نظام زندگی) پر!''

اس آیہ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یہ اِظْھَارُ دِیْنِ الْحَقِّ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہئے کہ آنحضور ﷺ کے لیے یہ 'اظہارِ دین حق'' دو وجوہات کی بنا پر لازمی ولابدی تھا:

(۱) ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنی ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گزارا کر سکتا ہے۔ جس طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیت' یہودیت اور مجوسیت یا بدھ مت اور ہندو مت ایسے مذاہب یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ [۱] کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ [۲] رہا۔ جبکہ دین ایک کلی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت یا کیپٹلزم اور کمیونزم کسی خطہ زمین پر بیک

(۱) التوبۃ: ۲۹ ''دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!''

(۲) جس کی صحیح تصویر ہے علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

Salman Saleem 03067163117

وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی جگہ ہمسر اور ہم پلہ ہو کر نہیں رہ سکتے اور ان کے مابین مفاہمت (Detente) یا پُرامن بقائے باہمی (Peaceful co-existence) کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا اسمٹ اور سکڑ کر[1] مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی[2] ہو جائے!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیش نظر رہنی چاہئیں:

ایک یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیث نبوی ﷺ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے جیسے مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی اور مذہب اہل حدیث، جن کی حیثیت دین اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے، جیسے شریعت موسوی اور شریعت محمدی ﷺ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے، تاہم از حضرت آدم علیہ السلام تا آنحضور ﷺ جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی تھا، بفحوائے آیاتِ قرآنی:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (الشوریٰ: ۱۳)

''مقرر کیا اُس (اللہ) نے تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اُس نے نوح کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبی ﷺ!) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم

---

(۱) بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی!! (اقبال)

(۲) اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۃ التوبہ کی محولہ بالا آیت کے الفاظ وَهُمْ صٰغِرُوْنَ کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتا ہے!

Salman Saleem 03067163117

السلام) کو۔ ''

(۲) نبی اکرم ﷺ کے لیے اِظہارُ دِین الحقِّ علی الدِّین کُلِّہٖ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنت (Utopia) کی حیثیت رکھتا ہے اور رسالت محمدی ﷺ کی جانب سے نوعِ انسانی پر ''شہادت'' اور ''اتمامِ حجت اور قطع عذر'' (جو سلسلہ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپؐ اس دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور ﷺ نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے غلبۂ دینِ حق کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا جو بعد میں خلافت راشدہ کے دوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ 'معجزات' عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات'' صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا روپ بھی دھار سکتے ہیں [1] اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبہ محرکہ کو برقرار رکھتے ہوئے

---

(۱) ایچ جی ویلز (H.G.Wells) کو آنحضور ﷺ سے جو بغض و عداوت ہے وہ ان رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اس نے آنحضور ﷺ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A Concise History of the World) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے' چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے' لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمد نے'' (ﷺ)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی کہ: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے)

Salman Saleem 03067163117

بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ تو اس دور کے انسان پر 'دینِ حق' کی جانب سے "اتمامِ حجت" کیسے ہو سکتا جس کے فاتح ہیں آنحضور ﷺ! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (Good) یا قدر (Value) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام و کمال اور بغایت توازن و اعتدال موجود پائے اُس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ ﷺ[1] نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدی ﷺ تک رسائی کی سعی و کوشش ہے' بقول علامہ اقبال: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ... آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست ... یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

گویا آنحضور ﷺ پر اتمامِ نعمت شریعت اور تکمیلِ دین اور ختم و اکمالِ نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپ انذار و تبشیر' دعوت و تبلیغ' وعظ و نصیحت' تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم' ہجرت' جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار

---

(۱) چنانچہ یہ 'معجزہ' نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت رہنا چاہئے (نہ کہ رامائن اور مہا بھارت اور بکرماجیت یا چندر گپت موریا کا!) واضح رہے کہ یہ الفاظ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے رسالے "ہریجن" میں 1937ء میں اس وقت لکھے تھے جب برطانوی ہند میں پہلی بار صوبائی وزارتیں بنی تھیں اور چونکہ مسلم لیگ نے 1936ء کے انتخابات کا مقاطعہ کیا تھا' لہٰذا پورے ہندوستان میں کانگریس ہی نے وزارتیں بنائی تھیں!

Salman Saleem 03067163117

سے آپ ﷺ انبیاء ورسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

## داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو بھی داعیٔ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ ﷺ کی تحقیر وتوہین ہے، لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ 'داعیٔ انقلاب' کا اطلاق اگر نسل آدم کے کسی فرد پر بتمام وکمال ہوسکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں! اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس وانقلاب روس سب کے سب جزوی تھے اور ان سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہوئی' جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئت حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں، جبکہ نبی اکرم ﷺ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد ونظریات' علوم وفنون' قانون و اخلاق' تہذیب وتمدن' معاشرت ومعیشت اور سیاست وحکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

## انقلابی جدوجہد

رہی آپ ﷺ کی انقلابی جدوجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسل انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو' پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو' پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت وجہاد وقتال کی تمام منازل سے گزار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم ﷺ کا کہ آپ ﷺ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل 23 برس (اور وہ بھی قمری) کی مختصر سی مدت میں اعلاء کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمین عرب پر دین حق کو بالفعل غالب ونافذ فرما دیا۔ فَصَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلَّم وفداہ اٰباءنا واُمّھاتنا!

Salman Saleem 03067163117

## نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طریق کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور انقلاب محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کن کن مراحل سے گزری؟ تو یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے، جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہو گی!

سردست موضوعِ زیرِ بحث کی مناسبت سے مزید دو امور کی نشاندہی مطلوب ہے:

### (۱) مغربی مفکرین کی ناسمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے فہم میں مغربی مفکرین یا مستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے، چنانچہ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلغ بھی، معلم بھی ہوتے ہیں اور مربی و مزکی بھی، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی، واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی، ریفارمر (Reformer) بھی ہوتے ہیں اور مصلح بھی۔ لیکن چونکہ ان پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ علم بھی، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبر و سیاستدان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت صرف بطور انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے۔ (۱) کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ "محمد بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے البتہ بحیثیت مدبر و سیاستدان کامیاب ہو گئے" (۲) اور کوئی آپ کی شخصیت کو دو

---

(۱) جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ: One of the greatest sons of Adam

یا جیسے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے الفاظ:

The only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

(۲) جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا:

Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman.

Salman Saleem 03067163117

مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے، چنانچہ اسے ''مکے والا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)'' اور نظر آتا ہے اور ''مدینے والا''(۱) اور۔ فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْجَاهِلِيْنَ!

## (۲) امت کا فرض منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے بتمام وکمال ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے؟ اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے      نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

تو کیا امت صرف عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منا کر' یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق وشوق کے ساتھ درود وسلام بھیج کر اپنے فرض منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور صورتِ حال واقعتاً یہ ہے کہ:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا      کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

تاہم:

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک      اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

کے مصداق گزارش ہے...... کہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختم نبوت ورسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء ورسل کیا کرتے تھے، آپ کے بعد اب وہ سب کے سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ذمے ہیں۔ گویا خواہ دعوت وتبلیغ' انذار وتبشیر' تعلیم وتربیت اور اصلاح وتزکیہ پر مشتمل فریضہ شہادت حق ہو جو بعثت انبیاء ورسل کی غرضِ اصلی اور غایت اساسی ہے' خواہ اعلاء کلمۃ اللہ' اقامت دین اور اظہارُ دینِ الحق علی الدِّین کُلِّہٖ پر مشتمل بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو' جملہ اہل ارض اور جمیع کرۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہونے کو موجب سعادت جانتے ہیں۔

---

(۱) جو وہم پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے۔ ایک Muhammad at Mecca اور دوسری Muhammad at Medina

Salman Saleem 03067163117

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، لہٰذا آپ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے' ایک اپنے زمانے کے اہل عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ چنانچہ سورۃ الجمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپ ''اُمیین'' کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور ''آخرین'' کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضور ﷺ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا:

اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً

''میں یقیناً اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!''

ان میں سے ''بعثت اُولیٰ'' کے جملہ فرائض ''شہادت علی الناس'' اور ''اظہارِ دینِ الحقِ علی الدّین کُلّہٖ'' دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفس نفیس ادا فرما دیے' خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت' تمسخر ہوا یا استہزاء' ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیت کا' مصیبتیں آئیں یا مشکلات' محنت کرنی پڑی یا مشقت' پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دور آیا یا یومِ طائف، اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابن مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا احد کا، اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ بن عبدالمطلب کا اعضا بریدہ لاشہ' خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حنین کا' اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی' آپ ﷺ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور

''یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن بر آید!''

کے مصداق آپ ﷺ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتیٰ کہ تئیس (۲۳) برس کی محنت شاقّہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتاً بالا ہو گیا، کلمہ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا اور سرزمین عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا' تا آنکہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف واکناف عرب سے آئے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے اجتماع سے آلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟[1] کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ

---

(۱) ''میں نے (آپ لوگوں تک پیغامِ الٰہی) پہنچا دیا یا نہیں؟''

Salman Saleem 03067163117

وَنَصَحْتَ![1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیق اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی بعثت عامہ کی جملہ ذمہ داریاں امت کے کاندھوں پر آ گئیں' بفحوائے آیت قرآنی: لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپ کے حقیقی جانشین تھے' خلافت راشدہ کے دوران جو واقعتاً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی' آپ کی جانب سے تبلیغ دین و شہادت علی الناس' اقامت دین اور اظہار دین الحق علی الدین کلہ کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اُس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال وانحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا، تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دین حق جو پورے روئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا ''غریب الغرباء'' بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم: ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اور

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

الغرض گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے فرض منصبی کو پہچانے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عزم نو کے ساتھ کمر بستہ ہو جائے، تاکہ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد بتمام وکمال پورا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرچم لہرا اٹھے۔

کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں!

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ، وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ
اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!

(بحوالہ ''رسول اکرم اور ہم'')

---

(۱) ''ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ بھی فرما دی' امانت ادا فرما دی اور (ہماری) خیر خواہی کا حق بھی ادا فرما دیا!''

Salman Saleem 03067163117

# حیاتِ نبوی ﷺ کے پہلے چالیس سال

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ (الضحیٰ)

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا وہ دور جو پیدائش سے لے کر آغازِ وحی تک ہے، اس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس مستند اور مصدقہ معلومات بہت کم ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے اور سورۃ الضحیٰ کی متذکرہ بالا تین آیات کو اپنے ذہن میں عنوانات کے طور پر تجویز کر لیا جائے تو حیاتِ طیبہ قبل از آغازِ وحی کے بارے میں جو بھی باتیں مصدقہ معلومات کی بنیاد پر ہمارے پاس ہیں، وہ تمام باتیں اور معلومات ان تین آیات کے ذیل میں بڑی خوبی کے ساتھ انہی کی شرح و تفسیر کی حیثیت سے تین عنوانات کے طور پر شامل ہو جائیں گی۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کی تاریخ کا تعلق ہے، محتاط ترین اندازوں کے مطابق آپ ﷺ ۹ ربیع الاول عام الفیل کو پیدا ہوئے جو انگریزی تقویم کے مطابق اغلباً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بنتی ہے۔(۱) یہاں سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا

---

(۱) اس کی مزید تفصیل کچھ یوں کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں شعب بنی ہاشم کے اندر ۹ ربیع الاول عام الفیل یوم دوشنبہ کو صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ اس وقت نوشیرواں کی تخت نشینی کا چالیسواں سال تھا اور ۲۰ یا ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کی تاریخ تھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ نے فرمایا: ”جب آپ کی ولادت ہوئی تو میرے جسم سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محل روشن ہو گئے۔“ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ ولادت کے وقت بعض واقعات نبوت کے پیش خیمہ کے طور پر ظہور پذیر ہوئے یعنی ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا، بحیرہ ساوہ خشک ہو گیا اور اس کے گرجے منہدم ہو گئے۔ یہ بیہقی کی روایت ہے لیکن محمد غزالی نے اس کو درست تسلیم نہیں کیا۔

Salman Saleem 03067163117

ابتدائی دور شروع ہوتا ہے جو دراصل اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَاٰوٰى ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞ (الضحیٰ) کی مکمل تفسیر ہے۔

آپ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو اس حال میں کہ والد ماجد عبداللہ کا انتقال آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے قبل ہی ہو چکا تھا۔[1] چھ سال تک والدہ ماجدہ کے

(۱) نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے بعد عرب کے دستور کے مطابق آپ کے لیے دایہ کی تلاش کی گئی اور حضرت حلیمہؓ بنت ابی ذویب کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ یہ قبیلہ بنی سعد بن بکر کی ایک خاتون تھیں۔ رضاعت کے دوران حضرت حلیمہؓ نے نبی ﷺ کی برکت کے ایسے ایسے مناظر دیکھے کہ حیران ہو کے رہ گئیں۔ انہی کی زبانی سنئے: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت حلیمہؓ بیان کیا کرتی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنا ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ لے کر بنی سعد کی کچھ عورتوں کے قافلے میں اپنے شہر سے باہر دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں نکلیں۔ یہ قحط سالی کے دن تھے اور قحط نے کچھ باقی نہ چھوڑا تھا۔ میں اپنی ایک سفید گدھی پر سوار تھی اور ہمارے پاس ایک اونٹنی بھی تھی۔ لیکن بخدا اس سے ایک قطرہ دودھ نہ نکلتا تھا۔ ادھر بھوک سے بچہ اس قدر بلکتا تھا کہ ہم رات بھر سو نہیں سکتے تھے، نہ میرے سینے میں بچے کے لیے کچھ تھا نہ اونٹنی اس کی خوراک دے سکتی تھی۔ بس ہم بارش اور خوشحالی کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ میں اپنی گدھی پہ سوار ہو کر چلی تو وہ کمزوری اور دبلے پن کے سبب اتنی سست رفتار نکلی کہ پورا قافلہ تنگ آ گیا۔ خیر ہم کسی نہ کسی طرح دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکہ پہنچ گئے۔ پھر ہم میں سے کوئی عورت ایسی نہ تھی جس پر رسول اللہ ﷺ کو پیش نہ کیا گیا ہو، مگر جب اسے بتایا جاتا کہ آپ ﷺ یتیم ہیں تو وہ آپ ﷺ کو لینے سے انکار کر دیتی، کیونکہ ہم بچے کے والد سے داد و دہش کی امید رکھتے تھے۔ ہم کہتے کہ یہ تو یتیم ہے۔ بھلا اس کی بیوہ ماں اور اس کے دادا کیا دے سکتے ہیں۔ بس یہی وجہ تھی کہ ہم آپ کو لینا نہیں چاہتے تھے۔ آخر میں سب کو کوئی نہ کوئی بچہ مل گیا، صرف میں رہ گئی۔ خالی ہاتھ واپس جانا مجھے اچھا نہ لگا، میں نے کہا کہ جا کر اسی یتیم بچے کو لے لیتی ہوں، میرے شوہر نے بھی کہا کہ کوئی حرج نہیں، ممکن ہے اللہ اسی میں ہمارے لیے برکت دے۔ میں نے جا کر بچہ لے لیا اور محض اس بناء پر کہ مجھے کوئی اور بچہ نہ مل سکا۔

جب میں بچے کو لے کر واپس اپنے ڈیرے پر آئی اور اسے اپنی آغوش میں رکھا تو اس نے جس قدر چاہا دونوں سینے دودھ کے ساتھ اس پر امنڈ پڑے اور اس نے شکم سیر ہو کر پیا۔ اس کے ساتھ اس کے بھائی نے بھی شکم سیر ہو کر پیا، پھر دونوں سو گئے، حالانکہ اس سے پہلے ہم اپنے بچے کے ساتھ سو نہیں سکتے تھے، ادھر میرے شوہر اونٹنی دوہنے گئے تو دیکھا کہ اس کا تھن دودھ سے لبریز ہے۔ اس نے اتنا دودھ دیا کہ ہم دونوں نے نہایت آسودہ ہو کر پیا اور بڑے آرام سے رات گزاری۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Salman Saleem 03067163117

سایۂ عاطفت میں پرورش پانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا سایہ بھی آپ ﷺ سے اٹھا لیا۔[1] نتیجتاً آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کے زیر کفالت اور زیر تربیت آئے، لیکن

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) ان کا بیان ہے کہ صبح ہوئی تو میرے شوہر نے کہا، حلیمہ! خدا کی قسم تم نے ایک بابرکت روح حاصل کی ہے۔ میں نے کہا، مجھے بھی یہی توقع ہے۔

حضرت حلیمہؓ کہتی ہیں کہ اس کے بعد ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ میں اپنی اسی خستہ حال گدھی پر سوار ہوئی اور اس بچے کو بھی اپنے ساتھ لیا، لیکن اب وہی گدھی خدا کی قسم پورے قافلے کو کاٹ کر اس طرح آگے نکل گئی کہ کوئی گدھا اس کا ساتھ نہ پکڑ سکا۔ میرے ساتھ والیاں حیران ہوکر کہتی تھیں کہ کیا اسی گدھی پر سوار ہوکر تو آئی تھی؟ میں اثبات میں جواب دیتی تو کہتیں کہ اس کا یقیناً کوئی خاص معاملہ ہے۔

پھر ہم بنوسعد میں اپنے گھروں کو واپس آگئے۔ علاقے میں قحط کا وہی عالم تھا لیکن میری بکریاں چرنے آتیں تو آسودہ حال اور دودھ سے لبریز واپس آتیں، ہم دوہتے اور پیتے جبکہ کسی اور انسان کو دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ہم اللہ کی طرف سے مسلسل اضافے اور خیر کا مشاہدہ کرتے رہے، یہاں تک کہ اس بچے کے دو سال پورے ہو گئے اور میں نے دودھ چھڑا دیا۔ اب بچے کو ماں کے پاس واپس جانا تھا لیکن ہماری خواہش تھی کہ یہ ہمارے پاس ہی رہے، اس لیے ہم نے اس کی ماں سے گفتگو کی کہ کیوں نہ آپ اپنے بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیں کہ ذرا مضبوط ہو جائے کیونکہ مجھے اس کے متعلق مکہ کی وباء کا خطرہ ہے۔ غرض ہمارے مسلسل اصرار پر انہوں نے بچہ ہمیں واپس دے دیا۔

ولادت کے چوتھے یا پانچویں سال شق صدر یعنی سینہ مبارک چاک کیے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آپؐ بنوسعد میں حضرت حلیمہؓ کے پاس ہی مقیم تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے اس واقعے کی تفصیل کچھ یوں آتی ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضرت جبریلؑ نے آپ کو پکڑ کر لٹایا اور سینہ چاک کر کے دل نکالا۔ پھر دل سے ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا، یہ تم سے شیطان کا حصہ ہے۔ پھر دل کو ایک طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر اسے جوڑ کر اس کی جگہ لوٹا دیا۔ اُدھر بچے دوڑ کر حضرت حلیمہؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا گیا۔ سب لوگ فوراً وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضور ﷺ سلامت ہیں لیکن گھبرائے ہوئے ہیں۔ اس واقعے کے بعد حضرت حلیمہؓ سعدیہ حضور ﷺ کو مکے واپس ان کی والدہ کے پاس لے آئیں۔

(۱) حضرت آمنہ اس وقت یثرب (مدینہ) سے اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کر کے واپس آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ، ان کی خادمہ ام ایمن اور حضرت عبدالمطلب بھی تھے۔ راستے میں آپ کی طبیعت خراب ہوئی اور ابواء کے مقام پر آپ وفات پا گئیں۔

Salman Saleem 03067163117

دو ہی سال بعد یتیمی کا ایک اور داغ آپ ﷺ کو دیکھنا پڑا اور انتہائی محبت اور شفقت کرنے والے دادا کی شفقت و محبت کا سایہ بھی آپ ﷺ سے اٹھالیا گیا۔[1] اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ ﷺ اپنے بڑے تایا زبیر بن عبدالمطلب کی زیر کفالت رہے، اور پھر اپنے دوسرے چچا ابوطالب کی سرپرستی میں آپ ﷺ نے اس حیاتِ دنیوی کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔[2] آپؐ نے ابتدائی دور میں شبانی (گلہ بانی) کا وہ فریضہ بھی سرانجام دیا ہے جو غالباً تمام انبیاء و رسل کا ایک مشترک وصف رہا ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے نہایت خوبصورتی سے کہا ہے:

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!

---

(۱) حضرت عبدالمطلب آپؐ کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے اور بڑوں کی طرح ان کا احترام کرتے تھے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ عبدالمطلبؓ کے لیے خانہ کعبہ کے سائے میں فرش بچھایا جاتا۔ ان کے سارے لڑکے فرش کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ عبدالمطلب تشریف لاتے تو فرش پر بیٹھتے۔ ان کی عظمت کے پیش نظر ان کا کوئی بیٹا فرش پر نہ بیٹھتا لیکن رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے تو فرش پر بیٹھ جاتے۔ ان کے چچا بے ادبی جان کر انہیں اتارنا چاہتے تو عبدالمطلب انہیں روکتے اور فرماتے: میرے اس بیٹے کو چھوڑ دو، بخدا اس کی شان نرالی ہے، پھر انہیں پاس بٹھالیتے، پیار سے تھپتھپاتے اور انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔

(۲) حضرت ابوطالب نے اپنے بھتیجے کا حق کفالت بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا، اور اپنی اولاد سے بڑھ کر انہیں عزیز رکھا۔ آپ کی زندگی کے اس دور میں چند غیر معمولی واقعات بھی پیش آئے۔ مثلاً ابن عساکر نے جلہمہ بن عرفطہ سے روایت کی ہے کہ میں مکہ آیا۔ لوگ قحط سے دوچار تھے۔ قریشؓ نے کہا: ابوطالب! وادی قحط کا شکار ہے۔ چل کر بارش کی دعا کیجئے۔ ابوطالب ایک بچہ ساتھ لے کر آئے جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابر آلود سورج ہے جس سے گھنا بادل ابھی ابھی چھٹا ہے۔ اس کے اردگرد اور بھی بچے تھے۔ ابوطالب نے اس بچے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پیٹھ کعبہ کی دیوار سے ٹیک دی۔ بچے نے ان کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نہ تھا لیکن دیکھتے دیکھتے اِدھر اُدھر سے بادل کی آمد شروع ہوگئی، اور ایسی دھواں دھار بارش ہوئی کہ وادی میں سیلاب آگیا اور شہر و بیاباں شاداب ہوگئے، بعد میں ابوطالب نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی مدح میں کہا تھا: ''وہ خوبصورت ہیں، ان کے چہرے سے بارش کا فیضان طلب کیا جاتا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Salman Saleem 03067163117

آپ ﷺ نے گلہ بانی بھی کی، اور یہ بات جان لینی چاہئے کہ عرب کے لق ودق صحرا میں، ایک ایسی فضا میں جہاں دور دور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا ہو، اوپر آسمان کا سایہ، نیچے پھیلی ہوئی زمین، اِدھر اُدھر پہاڑ۔ یہ درحقیقت فطرت سے قریب ترین ہونے کی ایک کیفیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ابتدائی دور اس کیفیت میں بسر کیا ہے، گویا کتاب فطرت کا مطالعہ دل کھول کر کیا، جس کی طرف ایک اشارہ ہے قرآن مجید کے آخری پارے کی سورۂ مبارکہ میں:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ (الغاشیہ)

''کیا یہ دیکھتے نہیں اونٹ کی تخلیق کو کہ اس میں کیسی کیسی نشانیاں مضمر ہیں اللہ کی حکمت اور قدرت کی! انہیں اندازہ نہیں کہ آسمان کی رفعت کیا اشارے کر

---

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) یتیموں کے ماویٰ اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔''

بعض روایات کے مطابق، جن کی استنادی حیثیت مشکوک ہے، جب آپ ﷺ کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی تو ابو طالب آپ ﷺ کو ساتھ لے کر تجارت کے لیے ملک شام کے سفر پر نکلے اور بُصریٰ پہنچے جو کہ شام کا ایک مقام اور حوران کا مرکزی شہر ہے۔ اس وقت یہ جزیرۃ العرب کے رومی مقبوضات کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر میں جرجیس نامی ایک راہب رہتا تھا جو ''بحیرا'' کے لقب سے معروف تھا۔ جب قافلے نے وہاں پڑاؤ ڈالا تو یہ راہب اپنے گرجا سے نکل کر قافلے کے اندر آیا اور اس کی میزبانی کی حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو آپؐ کے اوصاف کی بناء پر پہچان لیا اور آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: یہ سید العالمین ہیں۔ اللہ انہیں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گا۔ ابو طالب نے کہا: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا: تم لوگ جب گھاٹی کے اس جانب نمودار ہوئے تو کوئی بھی درخت یا پتھر ایسا نہ تھا جو سجدہ کے لیے جھک نہ گیا ہو اور یہ چیزیں نبی کے علاوہ کسی اور انسان کو سجدہ نہیں کرتیں، پھر میں انہیں مہر نبوت سے پہچانتا ہوں جو کندھے کے نیچے نرم ہڈی کے پاس سیب کی طرح ہے، اور ہم انہیں اپنی کتابوں میں بھی پاتے ہیں۔

اس کے بعد بحیرا راہب نے ابو طالب سے کہا کہ انہیں واپس بھجوا دو، ملک شام نہ لے جاؤ کیونکہ یہود سے خطرہ ہے۔ اس پر ابو طالب نے بعض غلاموں کی معیت میں آپ ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیا۔

Salman Saleem 03067163117

رہی ہے! کیا پہاڑوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے جما دیئے گئے ہیں! کیا یہ غورنہیں کرتے کہ زمین کی وسعت کس بات کی گواہی دے رہی ہے!'' (مفہوم)

یہ ہے وہ کتابِ فطرت جس کے مطالعے سے انسان اپنے فاطر کے قریب ترین آتا ہے، اوراس کے بھرپور مواقع محمد رسول اللہ ﷺ کو بالکل ابتدائی زندگی میں میسر آئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے کاروبار شروع فرمایا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی خانقاہ میں تربیت حاصل نہیں کی، کسی گوشے میں بیٹھ کر کوئی نفسیاتی ریاضتیں کر کے تزکیہ نفس نہیں کیا۔ آپ ﷺ زندگی کے عین منجدھار میں رہے، آپ ﷺ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپ ﷺ نے اپنے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار کیا اور اس کاروبار میں لوگوں نے آپ ﷺ کے اخلاق اور آپ ﷺ کی سیرت و کردار کا لوہا تسلیم کیا۔ آپ ﷺ کے حسن معاملہ اور دیانت وامانت کی وجہ سے آپ ﷺ کو "الصادق" اور "الامین" کا خطاب آپ ﷺ کے معاشرے نے دیا۔ تو یہ خطابات ایسے ہی نہیں مل گئے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کے کردار کا لوہا لوگوں نے اگر واقعتاً مانا ہے تو اپنے تجربات کی بنیاد پر مانا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ایک صحابی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آغازِ وحی سے قبل کسی کاروباری معاملہ میں میری اور محمد ﷺ کی کچھ گفتگو ہو رہی تھی، اچانک مجھے کوئی کام یاد آیا اور میں حضور ﷺ سے اجازت لے کر چلا گیا کہ ذرا آپ انتظار فرمائیں، مَیں ابھی آیا۔ حضور ﷺ نے وعدہ فرمالیا کہ اچھا میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں کہیں گیا اور جا کر کچھ ایسا مصروفیات میں گم ہوا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ تین دن بعد اچانک یہ خیال آیا کہ میں نے تو محمد ﷺ سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ گھبرایا ہوا اس جگہ پہنچا تو میں نے یہ دیکھا کہ محمد ﷺ وہیں مقیم تھے۔ آپ ﷺ نے مجھے کوئی ملامت نہ کی، فرمایا تو صرف اس قدر کہ بہرحال میں اپنے وعدے کی بنیاد پر پابند ہو گیا تھا کہ یہیں تمہارا انتظار کرتا...... یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اہل مکہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا کس قسم کا تجربہ ہوا تھا۔ یہ آپ ﷺ کا اخلاق و کردار تھا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ ان کی آنکھوں کا تارا بنے اور آپ ﷺ کو انہوں نے

Salman Saleem 03067163117

"الصادق" اور "الامین" کا خطاب دیا۔

آپ ﷺ کی جوانی کے دور کے چند اور واقعات میں سے ایک جنگ فجار میں آپ ﷺ کی شمولیت ہے۔ آپ ﷺ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب بنی ہاشم کے علم بردار تھے اور آپ ﷺ بھی ان کے پہلو بہ پہلو اس جنگ میں شریک ہوئے، اس لیے کہ قریش اس جنگ میں حق پر تھے۔ اگرچہ اس کی صراحت ملتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے کسی کا خون نہیں بہایا۔ اس لیے کہ صرف قومی یا خاندانی معاملات کے لیے کسی انسانی جان کا لینا، یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا۔(۱) اس جنگ کے بعد قریش کے کچھ نوجوانوں نے ایک عہد کیا جسے "حلف الفضول" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کی مخالفت کریں گے، مظلوم کی حمایت کریں گے، حق اور صداقت کے راستے کی تلقین کریں گے۔ آنحضور ﷺ بھی اس حلف میں شریک ہوئے اور آپ ﷺ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی اگر اس قسم کے کسی معاہدے کی طرف مجھے دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔(۲)

---

(۱) جنگ فجار میں ایک طرف قریش اور ان کے ساتھ بنو کنانہ تھے اور دوسری طرف قیس عیلان تھے۔ قریش اور کنانہ کا کمانڈر حرب بن امیہ تھا کیونکہ وہ اپنے سن و شرف کی وجہ سے قریش و کنانہ کے نزدیک بڑا مرتبہ رکھتا تھا۔ پہلے پہر کنانہ پر قیس کا پلہ بھاری تھا لیکن دوپہر ہوتے ہوتے قیس پر کنانہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اسے حربِ فجار اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں حرم اور حرام مہینے دونوں کی حرمت چاک کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ کا اس جنگ میں حصہ اسی قدر تھا کہ اپنے چچاؤں کو تیر تھماتے تھے۔

(۲) حلف الفضول میں قریش کے چند قبائل یعنی بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی اسد بن عبدالعزیٰ، بنی زہرہ بن کلاب اور بنی تیم بن مرہ نے اس کا اہتمام کیا۔ یہ لوگ عبداللہ بن جدعان تیمی کے مکان پر جمع ہوئے کیونکہ وہ سن و شرف میں ممتاز تھا، اور آپس میں عہد و پیمان کیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا، خواہ کے کا رہنے والا ہو یا کہیں اور کا، یہ سب اس کی مدد اور حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا حق دلوا کر رہیں گے۔ اس معاہدے کی روح عصبیت کی تہ سے اٹھنے والی جاہلی حمیت کے منافی تھی۔ اس معاہدے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ زبید کا ایک آدمی سامان لے کر مکہ آیا اور عاص بن وائل نے اس سے سامان خریدا لیکن اس کا حق روک لیا۔ اس نے حلیف قبائل عبدالدار، مخزوم، جمح، سہم اور عدی سے مدد کی درخواست کی لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کے بعد نے جبل ابوقبیس پر چڑھ کر بلند آواز سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Salman Saleem 03067163117

خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر بھی آپ ﷺ کے تدبر اور فراست کا ایک بہت ہی نادر نمونہ سامنے آیا۔(۱) الغرض آپ ﷺ کی زندگی کا یہ جو دور ہے، اس میں ہمیں وہ مظہر نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارہ ملتا ہے قرآنِ مجید کی سورۂ نون میں جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے:

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) چند اشعار پڑھے جن میں اپنی داستانِ مظلومیت بیان کی تھی۔ اس پر زبیر بن عبدالمطلب نے دوڑ دھوپ کی اور کہا کہ یہ شخص بے یار و مددگار کیوں ہے؟ ان کی کوشش سے اوپر ذکر کیے ہوئے قبائل جمع ہو گئے۔ پہلے معاہدہ طے کیا اور پھر عاص بن وائل سے اس زبیدی کا حق دلایا۔

(۱) آپ ﷺ کی عمر کا پینتیسواں سال تھا کہ قریش نے نئے سرے سے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ وجہ یہ تھی کہ کعبہ صرف قد سے کچھ اونچی چہار دیواری کی شکل میں تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے ہی سے اس کی بلندی ۹ ہاتھ تھی اور اس پر چھت نہ تھی۔ اس کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ چوروں نے اس کے اندر رکھا ہوا خزانہ چرا لیا۔ اس کے علاوہ اس کی تعمیر پر ایک طویل زمانہ گزر چکا تھا۔ عمارت خستگی کی شکار ہو چکی تھی اور دیواریں پھٹ گئی تھیں۔ ادھر اسی سال ایک زوردار سیلاب آیا جس کے بہاؤ کا رخ خانہ کعبہ کی طرف تھا۔ اس کے نتیجے میں خانہ کعبہ کسی بھی لمحے ڈھے سکتا تھا۔ اس لیے قریش مجبور ہو گئے کہ اس کا مرتبہ و مقام برقرار رکھنے کے لیے اسے ازسرِنو تعمیر کریں۔ اس مرحلے پر قریش نے متفقہ فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں صرف حلال رقم ہی استعمال کریں گے، اس میں رنڈی کی اجرت، سود کی دولت اور کسی کا ناحق لیا ہوا مال استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

جب تعمیر حجر اسود تک بلند ہو چکی تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا شرف و امتیاز کسے حاصل ہو۔ یہ جھگڑا چار پانچ روز تک جاری رہا اور رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سرزمین حرم میں سخت خون خرابہ ہو جائے گا، لیکن ابو امیہ مخزومی نے یہ کہہ کر فیصلے کی ایک صورت پیدا کر دی کہ مسجد حرام کے دروازے سے دوسرے دن جو سب سے پہلے داخل ہو، اس جھگڑے کا فیصلہ اس سے کرایا جائے اور سب اس کا فیصلہ منظور کریں۔ تمام قبائل نے یہ شرط منظور کر لی۔ اللہ کی مشیت کہ اس کے بعد سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا تو چیخ پڑے کہ یہ امین ہیں، ہم ان سے راضی ہیں، یہ محمد ﷺ ہیں۔ معاملے کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد آپ ﷺ نے ایک چادر طلب کی، بیچ میں حجر اسود رکھا اور جھگڑنے والے قبائل کے سرداروں سے کہا کہ آپ سب حضرات چادر کا کنارہ پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب چادر حجر اسود کے مقام تک پہنچ گئی تو آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا۔ یہ نہایت عمدہ فیصلہ تھا اور ساری قوم اس پر راضی ہو گئی۔

Salman Saleem 03067163117

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾

''اور (اے محمد ﷺ!) بلاشبہ آپ ﷺ اخلاقِ حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہیں۔''

کاروبار ہی کے ضمن میں آنحضور ﷺ کا تعلق یا آپ ﷺ کا معاملہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ایک طرف یہ عرب کی متمول ترین خاتون تھیں۔ چنانچہ روایات میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ جب قریش کے قافلے سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے تو تنہا ان رضی اللہ عنہا کا سامانِ تجارت باقی تمام لوگوں کے مجموعی سامان سے زیادہ ہوتا تھا۔ پھر دوسری طرف ان رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت اور پاکدامنی کا عالم یہ تھا کہ عرب کے اس معاشرے میں ان رضی اللہ عنہا کو "الطاہرہ" کا خطاب دیا گیا۔ یہ گویا بالکل فطری اور قرین عقل اور قرین قیاس بات ہے کہ یہ قِرَانُ السَّعدَین ہوتا اور "الصادق" اور "الامین" کا نکاح "الطاہرہ" سے ہوتا۔ مشیت الٰہی میں یہی طے تھا۔ بہرحال حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی صورت میں وہ بات سامنے آتی ہے جو سورۃ الضحیٰ میں بایں الفاظ وارد ہوئی:

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾

''(اے محمد ﷺ) اور پایا آپ کو تنگ دست، پس (آپ کو) غنی کر دیا۔''

جہاں تک قلب محمدی ﷺ کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ غنی تھا، لیکن ظاہری اور دنیوی اعتبار سے جسے ہم تنگ دستی کہتے ہیں اس کی اگر کوئی کیفیت نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اب تک رہی بھی تھی تو اب جبکہ مکہ کی متمول ترین خاتون رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے حبالۂ عقد میں تھیں، جو انتہائی جاں نثار اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والی بیوی تھیں، اس کے بعد اس دنیوی احتیاج یا کمزوری کا بھی کوئی معاملہ باقی نہ رہا۔ (۱)

---

(۱) کئی بڑے بڑے سردار اور رئیس حضرت خدیجہؓ سے شادی کے خواہاں تھے لیکن انہوں نے کسی کا پیغام منظور نہ کیا تھا۔ حضور ﷺ کے اخلاق اور اطوار دیکھ کر انہوں نے اپنی سہیلی نفیسہ بنت منبہ سے بات کی اور انہوں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے گفت و شنید کی۔ آپ ﷺ راضی ہو گئے اور اپنے چچاؤں سے اس معاملے پر بات کی۔ انہوں نے حضرت خدیجہؓ کے چچا سے بات کی اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضور ﷺ کی زندگی کا یہ دور ایک بھرپور انسانی زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک محبت کرنے والی جاں نثار اور وفادار بیوی رفیقۂ حیات ہیں ...... اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان زوجہ محترمہ سے اولاد بھی عطا فرمائی۔ ایک انتہائی باعزت اور بافراغت زندگی آپ ﷺ بسر فرما رہے تھے۔ لیکن اب آپ ﷺ کے اندر ایک داعیہ ابھرا اور توجہ کائنات، خالقِ کائنات اور عالمِ بالا کی طرف مبذول و منعطف ہوئی۔ اب غور وفکر کا مادہ کسی اور رخ پر پروان چڑھنا شروع ہوا۔ چنانچہ ہمیں وہ روایت ملتی ہے جس کی راویہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اور بخاری شریف میں یہ روایت پہلے ہی باب میں موجود ہے کہ جب آپ ﷺ کی عمر شریف چالیس برس کے لگ بھگ ہوئی تو آپ ﷺ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی اور آپ ﷺ غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرماتے تھے:

حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ ﷺ عبادت کرتے تھے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کس قسم کی تھی! آپ ﷺ کسی سابقہ امت میں نہ تھے، کسی نبی کے پیرو نہ تھے، کوئی عبادت کا طریقہ ایسا نہیں تھا کہ جو آپ ﷺ کو کسی اور نبی کی پیروی یا کسی اور امت میں ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام

---

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) شادی کا پیغام دیا۔ اس کے بعد شادی ہوگئی۔ نکاح میں بنی ہاشم اور رؤسائے مضر شریک ہوئے۔ آپ ﷺ نے مہر میں بیس اونٹ دیئے۔ اُس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی، اور وہ نسب و دولت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اپنی قوم کی سب سے معزز اور افضل خاتون تھیں، یہ پہلی خاتون تھیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے شادی کی اور ان کی وفات تک کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں کی۔ ابراہیم کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی ساری اولاد انہی سے ہوئی۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے اور انہی کے نام پر رسول اللہ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم پڑی۔ پھر زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ عبداللہ کا لقب طیب اور طاہر تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بیٹے بچپن ہی میں انتقال کر گئے البتہ بچیوں میں سے ہر ایک نے اسلام کا زمانہ پایا، مسلمان ہوئیں اور ہجرت کے شرف سے مشرف ہوئیں، لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا باقی سب کا انتقال آپ ﷺ کی زندگی ہی میں ہوگیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات آپ ﷺ کی رحلت کے چھ ماہ بعد ہوئی۔

Salman Saleem 03067163117

سے ابھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ تو یہ عبادت کیسی تھی! اس کا جواب شارحین حدیث نے یہ دیا ہے کہ: كَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِيْ غَارِ حِرَاءَ التَّفَكُّرُ وَ الاِعْتِبَارُ یعنی غارِ حرا میں آپ ﷺ کی عبادت غور و فکر اور عبرت پذیری پر مشتمل تھی۔ سوچ بچار، کتابِ فطرت کا مطالعہ، خود اپنی فطرت کی گہرائیوں میں غواصی اور نگاہِ عبرت سے ماحول کا جائزہ و تجزیہ، یہ تھی آپ ﷺ کی غارِ حرا میں عبادت۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

یہ غور و فکر کہ نوعِ انسانی کس حالت میں مبتلا ہے، خاص طور پر خود آپ ﷺ کی قوم اخلاق کے اعتبار سے کتنی پستی میں مبتلا ہو چکی ہے، کس طرح کے شرک کا دور دورہ ہے، معبودِ حقیقی سے لوگ کس طرح اپنا رخ موڑ چکے ہیں۔ یہ سارا غور و فکر نوعِ انسانی کی ضلالت اور گمراہی پر وہ بھاری رنج و غم تھا جس کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار گواہی ملتی ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳ (الشعراء)

”آپ (ﷺ) تو شاید اپنے آپ کو اس رنج اور صدمے کی وجہ سے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے!“

یہ وہ کیفیات تھیں جن کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ اسی عالم میں پردے اٹھتے ہیں، اور صرف پردے ہی نہیں اٹھتے بلکہ آپ ﷺ پوری نوعِ انسانی کی ہدایت پر مامور کیے جاتے ہیں اور آپؐ کا دورِ دعوت تا قیامِ قیامت مقرر کیا جاتا ہے:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر، کرتے ہیں خطاب آخر!

یہ ہے تفسیر سورۃ الضحیٰ کے ان الفاظ کی:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷

”اور (اللہ نے) پایا آپ ﷺ کو (حقیقت کی تلاش میں) سرگرداں تو آپ ﷺ پر راہِ ہدایت منکشف کر دی۔“

Salman Saleem 03067163117

گویا غارِ حرا کی خلوتوں میں آپ ﷺ حقیقت کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ پس دروازے کھول دیئے گئے، پردے اٹھا دیئے گئے، حضرت جبرائیل امین سے ملاقات ہوئی، وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی ملاقات جس میں نزولِ وحی کا آغاز ہوا، بیداری اور نیند کے بین بین کی سی کیفیت، یعنی نیم بیداری کے عالم میں ہوئی۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کے پاس کوئی لکھی ہوئی تختی تھی جس پر یہ آیات مرقوم تھیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵ (العلق)

تین مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا:

{مَا اَنَا بِقَارِئٍ} ''میں پڑھ نہیں سکتا۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کے بعد اس وحی کا آپ ﷺ کے قلب مبارک میں نقش قائم ہو گیا۔ یہاں سے گویا محمد رسول اللہ ﷺ کا آفتابِ رسالت طلوع ہو گیا۔ اس کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ رہا ہے، پھر جو آیات نازل ہوئیں وہ سورۃ المدثر کی یہ ابتدائی آیات تھیں:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳

یعنی اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جایئے، کمر کس لیجئے! فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہو جایئے اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کیجئے اور اس کی کبریائی کو فی الواقع دنیا میں قائم کیجئے۔ یہ ترجمانی ہے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کی۔ بہت سے محققین کی یہ رائے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ان ابتدائی آیات سے آپ ﷺ کی رسالت کا آغاز ہوا۔ واللہ اعلم!

(بحوالہ ''رسول کامل ﷺ'')

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

# وحی کا آغاز

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (التوبہ: ۳۳، الصف: ۹)

نبوت و رسالت کا اصل مقصد خلق خدا کی ہدایت و رہنمائی کے ساتھ ساتھ محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں اتمامِ حجت ہے۔ چنانچہ عدالت اُخروی میں جب قوموں اور امتوں کا محاسبہ ہوگا تو ان کی طرف جن رسولوں کو بھیجا گیا ہے، سب سے پہلے وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت و رہنمائی اور تیرا پیغام جو ہم تک پہنچا تھا، ہم نے بلاکم و کاست قولاً بھی اور عملاً بھی ان تک پہنچا دیا تھا۔ یہی وہ گواہی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں رسولوں کے لیے شاہد اور شہید کا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر نبوت ختم بھی ہوئی اور نبوت و رسالت اتمام اور تکمیل کو بھی پہنچی۔ اس اتمامِ نبوت اور تکمیل رسالت کے دو مظہر بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ نوعِ انسانی شعوری اور عقلی اعتبار سے عہد طفولیت سے نکل کر اپنے بلوغ کو پہنچ گئی اور گویا اس قابل ہوگئی کہ ابدی اور مکمل ہدایت نامہ اس کو دے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اس دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں اصل اہمیت نظامِ اجتماعی کو حاصل ہو رہی تھی، لہٰذا ضرورت تھی کہ ہدایت خداوندی اب صرف انفرادی اخلاق و کردار کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک مکمل اجتماعی نظام زندگی کی صورت میں سامنے آئے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے انصاف کیا گیا ہو اور کوئی قدر بھی اس میں پامال اور مجروح نہ ہو۔ مساوات، آزادی و حریت کی قیمت (Cost) پر نہ ہو اور حریت و آزادی کا یہ نتیجہ نہ نکلے کہ نوعِ انسانی مراعات یافتہ (Haves) اور

مراعات سے محروم (Have- Nots) طبقات میں تقسیم ہو کر رہ جائے۔ کسی جگہ تو ارتکازِ دولت ہو جائے اور کوئی اپنی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو جائے۔ ایک متوازن نظامِ عدل و قسط اب نوعِ انسانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی، لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو یہی دو چیزیں دے کر بھیجا گیا: ایک الہدیٰ یعنی قرآن مجید' جو ابدی ہدایت نامہ قرار دیا گیا اور دوسرے دین حق یعنی عدل و قسط پر مبنی مکمل اجتماعی نظامِ زندگی۔ اور آپ ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ ایک طرف تو قرآن کی تبلیغ کا حق ادا کر دیں اور دوسری طرف دین حق کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیں تاکہ نوعِ انسانی کے سامنے اس کا ایک نمونہ بھی آ جائے۔ یہ نظامِ عدل و قسط صرف نظری سطح پر پیش نہ کیا جائے بلکہ اس کو قائم کر کے چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ گویا اس دور میں اصل اتمامِ حجت ہے جس کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا: {لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ}۔ اس کے بارے میں گزشتہ نشست کے آخر میں یہ بات عرض کی گئی تھی کہ اس پہلو سے نبی اکرم ﷺ کی تیئس سالہ جدوجہد ایک مکمل انقلابی جدوجہد ہے۔ اگرچہ اس میں دعوت بھی ہے' تبلیغ بھی ہے' تربیت بھی ہے' تزکیہ بھی ہے' تعمیر اخلاق بھی ہے' تطہیر فکر بھی ہے' لیکن اس تیئس سالہ جدوجہد میں ایک مکمل انقلابی جدوجہد کا نقشہ ملتا ہے۔

## نسل انسانی کی عظیم ترین شخصیت

الحمدللہ' دورِ حاضر میں ایک احیائی عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک بیداری ہے' عروج کی طرف ایک حرکت شروع ہو چکی ہے۔ وہ جو مولانا حالی نے کہا تھا کہ

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

وہ بات اب نہیں ہے' دریا اب مد کی طرف آ رہا ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس

Salman Saleem 03067163117

دور میں اب مسلمانوں کو اور اسلامی ثقافت کو سمجھنے کی واقعتاً سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے۔ اب تک یورپ نے مسلمانوں کو یا اسلام کو سرے سے کوئی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ استہزاء ہوتا تھا، تمسخر ہوتا تھا، لیکن اب وہ بات نہیں ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اب نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو حالات اور حقائق کے قرینے (Context) میں سمجھا جائے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "The Hundred" اور اس کے مصنف ہیں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ۔ اس کتاب پر Times اور Newsweek جیسے جرائد میں پورے پورے صفحے کے تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں معلوم انسانی تاریخ میں سے ایسے ایک سو انسانوں کا انتخاب کر کے ان کی درجہ بندی (Gradation) کی گئی ہے جنہوں نے انسانی تمدن کے دھارے کے رخ کو موڑنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اور اس درجہ بندی میں اس مصنف نے سرفہرست رکھا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ گویا تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نسل انسانی کی عظیم ترین شخصیت ہیں محمد ﷺ۔ وہ شخص خود تو اپنی جگہ پر کوئی سند نہیں ہے لیکن جو بات اس نے کہی ہے وہ اس کی ذہانت و فطانت کی غمازی کرتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں زندگی کے دو دائرے ہیں، مذہبی دائرہ اور سیکولر دائرہ۔ گویا سیاست و مملکت اور تہذیب و تمدن کا دائرہ اور ہے جبکہ مذہب کا دائرہ اور ہے۔ اس نے تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں محمد عربی ﷺ کو سرفہرست رکھنے کی دلیل یہ دی ہے کہ آپ ﷺ نسل انسانی کی واحد شخصیت ہیں جو زندگی کے دونوں دائروں میں مساوی طور پر کامیاب ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجئے:(۱)

> **"My choice of Muhammad to lead the list of the world`s most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."**

---

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۷۸ء کا ہے۔ متذکرہ بالا کتاب اسی سال شائع ہوئی تھی۔

Salman Saleem 03067163117

چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا ایک اجمالی نقشہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں۔ لیکن اس سے قبل انقلابات عالم میں انقلاب محمدی ﷺ کا جو مقام ہے اس پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔

## دنیا کا واحد جامع ترین انقلاب

آنحضور ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب دو اعتبارات سے دنیا کے بڑے بڑے انقلابات سے انتہائی ممیز ہے۔ ایک تو جامعیت کے پہلو سے، اس لیے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے انقلابات کا شہرہ ہے وہ سب کے سب جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں صرف ہیئت حاکمہ یا طرزِ حکومت بدلا ہے۔ اخلاق نہیں بدلے۔ نظریات نہیں بدلے۔ کردار نہیں بدلا۔ تہذیب وتمدن اور معاشرت کا نقشہ نہیں بدلا۔ مذہب نہیں بدلا' عقائد نہیں بدلے۔ صرف ایک انتظامی ڈھانچہ بدلا ہے۔ ظاہر ہے طرزِ حکومت کی تبدیلی محض ایک جزوی انقلاب ہے۔ اسی طرح بالشویک ریوولیوشن اگرچہ اپنے اثرات کے اعتبار سے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا انقلاب شمار ہوتا ہے لیکن یہاں بھی تجزیہ کیجئے تو ثابت ہوگا کہ وہ بھی جزوی انقلاب ہے۔ نظریات میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلے سے موجود مادہ پرستی (Materialism) نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ گویا مادیت کا اگلا قدم ہے۔ انقلاب کہتے ہیں تبدیلی کو، لیکن یہاں تبدیلی کوئی نہیں آئی۔ مادیت کی جگہ روحانیت کا آغاز ہوتو وہ انقلاب ہوگا۔ مادیت ہی کے راستے پر آپ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تو اس میں انقلاب کا کوئی پہلو نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کیا چیز بدلی؟ بس ایک کوشش کی گئی کہ کسی ملک کے وسائل پیداوار اور ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لاکر ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے رہنے والے سب کے سب اس سے متمتع ہوں۔ اس مقصد میں کتنی کامیابی ہوئی اور جو ہوئی وہ کس Cost پر ہوئی' اس کو چھوڑیے۔ اس وقت اس انقلاب کا حوالہ صرف اس اعتبار سے دیا گیا ہے کہ وہ بھی ایک جزوی انقلاب تھا۔

Salman Saleem 03067163117

اس پس منظر میں اب نبی اکرم ﷺ کے انقلاب کو دیکھئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہاں آپ کو خوردبین لگا کر ڈھونڈنا پڑے گا کہ کیا چیز نہیں بدلی! عقائد بدلے' اخلاق بدلے' انفرادی زندگی بدلی' ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ بدلا۔ ایک قوم جس میں لکھے پڑھے لوگ گنتی کے تھے وہ قوم علوم وفنون کی موجد اور نوع انسانی کی معلم بن گئی۔ وہ قوم جس میں کوئی تنظیم نہ تھی' ایسی منظم ہوئی کہ نہ صرف میدانِ جنگ میں اس کی تنظیم بے مثال قرار پائی بلکہ وہ عبادت بھی کر رہی ہے تو ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر۔ گویا زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے آپ کہہ سکیں کہ وہی رہ گئی جو پہلے تھی۔ یہ ہے ہمہ گیر انقلاب کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی متوازی نہیں' اس کی کوئی نظیر نہیں۔

ایک دوسری خصوصیت کے اعتبار سے بھی اس انقلاب کی پوری انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا میں جو انقلابات واقع ہوتے ہیں تو انقلاب کا فکر دینے والا کوئی اور ہوتا ہے اور اس انقلاب کو برپا کرنے والے کچھ اور لوگ ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بالعموم جامعیت نہیں پائی جاتی۔ جس شخص کی فکر اور سوچ کی قوتیں زیادہ فعال (Developed) ہوتی ہیں اس میں قوت عمل کم ہوتی ہے اور جس کے قوائے عملیہ زیادہ چاق وچوبند ہوتے ہیں عام طور پر اس کی سوچ کی قوتیں اتنی بیدار نہیں ہوتیں۔ لہٰذا انقلابات کا معاملہ ایسا ہی نظر آتا ہے کہ مفکر کوئی اور ہوتا ہے اور عملی رہنما کوئی اور بنتا ہے۔ چنانچہ انقلابِ فرانس کی پشت پر فکر تو والٹیئر' روسو اور دوسرے مفکرین کا تھا' لیکن انقلاب بالفعل کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں آیا۔ ان مفکرین کا اس کی عملی رہنمائی میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ اسی طرح بالشویک انقلاب کا مفکر کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) تھا لیکن اس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو اس کی موت کے کئی سال بعد ایک بالکل دوسرے ملک میں ایک فعال شخص لینن (۱۸۷۰ء تا ۱۹۲۴ء) کے ہاتھ میں وہ فلسفہ آیا اور اس نے اس کی بنیاد پر انقلاب برپا کر دیا۔

اس پس منظر اور اس Context میں نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا جائزہ لیجئے۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تئیس برس میں انقلاب برپا ہو گیا۔ (واضح رہے کہ یہ

تیئس برس قمری حساب سے ہیں، جو شمسی حساب سے بائیس برس بنتے ہیں) ایک عرصہ زندگی (Life Span) میں ایک انقلابی جدوجہد کا تمام مراحل سے گزر کر کامیابی سے ہمکنار ہو جانا، اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ کے دامن میں موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دنیوی زندگی بڑی مختصر رہی ہے، محض اکسٹھ برس۔ ہم جو تریسٹھ برس کہتے ہیں وہ قمری اعتبار سے ہیں، جو دراصل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس بنتے ہیں۔ ان میں سے قبل بعثت کے چالیس سال نکال دیجئے تو کل ساڑھے اکیس، بائیس برس ہیں، جن میں ایک عظیم انقلاب تمام مراحل طے کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پوری نسل انسانی کی تاریخ میں اس کے آس پاس تو کیا اس کے عُشرِ عشیر کی بھی مثال نہیں ملتی۔

اب آیئے اس بات کی طرف جو اس انقلابی جدوجہد کا اہم ترین پہلو ہے۔ یہ پوری جدوجہد زمین پر ہوئی ہے، قدم بقدم چل کر ہوئی ہے۔ خالص انسانی سطح (Human level) پر ہوئی ہے، اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قواعد و ضوابط اور اسباب و علل کا جو سلسلہ چل رہا ہے ان کے تحت ہوئی ہے۔ اور اس کو یوں سمجھئے کہ یہ بھی درحقیقت اتمامِ حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ نظام قائم کر کے دکھا دینا اتمامِ حجت ہے پوری نوعِ انسانی پر، اور اس کو ایک عام انسانی جدوجہد کی سطح پر تمام موانع و مشکلات کے باوجود قائم کر کے دکھانا، ابتدائی دور میں ناکامیوں کا طرح طرح سے سامنا کر کے اور مصائب و مشکلات کو جھیل کر قائم کر کے دکھانا، یہ درحقیقت حجت ہے مجھ پر، آپ پر اور پوری امت محمد ﷺ پر۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے تو یہ کام کر دیا، اس لیے کہ آپ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصیات حاصل تھیں کہ آپ ﷺ کے تو پاؤں میں کانٹا بھی نہیں چبھا، آپ ﷺ کی تو نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ آپ ﷺ کے لیے تو کہیں کوئی دقت اور مشکل پیش آئی ہی نہیں جبکہ ہمارا معاملہ اور ہے۔ ہم سے یہ مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی اللہ کے دین کو قائم کریں جیسے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا۔ چنانچہ یہ اتمامِ حجت ہے اُمت محمد ﷺ پر۔

Salman Saleem 03067163117

## در شبستانِ حرا خلوت گزید

اب ذرا اس بائیس سالہ انقلابی جدوجہد کا طائرانہ نظر سے ایک جائزہ لیجئے۔ ہمارا معاملہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے دوری اور بُعد کا ہے۔ عشق کے تمام تر دعووں کے باوجود اگر آپ اپنے گریبان میں جھانکیں کہ ہمیں آنحضور ﷺ سے کتنا تعلق ہے تو اس کے لیے ایک بڑا آسان سا پیمانہ یہ ہے کہ ذرا سوچیے اس تیئس سالہ یا بائیس سالہ جدوجہد کے بائیس واقعات بھی آپ کو معلوم ہیں؟ ذرا چشم تصور سے آغازِ کار کو ذہن میں لائیے۔ اللہ کا ایک بندہ جو اپنی ذاتی سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہے، اُس نے اب تک جو زندگی بسر کی ہے وہ ایک بھرپور انسانی زندگی ہے' کہیں کسی خانقاہ میں زندگی بسر نہیں کی' کہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں نہیں رہے۔ چالیس برس بھرپور زندگی گزاری ہے۔ تجارتی قافلے شام جا رہے ہیں، وہاں سے آ رہے ہیں اور اس میدان میں اپنی امانت و دیانت کا لوہا منوایا ہے۔ شادی کی ہے' بھرپور عائلی زندگی بسر کی ہے۔ صاحب اولاد ہیں، لیکن چالیس برس کی عمر کے آس پاس وقت آیا ہے تو طبیعت میں یک دم خلوت پسندی کا غلبہ ہو گیا ہے۔ خلوت گزینی محبوب ہو گئی ہے۔ غارِ حرا میں کئی کئی دن مراقبہ ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ يَتَحَنَّثُ فِيْهِ۔

"تحنث" عبادت کو کہتے ہیں۔ یہ عبادت کیا تھی؟ شارحین کہتے ہیں: کان عبادته التفکر والاعتبار یعنی آپ ﷺ کی یہ عبادت غور و فکر اور سوچ بچار تھی۔ سورۃ الشوریٰ میں نقشہ کھینچا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ (الشوریٰ: ۵۲)

"اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا

Salman Saleem 03067163117

ہے، مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں''۔

آپ ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' آپ تو اُمّی تھے، کسی سابقہ آسمانی کتاب سے آپ کا ربط و تعلق نہیں تھا۔ کسی آسمانی شریعت سے آپ واقف نہ تھے۔ ایمان اجمالاً تو نبی کو پیدائشی طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن تفصیلاً ایمان کیا ہے' یہ ابھی آپ کو معلوم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب پردے اٹھائے' ازروئے الفاظ قرآنی:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (الضحیٰ)

''اور (آپؐ کے رب نے) آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو آپ کو راہ دکھائی۔''

غارِ حرا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور وحی کا آغاز ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق)

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایک وقت گزرا ہے جس میں آنحضور ﷺ کی تعلیم ہوئی ہے' اگرچہ ہم کو اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ آپ کی تعلیم ہماری سطح کی تعلیم نہیں ہے۔ الف' با' تا والی تعلیم نہیں ہے، لیکن تعلیم ہوئی ضرور ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں {عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى} (النجم) ''اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے۔''

## ''تکبیرِ رب'' کا حکم

پہلی وحی کے چند ماہ بعد دوسری وحی نازل ہوئی:

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ (المدثر)

''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔''

اب کمربستہ ہو جاؤ' کھڑے ہو جاؤ' اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کرو۔ اور اس کے لیے

Salman Saleem 03067163117

آپؐ کو دو کام تفویض کر دیے گئے' ایک انذار اور دوسرا تکبیرِ رب۔ یعنی لوگوں کو غفلت کے نتائج سے آگاہ کیجئے۔ خدا سے دوری کا جو انجام ہونے والا ہے، اس سے خبردار کیجئے۔ آخرت کی منزل جو ہر شخص کے لیے آ کر رہنی ہے' اس سے متنبہ کیجئے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے۔ اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجئے! وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾ کا لفظی ترجمہ ہوگا: ''اور اپنے رب کو بڑا کیجئے!'' تصغیر کے معنی ہیں کسی کو چھوٹا کر دینا اور تکبیر کے معنی ہیں کسی کو بڑا کر دینا۔ رب کو بڑا کرو! اس معنی میں کہ رب کی بڑائی مانی جائے! اپنی جگہ وہ بڑا ہے لیکن یہاں نامعلوم کون کون ہیں جو اُس کی بڑائی کو چیلنج کرتے ہیں کہ ہماری مرضی چلے گی' اُس کی نہیں۔ ہماری پسند سے معاملہ طے ہوگا، ہم نہیں جانتے کہ رب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ حکومت ہماری ہے' ہم نہیں جانتے کہ رب کون ہے! جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں طنزاً پوچھا تھا: وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ؟ یہ کون ہوتے ہیں ربّ العالمین؟ اس طرح بالفعل تو پوری دنیا ربّ العالمین کو بھولے ہوئے ہے یا اس کا انکار کیے ہوئے ہے اور اپنی خدائی کی دعوے دار ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل کر اپنے رب کو بڑا کیجئے۔ اس کی بڑائی منوایئے! حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے: ''اے اللہ! تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر پوری ہو!'' یہ ہے تکبیرِ رب۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

تکبیرِ رب کا یہ حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنی جدوجہد کے آغاز ہی میں دے دیا گیا۔ یہ ہے وہ چیز جس کا ایک بارِ گراں محسوس کیا محمد رسول اللہ ﷺ نے اور اس کا اظہار فرمایا: ((خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ)) ''مجھے اپنی جان کا خدشہ ہے!'' اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو تسلی دے رہی ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا' آپ یتیموں کی سرپرستی فرمانے والے، بیواؤں کی خبرگیری کرنے والے' بھوکوں کو کھانا کھلانے والے اور مسافروں کی خدمت کرنے والے ہیں۔

Salman Saleem 03067163117

# دعوت کے ابتدائی تین برس

ابتدائی تین برس تک دعوت وتبلیغ اس سطح پر ہوئی ہے کہ صرف اپنے قریب ترین لوگ ہی اس دعوت کے مخاطب رہے ہیں۔ لفظ ''خفیہ'' کا استعمال کرنا تو درست نہیں ہوگا۔ خفیہ بات وہاں کوئی نہیں تھی، البتہ ڈنکے کی چوٹ بھی نہ تھی۔ علی الاعلان نہیں تھی۔ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر دعوت اندر ہی اندر پھیل رہی تھی۔ آپ ﷺ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے ایمان لانے والی تھیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے قریب ترین دوست، جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اپنے ہی زیر تربیت اور زیر کفالت چچازاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ یہ چار افراد سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ان چاروں میں اولیت کا تعین بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں بڑی عمدہ مطابقت پیدا کی گئی ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، آزاد اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ، بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ ایمان لائے۔ یہ چار حضرات محمد رسول اللہ ﷺ کی اولین کمائی ہیں اور ان میں سب سے قیمتی کمائی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ معاشرے میں ان کو بلند مقام حاصل تھا' ان کی سچائی' امانت و دیانت' نیکی وراست بازی' خلق خدا سے ہمدردی اور وسعت قلب سب مسلّم تھی۔ پھر یہ کہ وہ اپنے معاشرے کے متمول فرد تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس وقت جو ایک قبیلے کی حکومت تھی' اس میں ایک انتہائی نازک ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ یعنی دیت (خون بہا) کی رقم کا تعین اور قتل کے مقدمات کا فیصلہ کرنا' یہ منصب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ جب وہ ایمان لائے تو وہ ایک فرد نہیں ایک امت تھے، جیسے قرآن مجید میں آتا ہے کہ

Salman Saleem 03067163117

{اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً} چنانچہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ حضرات وہ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایمان لائے۔ حضرت عثمان' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کو لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے یہ وہ چوٹی کے صحابہؓ ہیں جو آپؐ کی دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ○ (الشعراء: ۲۱۴) "اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے!" چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سطح پر بالکل فطری طریقہ اختیار کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ دعوتِ طعام کا اہتمام کرو اور بنی ہاشم کو بلاؤ۔ چنانچہ بنی ہاشم کو جمع کر کے کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر دعوت پیش کرنا چاہی تو اودھم مچ گیا۔ کسی نے بات نہ سنی۔ آخر چرچا تو ہو چکا تھا۔ انہیں معلوم تو تھا کہ ہمیں کس لیے جمع کیا گیا ہے۔ لہٰذا شور مچا دیا گیا اور بات سنی ہی نہیں گئی۔ اس طرح اولین کوشش ناکام ہو گئی۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ میری گفتگو میں ناکامی کا لفظ بار بار آئے گا، اس سے کوئی مغالطہ نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کی کوشش ناکام نہیں ہوتی۔ نبی کے نقشِ قدم پر چلنے والے کسی انسان کی کوشش بھی ناکام نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے کہ اس کا اجر خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ لیکن ایک ہے دنیا میں اس کوشش کے نتائج نکلنا۔ کامیابی کا یہ جو تصور ہے اس کے اعتبار سے یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ ناکامی کا سامنا ہوا۔ چنانچہ دوبارہ کوشش کی گئی، پھر کھانا کھلایا گیا۔ اس بار ذرا سا موقع مل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر دعوت پیش کی لیکن پورا مجمع گم سم رہا' صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے جو پہلے سے ہی اپنے تھے۔ آپ نے کھڑے ہو کر کہا: اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، اگرچہ مجھے آشوبِ چشم بھی ہے، لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس پر پورا مجمع کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ چلے ہیں عالمی انقلاب برپا کرنے اور یہ ہیں ان کے ساتھی! اس طرح ان دونوں دعوتوں کا نتیجہ صفر رہا۔

Salman Saleem 03067163117

## کوہِ صفا کی پکار

اس کے بعد قلب محمد ﷺ پر حکم نازل ہوتا ہے: فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ (الحجر: ۹۴) ''پس (اے نبی ﷺ! ایک قدم آگے بڑھایئے اور) جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ کہیے۔'' اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کیا تدبیر اختیار فرمائی؟ جن ظروف واحوال میں آپ کام کر رہے تھے ان میں ابلاغ کا جو بھی ممکن طریقہ تھا اسے آپ نے اختیار فرمایا۔ اس دور میں رواج یہ تھا کہ اگر لوگوں کو جمع کر کے کوئی بات سنانی ہوتی یا کوئی اہم خبر دینی ہوتی تو کوئی شخص کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر نعرہ لگاتا تھا: ''واصباحاہ'' اس زمانے میں خبر کیا ہوتی تھی کہ فلاں قبیلہ تم پر حملہ کرنے والا ہے' ہوشیار ہو جاؤ' اپنا بچاؤ کر لو۔ اور وہاں یہ رواج بھی تھا کہ وہ شخص بلند مقام پر کھڑے ہو کر چیختا تھا' اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا اور مادر زاد برہنہ ہو جاتا تھا، تاکہ جس تک آواز پہنچی ہو وہ بھی دیکھے تو سمجھ جائے کہ کوئی بات ہے جو یہ شخص ننگا ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے نذیر عریاں کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے بھی طریقہ وہی اختیار کیا لیکن اس میں جو چیز شرم وحیا کے منافی تھی اس کو نکال دیا۔ آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا: واصباحاہ! لوگ جمع ہوئے کہ نہ جانے کیا بات ہے۔ آپ ﷺ نے دعوت پیش کی تو مجمع میں آپ کا چچا ابولہب بول اٹھا: تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا تو نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا تھا؟'' (نقل کفر' کفر نباشد) ہم بڑی مصروفیات اور مشاغل میں تھے' ہم سمجھے واقعتاً کوئی بڑی اہم بات ہے۔ اس پر سورۃ اللھب نازل ہوئی: تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِيۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ﴿۱﴾ ''ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور نامراد ہو گیا وہ''۔ یعنی اسلام کی دعوت واشاعت کا راستہ روکنے کے لیے اس نے جتنا زور لگایا اس میں وہ ناکام ونامراد ہوا۔ یہ بات مستقبل کی پیشین گوئی کے طور پر فرمائی گئی لیکن فوری طور پر تو اُس کے ہاتھ نہیں ٹوٹے تھے۔ اس وقت تو صورت یہ تھی کہ اس دعوت عام کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گویا ناکامیوں پر ناکامی! یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں آپ ﷺ کو بار بار صبر کی تلقین کی گئی ہے کہ اے نبی! صبر کیجئے' جھیلئے' ہمت

Salman Saleem 03067163117

جواب نہ دے مایوسی اور ناامیدی پاس نہ پھٹکنے پائے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۳۵) ''پس آپ صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔'' سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات میں آخری بات صبر ہے: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ''اور اپنے رب کی خاطر صبر کیجیے!'' سورۃ النحل میں فرمایا: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (آیت ۱۲۷) اور (اے نبی ﷺ!) صبر سے کام لیجیے اور آپ کا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔'' سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: وَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ○ (آیت ۱۰) ''اور صبر کیجیے ان باتوں پر جو یہ بنا رہے ہیں اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جایئے!''

ایک بات ذہن میں رکھیے، کسی بھی انقلابی دعوت کے نتیجے میں معاشرے کا پہلا ردعمل استہزاء و تمسخر ہوتا ہے کہ اسے چٹکیوں میں اڑا دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ پاگل ہو گئے ہیں، جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے، ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ کبھی مخلصانہ، دردمندانہ اور خیر خواہانہ انداز میں کہا جاتا ہے: اچھے بھلے آدمی تھے، کیا ہو گیا بیٹھے بٹھائے۔ چنانچہ تسلی کے لیے آیات الٰہیہ اتر رہی ہیں۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (اے نبی ﷺ! آپ ملول نہ ہوں) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اور بے شک آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں۔ عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔''

یہ ہے وہ ابتدائی دور جس میں دعوت کا سلسلہ جاری ہے۔

Salman Saleem 03067163117

## ظلم وتشدد کا آغاز

اس دور کے متعلق دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ایک تو یہ کہ دعوت کا ذریعہ تمام تر قرآن مجید ہے۔زیر دعوت افراد کو آیات قرآنی پڑھ کر سنائی جارہی ہیں۔اگر معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے تو آپ وہاں پہنچتے اور ان سے کہتے کہ میرے پاس ایک کلام ہے جو میں پیش کرتا ہوں۔انہیں آپ کلام الٰہی سناتے۔تذکیر ہے تو قرآن کے ذریعے سے: فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ۝ (قٓ:۴۵) ''بس آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کیجئے جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔انذار ہو رہا ہے تو قرآن کے ذریعے سے: وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام:۱۹) ''اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو خبردار کروں''۔تبشیر ہو رہی ہے تو بھی اسی قرآن کے ذریعے سے: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۝ (مریم:۹۷) ''پس (اے نبیؐ!) اس کلام کو ہم نے آپ کی زبان میں آسان کر کے اسی لیے نازل کیا ہے تا کہ آپ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دیں اور ہٹ دھرم لوگوں کو متنبہ کر دیں''۔گویا آپؐ کی دعوت کا مرکز ومحور قرآن مجید ہی تھا:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

دوسری بات یہ ذہن میں رکھیے کہ انقلابی جدوجہد کے بعض مراحل وہ ہیں جو تمام انقلابات میں مشترک ہوتے ہیں۔دعوت' تنظیم' تربیت اور تصادم ہر انقلاب کے لازمی مراحل ہیں، لیکن انقلاب کو انقلاب سے ممیز کرنے والی چیز یہ ہے کہ دعوت کی بنیاد کیا ہے اور جو جماعت اس دعوت کو قبول کر رہی ہے اس کی تربیت کا اصول کیا ہے۔یہاں سے دونوں طرح کے انقلاب کے راستے جدا ہو جائیں گے۔ایک صالح انقلاب ہوگا اور ایک فاسد انقلاب ہوگا۔ایک انقلاب وہ ہے جس کی بنیاد خدائے واحد کی پرستش اور آخرت کے یقین پر ہے۔اعمال صالحۂ انسانی ہمدردی اور سچائی اس کے ابتدائی لوازم ( Pre

Salman Saleem 03067163117

(Requisites) جبکہ ایک دعوت وہ ہے جس میں کسی قوم کی قومی عصبیت کو ابھارا گیا ہو، جس میں کسی نسل کی نسلی عصبیت کو اپیل کیا گیا ہو، جس میں طبقاتی شعور اجاگر کیا گیا ہو۔ زمین و آسمان کا فرق یہاں سے پڑے گا' ورنہ ''دعوت'' کا لفظ مشترک ہے۔ انہیں بھی دعوت پیش کرنی ہوگی۔ ہمیں بھی اپنی دعوت پیش کرنی ہوگی۔ کوئی سیاسی ہنگامہ' کوئی قومی نعرہ' کوئی طبقاتی کشمش' یہ راستہ اور ہے، جبکہ ''قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تُفْلِحُوا'' کا راستہ اور ہے۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کی دعوت یہ ہوگی کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' آخرت کی تیاری کرو' اس کی جواب دہی کی تیاری کرو' اپنے آپ کو رذائل اور ذمائم اخلاق سے پاک کرو اور اپنی زندگیوں کو محاسن و مکارم اخلاق سے مزین کرو۔ تو اس فرق کو ذہن میں رکھئے، کہیں بار بار لفظ انقلاب کی تکرار سے آپ اس فرق کو نظر انداز نہ کر دیں۔

## چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

ایک بات اور ذہن میں رکھئے کہ دنیا میں مذہبی تبلیغ عام طور پر سوسائٹی کے پست طبقات میں ہوتی ہے۔ لوگ ان کی مظلومیت سے ذرا سا ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر ان کے سامنے آتے ہیں اور ان کے نام بدلوا لیتے ہیں۔ کوئی سابقہ یا لاحقہ نام میں لگا اور انہوں نے رجسٹر میں درج کر لیا کہ ہم نے اتنے عیسائی بنائے ہیں، جو صادق علی تھا وہ صادق مسیح بن گیا، لیکن انقلابی دعوت ہمیشہ معاشرے کے اونچے طبقے اور ذہین ترین عنصر سے خطاب کرتی ہے۔ یہ دعوت عقلی بنیاد پر پیش کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک نظریہ اور ایک فلسفہ کو قبول کرنے والے معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے جن لوگوں کے نام ابھی گنوائے گئے ہیں' یہ اس سوسائٹی کا مکھن تھے۔ ابوبکر صدیق' عثمان غنی' عبدالرحمٰن بن عوف' طلحہ' زبیر اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم ہیں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے۔ اگرچہ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں کچھ اور طبقات کے لوگ بھی پیش قدمی کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین طبقات میں سے تو جو بالکل صالح طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں وہی آئیں گے، اس لیے کہ ان کے پاؤں میں مفادات کی بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں۔ وہ قائل تو ہو جاتے ہیں کہ بات درست ہے، لیکن اپنی چوہدراہٹ' اپنے مقام و مرتبہ' اپنی وجاہت اور اپنے مفادات (Vested Interests) کو چھوڑنا

Salman Saleem 03067163117

آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو بہت ہی صالح مزاج اور سلیم الفطرت لوگ ہوتے ہیں جو جھٹ کر آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد دو طبقات اور ہیں۔ ایک نوجوانوں کا طبقہ' جس میں ابھی وہ مصلحت کوشی اور مصلحت بینی نہیں ہوتی جو پہلے طبقے کے لوگوں پر مسلط ہوتی ہے۔ ان میں جوش اور ولولہ ہوتا ہے۔ بات قبول کرتے ہیں تو اس پر ''ہر چہ بادا باد' ما کشتی در آب انداختیم'' کہہ کر چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اور دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو دبا ہوتا ہے، پسا ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں میں مفادات کی کوئی بیڑی نہیں ہوتی۔ وہ دعوتِ حق کو اس کی Face Value پر قبول کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہی تین طبقات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں پیش قدمی کی۔ یا تو چوٹی کا طبقہ ہے جن کے میں نے نام گنوائے ہیں، لیکن یہ چند ہیں، اگرچہ ان میں سے ایک ایک جو ہے وہ ایک ایک لاکھ کے برابر ہے، یا پھر بالکل نوجوان ہیں۔ اور یا پھر وہ طبقہ جو انتہائی دبا ہوا' پسا ہوا مظلوم و مقہور ہے، جس کا کوئی حق اس معاشرہ میں نہیں تھا یعنی غلاموں کا طبقہ۔ اس طبقہ میں سے حضرت بلال' ابوفکیہ اور خباب بن الارت رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔ لونڈیاں ایمان لائیں' آلِ یاسر رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔ اس پر اس فاسد نظام کی طرف سے ردِ عمل کا اظہار ہوا ہے۔ پہلے سے قائم نظام جب یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے استہزاء و تمسخر اور چٹکیوں میں اڑانے کی کوششوں سے وہ بات ختم نہیں ہوئی، یہ دعوت تو پیش قدمی کر رہی ہے، آگے بڑھ رہی ہے، تو اس کا دوسرا حربہ ہمیشہ تشدد (Persecution) کا ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے اس صورت میں سب سے زیادہ پسنے والے یا تو غلام ہوتے ہیں یا نوجوان۔ چنانچہ خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے لیے دہکتے انگارے زمین پر بچھا دیے جاتے اور ننگی پیٹھ کر کے ان کو لٹا دیا جاتا کہ باز آؤ! بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر لٹا کر سینے کے اوپر بھی بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ کبھی گلے میں رسی ڈال کر اوباش نوجوانوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ ان کو اوندھے منہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرو۔ لیکن ہر حال میں ان کی زبان سے یہی نکلتا: احد احد احد۔ ابوجہل نے آلِ یاسر رضی اللہ عنہم پر ایذا رسانی اور تشدد کی حد کر دی۔ اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو برچھا مار کر شہید کر دیا اور اس طرح وہ راہِ حق کی پہلی شہید

Salman Saleem 03067163117

ٹھہریں۔ ان کا خون راہِ حق میں بہنے والا سب سے پہلا خون ہے۔ ان کے شوہر (حضرت عمارؓ کے والد) حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو اس طرح شہید کیا گیا کہ چار جوان اونٹ لے کر ان کے ساتھ رسے باندھ دیے گئے اور رسوں کے دوسرے سروں کے ساتھ حضرت یاسرؓ کے دونوں بازو اور ٹانگیں کس دی گئیں اور پھر ان اونٹوں کو ایک دم مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا اور اس طرح ان کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ ہے بہیمانہ تشدد جو اس دعوت کو قبول کرنے والوں پر روا رکھا گیا۔

ان حالات میں نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر کیا بیتتی ہوگی! وہ پیغام ربانی جو آپ کو ملتا تھا "فَاصْبِرْ" وہی آپ اپنے جان نثاروں اور ساتھیوں میں بانٹتے گئے۔ آپ سامنے سے گزر رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں کہ ابوجہل کیا کر رہا ہے لیکن اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ آپ کہتے ہیں تو صرف یہ کہ ((صَبْرًا یَا آلَ یَاسِر)) "اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اور جھیلو" ((فَاِنَّ مَوْعِدَ کُمُ الْجَنَّۃُ)) "اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تم سے جنت کا ہے۔"

پھر یہ نہیں کہ اعلیٰ طبقات کے لوگوں پر تشدد نہ ہوا ہو۔ ان میں سے بالخصوص نوجوانوں پر تشدد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' ان کے چچا نے ایک چٹائی میں لپیٹا اور دھواں دے دیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بالکل مادر زاد برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا گیا کہ تم نے اگر اپنے آبائی دین کو چھوڑا ہے تو ماں باپ کی کسی چیز پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے' یہ کپڑے بھی انہی کے ہیں' انہیں بھی اتار دو! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس قدر مارا گیا کہ بالکل مردہ سمجھ کر چھوڑ اگیا۔ کہاں اُن کا مرتبہ (Status) اور کہاں اُن کا یہ حال!

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو شخصی طور پر بھی ایذائیں پہنچائی گئیں۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل نے عقبہ بن ابی معیط سے کہا کہ ذرا جاؤ ان کی خبر لو۔ اور اس بدبخت نے چادر کا پھندا بنا کر آپ ﷺ کے گلے میں ڈال کر اسے اس طرح بل دیے کہ آپ کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ سجدے میں پڑے تھے کہ اسی عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کے کہنے پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھڑی لا کر آپ ﷺ کے کاندھوں پر رکھ دی جس کے بوجھ کی وجہ سے آپؐ سر نہ اٹھا پائے۔

Salman Saleem 03067163117

## ہجرتِ حبشہ

یہ بہیمانہ تشدد سن ۵ نبوی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو ہجرت کی اجازت آئی اور ہجرتِ حبشہ ہوئی۔ اس ہجرت کے لیے دو قافلے نکلے۔ پہلے قافلے میں بارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں' جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپ کے ہمراہ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیوی کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو راہِ خدا میں ہجرت کر رہا ہے۔ دوسرا قافلہ جو ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں پر مشتمل تھا حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ کم و بیش اتنے ہی لوگ ہوں گے جو مکہ میں رہ گئے ہوں گے۔ یہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ برس کی کمائی۔ تشدد اور ایذا رسانی کے باوجود ان پانچ برسوں میں دعوت کا قدم پیچھے نہیں ہٹا' بلکہ بتدریج آگے بڑھتا رہا اور یہ دعوت تھی قرآن کی اور اس کی تعلیم کی۔ ازروئے الفاظ قرآنی: یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ ٭ (الجمعہ:۲)

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

سن ۶ نبوی میں کچھ پانسا پلٹتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔ اس سے مسلمانوں کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے میں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کا بڑا دخل ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے گھر پر گئے اور دستک دی تو خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ان کو اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنی بہن اور بہنوئی کو مارنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کی استقامت دیکھ کر خود ڈگمگا گئے۔ ان سے قرآن مجید لے کر خود پڑھنا شروع کیا تو دل پر شدید اثر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ایمان ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے موجب تقویت ہوا۔ دوسری طرف سردارانِ قریش بھی چونکے کہ یہ مشت خاک تو ایک بہت بڑا

Salman Saleem 03067163117

طوفان بن رہی ہے، لہٰذا یہ وہ وقت ہے جب جناب ابو طالب کو ایک طرح کا الٹی میٹم دے دیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ قبائلی نظام میں شرافت کی بنیاد یہ تھی کہ اپنے قبیلے کے فرد کا ساتھ نہ چھوڑا جائے اور ابو طالب نے بہرحال اس شرافت کا ثبوت دیا۔ بنی ہاشم کی سیادت اب ابو طالب کے پاس تھی اور قریش محمد رسول اللہ ﷺ پر کوئی وار کرنے سے اس لیے ڈرتے تھے کہ اس طرح قبائلی جنگ چھڑ جائے گی۔ پورے بنی ہاشم کے ساتھ تصادم مول لینا پڑے گا، کیونکہ محمد ﷺ بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ لہٰذا جناب ابو طالب کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے، یا تو راستے سے ہٹ جاؤ یا میدان جنگ میں آؤ۔ اُس وقت ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔

## شعب بنی ہاشم کی محصوری

اب ذرا چشم تصور سے دیکھیے۔ دنیاوی سہارا اسی ایک خاندان کا تھا (اصل سہارا تو اللہ تعالیٰ کا ہے، میں نے اسی لیے "دنیاوی سہارا" کہا ہے) اور نبی اکرم ﷺ کو محسوس ہوا کہ اب یہ سہارا بھی ہٹ رہا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آپؐ نے پوری استقامت کے ساتھ فرمایا: چچا جان! یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی یا میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا۔ اس پر چچا کے بھی آنسو نکل آئے۔ ان کی فطری و طبعی محبت جاگی اور انہوں نے آپ ﷺ کی حمایت برقرار رکھی۔ چنانچہ سردارانِ قریش کی طرف سے طے کر دیا گیا کہ بنی ہاشم کا مکمل سماجی اور معاشی بائیکاٹ کر دیا جائے۔ ان کے ساتھ کوئی لین دین نہیں ہوگا۔ ان کے ہاتھ نہ کوئی چیز بیچی جائے گی نہ ان سے خریدی جائے گی۔ مجبور ہو کر وہ شعب ابی طالب (یا شعب بنی ہاشم) کے اندر محصور ہو گئے' جہاں کوئی چیز اندر نہیں جا رہی تھی۔ تین برس (سن ۷' ۸' ۹ نبوی) تک یہی صورتحال رہی۔ بچے بھوک پیاس سے بلکتے رہے۔ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس گھاٹی میں اگر کوئی جھاڑی تھی تو اس کے سب پتے کھا لیے گئے۔ کبھی کوئی ہمت کرتا تو رات کے وقت چوری چھپے کچھ پہنچا دیتا، ورنہ وہ وقت بھی آیا کہ سوکھا چمڑا ابال کر اس کا پانی بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ٹپکا دیا گیا۔ یہ ہیں وہ مراحل جو پیش آئے۔

Salman Saleem 03067163117

میں پھر کہوں گا کہ یہ سب کچھ انسانی سطح پر ہو رہا ہے۔ سب کچھ جھیل کر سب کچھ برداشت کر کے ہو رہا ہے۔ ''اس راہ میں: جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!'' اللہ اگر چاہتا تو اپنے حبیب ﷺ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا' لیکن پھر مجھ پر اور آپ پر حجت کیسے قائم ہوتی؟ بہر حال تین سال کے بعد کچھ لوگوں کے اندر انسانیت کی دبی ہوئی چنگاری جاگی اور مقاطعہ کا جو معاہدہ تھا اسے پھاڑ پھینکا۔ اس طرح بنی ہاشم کی محصوری کا دور ختم ہوا۔

## امتحانات کا تسلسل

یہ ۱۰ نبوی کا زمانہ ہے۔ جب استہزاء و تمسخر اور چٹکیوں میں اڑانے کی کوششوں کے بعد تشدد اور ایذا رسانی کا حربہ بھی ناکام ہو گیا تو اب تیسرا حربہ لالچ (temptation) کا آزمایا گیا اور مصالحانہ انداز میں سفارتیں آنے لگیں۔ اب پھر ابو طالب کے پاس سفارت آئی کہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ جو مانگنا ہے مانگ لے، لیکن اس دعوت سے باز آ جائے! بادشاہ بننا چاہتا ہے تو بادشاہ بنا دیتے ہیں، اگر کسی گھرانے میں شادی کرنی ہے تو اشارہ کرے ہم شادی کرا دیتے ہیں۔ دولت چاہیے تو سیم وزر کے انبار اس کے قدموں میں لگا دیتے ہیں۔ چچا نے پھر بلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چچا جان! اگر یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنی اس دعوت کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

دیکھئے امتحانات کا یہ سلسلہ کس طرح چل رہا ہے۔ شعب بنی ہاشم کی سختی ختم ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور امتحان آیا۔ ۱۰ نبوی کو اللہ کے رسول ﷺ نے عام الحزن (غم واندوہ کا سال) قرار دیا ہے۔ اس سال کے دوران جناب ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی رحلت فرما گئیں۔ اس طرح گھر کے اندر کا رفیق' ہمت بندھانے والا ساتھی' دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات اور ادھر خاندانی اور قبائلی سطح پر حامی و پشت پناہ شخصیت ایک ہی سال میں دونوں انتقال کر گئے۔

## ذاتی مصائب کا نقطۂ عروج: یومِ طائف

ان حالات میں قریش کے سرداروں کا حوصلہ جوان ہو رہا ہے۔ دار الندوہ میں بیٹھ کر

Salman Saleem 03067163117

مشورے ہورہے ہیں۔ قتل کے منصوبے بن رہے ہیں کہ اب قصہ چکا دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ بھی حالات کے نتیجے کو دیکھ رہے ہیں۔ مکہ میں تو اب کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ آپ ایک کوشش کرتے ہیں کہ شاید طائف میں اللہ تعالیٰ کسی بڑے سردار کو اس بات کی توفیق دے دے کہ وہ میری رفاقت اختیار کرے۔ چنانچہ ۱۰ نبوی میں آپ ﷺ نے پاپیادہ طائف کا سفر اختیار کیا۔ صرف زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ یہ وہ سفر ہے کہ جس میں سائے کی طرح ساتھ رہنے والے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ نہ تھے۔ چونکہ مکہ میں آپؐ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اہل مکہ کی جانب سے ضرر کا اندیشہ تھا لہٰذا آپ نے عام راستہ چھوڑ کر بڑا دشوار گزار پہاڑی راستہ اختیار کیا۔ طائف پہنچ کر ایک رئیس سے ملے۔ اس نے بڑا ہی جگر سے پار ہو جانے والا جملہ کہا: ”میں تم سے بات ہی کرنا نہیں چاہتا۔ تم اگر جھوٹے ہو تو اس قابل نہیں کہ تمہیں منہ لگایا جائے اور اگر تم سچے ہو تو خطرہ ہے کہ اگر میں نے تمہاری توہین کر دی تو مجھ پر عذاب آ جائے گا۔“ آپ ﷺ یکے بعد دیگرے تین سرداروں سے ملے' تینوں نے ایسے ہی جواب دیے۔ اب وہ طائف کی گلیاں ہیں اور رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں۔ سید الاولین والآخرین ﷺ اور محبوبِ رب العالمین ﷺ کے ساتھ عالم واقعہ میں ہو کیا رہا ہے۔ طائف کی گلیوں میں اوباش لوگوں کو پیچھے لگا دیا گیا ہے کہ ذرا ان کی خبر لو۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کا نشانہ لے کر پتھر مارے جاتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر سے خون جاری ہے' نقاہت طاری ہو گئی ہے۔ ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آئے ہیں، ایک نے اِدھر سے بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے ادھر سے اور کھڑا کر دیا کہ چلو! یہ ہے وہ کسمپرسی۔ یہ ہے وہ نقشہ کہ

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پس زنداں' کبھی رسوا سر بازار!

مکہ میں تین سال کی قید کے بعد طائف کی یہ رسوائی! یہ نقطۂ عروج ہے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی مصائب کا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ مدنی دور میں سوال کیا کہ آپ پر یومِ احد سے زیادہ سخت دن بھی کوئی آیا ہے؟ (ان کے اپنے شعور کی عمر میں

Salman Saleem 03067163117

یومِ احد سب سے زیادہ سخت دن تھا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں طائف کا دن۔ احد کے دن تو آگے پیچھے آپ ﷺ کے جان نثار تھے جنہوں نے اپنے سینے ڈھال بنائے ہوئے تھے لیکن یہاں معاملہ یہ تھا کہ یکہ وتنہا تھے۔ غلام کی تو اس معاشرے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ یہ حالت درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مصیبت کا نقطۂ عروج ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس آئے تو تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ پر بیٹھے۔ طبیعت بھر آئی جذبات امڈے۔ اُس وقت آپؐ نے جو دعا مانگی ہے اور مناجات کی ہے، وہ کلیجے میں شگاف ڈال دینے والی ہے۔ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِلَیْكَ اَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَ هَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ، یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ، اِلٰی مَنْ تَكِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَهَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِیْ، اِنْ لَّمْ یَكُنْ بِكَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ، وَلٰكِنَّ عَافِیَتَكَ هِیَ اَوْسَعُ لِیْ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَیْهِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ مِنْ اَنْ تَنْزِلَ بِیْ غَضَبُكَ اَوْ یَحِلَّ عَلَیَّ سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ۔ (۱)

”اے اللہ! میں تیری ہی جناب میں شکایت لے کر آیا ہوں اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل وذرائع کی قلت کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے اس کی۔ تو ارحم الراحمین ہے، تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی رب ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے؟ مجھے غیر کے حوالے کر دیا ہے کہ جس طرح چاہے ستائے یا میرا معاملہ دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جو چاہے کر گزرے؟ (اس سب کے باوجود) اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے (اور تیری رضا اسی میں ہے) تو

---

(۱) یہ دعا حدیث وسیرت کی متعدد کتابوں میں الفاظ کی کمی وبیشی کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ علامہ ناصر الدین البانیؒ نے اسے فقہ السیرۃ (ح ۱۲۶) میں محمد بن کعب القرظی کی روایت سے اور ضعیف الجامع الصغیر (ح ۱۱۸۲) میں عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کی روایت سے بحوالہ طبرانی نقل کیا ہے۔

Salman Saleem 03067163117

مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ تیری بخشش میرے لیے وسیع تر ہے۔ میں تیرے رخِ انور کی ضیا کی پناہ میں آتا ہوں' جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں اور میرے دنیا و آخرت کے معاملات سدھر جاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر تیری ناراضی یا غصہ ہو۔ پروردگار! انجام کار تیرے ہی ہاتھ میں ہے، یہاں تک کہ تیری مرضی پوری ہو۔ کوئی قوت وتدبیر تیری مدد کے بغیر کارگر نہیں ہو سکتی۔"

یہ ہے اصل میں وہ مقام جس کی طرف سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (البقرۃ: ۲۱۴)

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا جو تم سے پہلے (ایمان لانے والے) لوگوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد یقیناً قریب ہے!"

ایک وقت آتا ہے کہ رسول پکار اٹھتا ہے کہ اے اللہ! تیری مدد کب آئے گی؟ سورۂ یوسف میں بھی آیا ہے:

حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْـــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ (یوسف: ۱۱۰)

"یہاں تک کہ جب پیغمبر (لوگوں سے) مایوس ہو گئے اور (لوگوں نے بھی) یہ سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔"

ایک وقت آتا ہے کہ بالکل مایوسی کا اندھیرا ہوتا ہے' کہیں کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی کہ کدھر جاؤں' سارے راستے بند نظر آتے ہیں' اُس وقت رسول پکارتا ہے تو اللہ کی مدد آ پہنچتی ہے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے صدا بلند کی تھی: اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر: ۱۰)

Salman Saleem 03067163117

''پروردگار! میں مغلوب ہوا چاہتا ہوں، تو مدد فرما۔'' پھر مدد آتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ چنانچہ ملک الجبال آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ان پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے اور طائف کے رہنے والے ان کے درمیان سرمہ بن جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں کو توفیق دے دے۔ چنانچہ خدا نے واقعتاً ان کی نسلوں کو توفیق دی۔ اس صنم کدۂ ہند میں توحید کا پیغام لانے والے محمد بن قاسمؒ بنوثقیف سے ہی تھے یعنی طائف کے رہنے والوں کی اولاد۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ایک بات لکھی ہے کہ طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) ہے۔ اس دن تک گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کے حوالے کیا ہوا تھا کہ ہمارے نبی سے جو چاہو کر لو تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ جس طرح چاہو انہیں ستا لو اور جس طرح چاہو آزما لو ان کے صبر اور ان کی استقامت کا امتحان لے لو! چنانچہ دس سال تک کوئی بھی مافوق الفطرت رکاوٹ یا مدد نہیں آئی۔ ذہن میں رکھیے یہ ۱۰ نبوی ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ دس سال تک اس کیفیت سے دوچار رہے کہ اللہ کی کوئی غیبی مدد نہیں آئی اور جو بھی اس دنیا کا دستور ہے اسی کے مطابق زمین پر قدم بہ قدم چل کر جو بھی مسائل پیش آتے ہیں، جو بھی ناکامیاں ہوتی ہیں، جو بھی رسوائیاں ہوتی ہیں، جو بھی الزامات لگتے ہیں، جو استہزاء اور تمسخر ہوتا ہے، جس طرح ستایا جاتا ہے، وہ سب کچھ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا۔ لیکن ہر چیز اپنے عروج (Climax) کو پہنچ کر اب Anti Climax پر آ گئی۔ طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کے لیے اس اعتبار سے فیصلہ کن موڑ ہے کہ گویا وہ آخری حد آ پہنچی اور اب آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہو گیا۔

طائف سے آپ ﷺ واپس مکہ آئے مگر داخلہ ممکن نہیں تھا۔ مکہ سے تو گئے اسی لیے تھے کہ یہاں قتل کے فیصلے ہو رہے تھے۔ دنیوی اعتبار سے بے نیلِ مرام واپس آئے ہیں، کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مکہ میں تو کوئی ایسا دن آیا بھی نہیں تھا جو طائف میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ مکہ سے باہر رہے اور مطعم بن عدی کو پیغام بھیجا کہ مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو میں مکہ میں داخل ہو جاؤں۔ اُس نے کہہ دیا ہاں ٹھیک ہے، آپ میری پناہ میں ہیں!

Salman Saleem 03067163117

فرمایا: یوں نہیں، خود آ کر لے جاؤ۔ وہ شخص اپنے چھ بیٹوں کو ساتھ لے کر ہتھیار بند ہو کر آیا اور آپ ﷺ کو ساتھ لے کر گیا۔ ورنہ محمد رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخلہ ممکن نہ تھا (مطعم بن عدی ایک شریف النفس انسان تھا۔ وہ شخص ایمان نہیں لایا، لیکن ہم سب کی گردنوں پر اُس کا احسان ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو پناہ دی) لیکن اب پانسا پلٹتا ہے۔

## بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ

۱۱ نبوی میں یثرب سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں۔ موسم حج ہے' حاجیوں کے پڑاؤ لگے ہوئے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ دعوت و تبلیغ کے لیے کبھی اس کیمپ میں اور کبھی اس کیمپ میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں حاجیوں کے کسی قافلے کے پاس ہیں اور ابھی وہاں۔ ایک گھاٹی میں اچانک یثرب سے آنے والے چھ حاجیوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس پر وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ان کنکھیوں میں پوری تاریخ مضمر ہے۔ یثرب میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ یہودی اپنے علم کی بنیاد پر اپنی کتابوں اور اپنے صحیفوں کی بنیاد پر ان کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور انہیں دھمکایا کرتے تھے کہ اب تو تم ہمیں دبا لیتے ہو' تم ہم پر غالب آ جاتے ہو، لیکن کوئی بات نہیں' آخری نبی کے ظہور کے بعد جب ان کے ساتھ ہو کر ہم تمہارے خلاف جہاد کریں گے تو ہم تم پر غالب ہو جائیں گے۔ یثرب سے آئے ہوئے حاجیوں نے دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی نبی ہیں' جلدی کرو' ایمان لے آؤ' مبادا یہود سبقت کر جائیں۔ ذرا سوچئے یہود کا علم اہل یثرب کو تو فائدہ دے رہا ہے اور خود یہود کے لیے وہ حجاب بن گیا۔ وہ چھ حضرات ایمان لے آئے اور ایک کھڑکی کھل گئی۔ اب تک پورا ماحول بند تھا' کہیں راستہ نہیں نکل رہا تھا۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اس میں آنحضور ﷺ کی اپنی تدبیر کا کوئی دخل نہیں۔ آپ ﷺ کی ساری سعی و جہد آج تک مکے میں ہوئی اور مکے سے باہر سوچا بھی تو طائف کا سوچا۔ آپ ﷺ نے ایک سفر اور بھی کیا تھا اور وہ بھی اسی طرح ناکام رہا تھا۔ یہ خالص خدائی تدبیر تھی کہ مدینے کے چھ افراد ایمان لے آئے۔

Salman Saleem 03067163117

اگلے سال (۱۲ نبوی میں) بارہ آدمیوں نے آکر بیعت کی اور درخواست کی کہ اب ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن مجید پڑھائے۔ یہ بیعت' بیعت عقبۂ اُولیٰ کہلاتی ہے۔ پھر نوٹ کر لیجئے رسول اللہ ﷺ کی دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت کی بنیاد قرآن ہے۔ یہ اس انقلاب کا انفراسٹرکچر ہے، اور اس عظیم ایشان عمارت کی اصل مضبوطی اسی سے ہے۔ اکبرالہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

تو اصل اہمیت اس جڑ اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ بیعت عقبہ اولیٰ کرنے والے بارہ حضرات نے کہا کہ ہمیں ایک شخص دیجئے جو ہمیں قرآن پاک پڑھائے۔ قرعۂ فال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام نکلا۔ یہ بڑے نازونعم میں پلے ہوئے نوجوان تھے۔ ان کے لیے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہوکر آتا تھا۔ عطر کی پوری پوری شیشیاں جسم پر انڈیل کر نکلتے تھے۔ مکے کی گلیوں میں لوگ دیکھتے تھے کہ کون جا رہا ہے۔ انتہائی خوش پوش' خوش شکل' خوش مذاق' خوش لباس تھے۔ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد چچا نے ان کے تن کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور گھر سے نکال دیا تھا۔ ان کو ساتھ کر دیا گیا اور وہ مدینہ منورہ میں قرآن کی تعلیم دینے لگے۔ مدینہ میں ان کا نام المُقری یعنی قرآن پڑھانے والا پڑ گیا تھا۔

ایک سال تک حضرت مصعبؓ نے محنت کی اور اگلے سال بہتر (۷۲) مرد اور تین عورتوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس بیعت میں یہ طے ہوا کہ آپ ہمارے ہاں آجائیے' ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اس وقت جو کچھ قول وقرار ہوا اس پر بعض کہنے والوں نے کہا: اے یثرب والو! خوب سمجھ لو' خوب سوچ لو کہ کیا قول وقرار کر رہے ہو! محمد رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر جانا سرخ وسیاہ آندھیوں کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی خوب سمجھ سوچ کر معاملہ کیا اور کہا کہ ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ یہ ہے بیعت عقبۂ ثانیہ جو ہجرت کی تمہید بنی ہے۔

(بحوالہ ''خطبات سیرت'')

Salman Saleem 03067163117

# واقعۂ معراج

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ○ (الاسراء:1)

مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ﴿۱۳﴾ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۱۴﴾ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ﴿۱۵﴾ اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾ (النجم)

Salman Saleem 03067163117

آج سے چودہ سو چھ (۱۴۰۶) برس قبل ۲۷ رجب کی ایک شب وہ محیر العقول واقعہ پیش آیا جسے ہم "معراج" کے نام سے جانتے ہیں۔ معراج کے بارے میں کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عظیم واقعہ ہجرتِ مدینہ سے ڈیڑھ سال قبل پیش آیا جب کہ نبی اکرم ﷺ کی عمر شریف تقریباً باون برس تھی۔

## واقعہ معراج کی حقیقت و اہمیت

اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی اہمیت کیا ہے؟ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے ضمن میں سب سے پہلے ہمیں یہ معین کرنا ہوگا کہ اس واقعہ کے ہم تک پہنچنے کے ذرائع (Sources) کیا ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ہمارے لیے کسی بھی ضمن میں مرجعِ اوّل اور اوّلین بنیاد قرآن مجید ہے۔ قرآن حکیم میں واقعہ معراج کا ذکر دو مقامات پر صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں نہ کسی اشارے، کنائے، رمز یا ایماء کا انداز ہے اور نہ کوئی ابہام و ایہام ہے، بلکہ صراحت کے ساتھ واضح الفاظ میں اس واقعے کا ذکر ہے۔ اس سفر مبارک کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ زمینی ہے یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، اور دوسرا حصہ آسمانی ہے یعنی مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو مقامات پر اس واقعہ کے دونوں حصوں کو جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں، جو پندرھویں پارے کی بھی پہلی آیت ہے، اس زمینی سفر کا ذکر ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا "پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے کو، شب کے ایک حصے میں، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک" الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ "جس کے ماحول (گرد و پیش) کو ہم نے مبارک بنایا" لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا "تا کہ ہم دکھائیں اسے (ﷺ) اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں"۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○ "یقیناً

سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا تو صرف وہ (تبارک وتعالیٰ) ہے۔"

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، یہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے۔ نوٹ فرمالیں کہ اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا نام سورۃ الاسراء بھی ہے، بلکہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں اسے "سورۃ الاسراء" کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا ہے۔

اس سفر مبارک کا جو آسمانی حصہ ہے، اس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کی اطلاع خود قرآن سے ملتی ہے جو ہمارے لیے مرجع اوّل ہے۔ اس حوالے سے یہ بات جان لیجئے کہ چونکہ اس واقعہ کی بنیاد صرف احادیث ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں بھی بصراحت اس کا ذکر ہے، لہٰذا اس کا انکار کفر ہوگا، اگرچہ توجیہہ اور تاویل کے اعتبارات سے الفاظِ قرآنی میں جس حد تک گنجائش ہو اس حد تک اگر کوئی اختلاف ہو تو اسے کفر نہیں سمجھا جائے گا۔

اس واقعہ کے ضمن میں ہمارے لیے مرجعِ ثانی احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہمارے دین کے یہ دو بنیادی ماخذ ہیں، قرآن وحدیث۔ انہی کو اصطلاحاً کتاب وسنت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معروف بات ہے کہ احادیث میں درجہ بندی ہے۔ سند کے اعتبار سے قوی ترین احادیث وہ ہیں جو صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہیں۔ ان میں سے بھی وہ احادیث جو ان دونوں میں موجود ہوں، یعنی جن کی صحت پر یہ دونوں امام متفق ہو گئے ہوں، وہ اپنی سند کے اعتبار سے قرآن مجید کے آس پاس پہنچ جاتی ہیں۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات جان لیجئے کہ اگرچہ ایسی احادیث کی تعداد کثیر ہے جن میں مختلف تفاصیل مذکور ہیں، تاہم نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ کم از کم اٹھائیس صحابہ کرامؓ سے یہ واقعہ مروی ہے۔ چونکہ ایک ہی روایت کئی کئی صحابہؓ سے مروی ہے اس اعتبار سے روایات کی تعداد تو اٹھائیس سے بھی بڑھ جائے گی، لیکن ان صحابہ کی تعداد اٹھائیس ہے جن سے واقعہ معراج کا ذکر تفصیلاً یا اجمالاً مروی ہے۔ پھر ان میں ایک بڑی مفصل روایت وہ بھی ہے جو متفق علیہ ہے۔ یعنی احادیث کے اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے کہ جن کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش بہت ہی کم رہ جاتی ہے، بلکہ صحیح تر بات یہ ہوگی کہ معدوم کے درجے

Salman Saleem 03067163117

میں آجاتی ہے۔اس متفق علیہ حدیث میں جو تفاصیل آئی ہیں، انہیں ہمیں من وعن ماننا ہوگا۔

## سفرِ معراج کی غرض وغایت

اس تمہید کے بعد پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ اس واقعہ کی نوعیت کیا ہے....! آیا یہ کوئی منفرد واقعہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا ہے یا یہ نبوت و رسالت کے مستقل معاملات میں سے ایک معاملہ ہے اور مختلف انبیاء و رُسل کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا ہے!.... اگر پیش آیا ہے تو اس میں جو فرق و تفاوت ہے وہ آیا نوعیت کا ہے یا کیفیت کا....؟ یہ بات جان لیجئے کہ مکاشفات اور مشاہدات تو نبوت کا جزوِ لاینفک ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء و رُسل اس منصب اور خدمت پر مامور ہوتے ہیں کہ ان امورِ غیبی کی اطلاع دیں جن پر ایمان لانا لوگوں کے لیے ضروری ہے۔جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ والا صفات ہے، جو ذات وصفات کے اعتبار سے اَحد ہے۔پھر ملائکہ ہیں۔اسی طرح جو آئندہ پیش آنے والے واقعات ہیں، جب تک وہ پیش نہ آجائیں وہ پردۂ غیب میں ہیں۔ یوم الآخرۃ، قیامت کا دن، ایک امرِ غیبی ہے۔بعث بعد الموت، حشر ونشر، وزنِ اعمال، جزا و سزا، یہ سب امورِ غیبی ہیں۔پھر سب سے بڑھ کر خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے، جس کے متعلق یا یوں کہہ لیں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) غیب میں ہے..... یا یوں کہہ لیں کہ اس ذاتِ عزّوجل اور ہمارے مابین غیب کا پردہ حائل ہے۔یہ وہ چیزیں اور وہ امور ہیں جن پر ایمان لانا ازبس ضروری ہے۔

ہدایت کا نقطہ آغاز ہی یہ ہے کہ ان باتوں کو مانا جائے۔یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ہدایت کے لیے جو شرط اول بیان کی گئی ہے وہ یہی ایمان بالغیب ہے:

الٓمّٓ ﴿١﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ..... یہ شرطِ اوّل ہے۔اب جو بلند مرتبت ہستیاں اس خدمت پر مامور ہوئی ہوں کہ وہ ان امورِ غیبی پر ایمان کی دعوت دیں، ظاہر ہے کہ انہیں تو ان امور پر بدرجۂ کمال وتمام ایمان ویقین ہونا چاہیے۔ جب تک وہ ایمان ویقین ان کے اندر اپنے درجۂ کمال کو پہنچا ہوا نہیں ہوگا، وہ دوسروں تک اس ایمان بالغیب کو کیسے منتقل کریں گے!

اب یہ بھی جان لیجیے کہ ایمان ویقین کے مختلف مراتب ہیں۔ایک یقین وہ ہے جو فکر و نظر اور تعقل و تفکر کے نتیجے میں پیدا ہو جاتا ہے۔ایک یقین وہ ہے جو خود ذاتی مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔اس سے بھی بلند تر ایک درجہ وہ ہے جو انسان کے ذاتی تجربے اور احساس پر مبنی ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ان مدارج کے لیے تین اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔علم الیقین یہ ہے کہ آپ نے اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے استنباط کیا، استدلال کیا اور اس طرح کسی چیز کا علم آپ کو حاصل ہوا اور آپ کو یقین آ گیا۔عین الیقین یہ ہے کہ آپ نے کسی چیز کو دیکھا اور آپ نے اپنی حسِ بصارت پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر یقین کر لیا.... اور حق الیقین کا درجہ ان دونوں سے بلند ہوگا۔یہ یقین وہ ہوگا جو انسان کے اپنے ذاتی تجربے کا ایک جزو بن جائے۔

میں اسے ایک سادہ سی مثال سے واضح کروں گا۔اگر آپ دیکھیں کہ کہیں دھواں ہے تو آپ اپنی عقل کے بل پر یہ استدلال کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہاں آگ ہے۔اس لیے کہ آپ کو یہ کلیہ معلوم ہے کہ دھواں اور آگ لازم و ملزوم ہیں۔آگ اگرچہ آپ نے نہیں دیکھی، آپ نے دھواں ہی دیکھا ہے، لیکن اس کو دیکھ کر آپ کو اپنے استنباط اور استدلال سے آگ کے وجود پر یقین آ گیا۔یہ علم الیقین ہے۔اب آپ نے قدم بڑھایا۔بھاگے دوڑے اور آپ وہاں پہنچے جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور آپ نے اپنے سر کی آنکھوں سے آگ کا مشاہدہ کر لیا تو اب علم الیقین سے بلند تر درجہ آپ کو حاصل ہوگا۔یہی عین الیقین ہے۔عربی کا مقولہ ہے کہ "لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَة" یعنی "کسی کے بتانے سے جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ اس درجے کا نہیں ہو سکتا جو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے"۔فارسی میں اسی حقیقت کا اظہار اس مقولے کے ذریعے کیا جاتا ہے کہ "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ".... لیکن ابھی یقین و معرفت کا ایک درجہ باقی ہے اور وہ درحقیقت آگ کی اصل حقیقت کا ادراک ہے۔آپ نے آگ آنکھ سے دیکھ لی، لیکن اس وسوسے کا امکان ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ آگ کی سی صورت ہو، حقیقی آگ نہ ہو۔سورۃ النجم میں فرمایا گیا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪ "نظر نے جو دیکھا دل نے اس کو جھٹلایا نہیں"۔اس میں اسی وسوسے

کی طرف اشارہ ہے کہ کسی وقت انسان کسی شے کو دیکھ رہا ہوتا ہے، لیکن یقین نہیں آتا کہ میں ٹھیک دیکھ رہا ہوں، اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان پکار اُٹھتا ہے کہ ''آنچہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب!''..... اس وسوسے کا کلیۃً ازالہ اُس وقت ہو جائے گا جب وہ آگ آپ کو چھو جائے یا آپ اس آگ کو خود چھولیں۔ اب یقین ہو جائے گا کہ یہ واقعتاً آگ ہے، محض صورتِ آگ نہیں ہے بلکہ حقیقتِ آگ ہے۔ اس تجربے ہی سے آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ آگ کہتے کسے ہیں؟ اگر کبھی انگارے نے آپ کے جسم کے کسی حصے کو چھوا نہ ہو اور آپ نے ساری عمر آگ صرف دیکھی ہو تو اس کی اصل حقیقت کا علم اور ادراک آپ کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے وہ ذاتی تجربہ جس کی رسائی جب انسان کے اپنے احساس تک ہو جاتی ہے تو اس کو ''حق الیقین'' کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ انبیاء و رسل کو جو یقین دوسروں تک منتقل کرنا ہے اس کے پیش نظر ان کا اپنا یقین و ایمان اگر حق الیقین کے درجے تک نہ پہنچا ہو اور ان کے اپنے تجربے اور احساس کا جزو نہ بن چکا ہو تو مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر یقین کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ مجسم ایمان و یقین بن جائیں کہ ان کی شخصیتوں سے یقین متعدی ہو رہا ہو، پھیل رہا ہو۔ اس کے لیے ان کا تجربہ، ان کا معائنہ اور ان کا مشاہدہ اگر نہ ہو تو یقین کا وہ درجہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ ان کی شخصیتوں سے یقین متعدی ہو جائے، لوگوں تک پہنچے۔ جیسے اگر آگ کی بھٹی ہو تو اس سے حرارت خود بخود نکلتی ہے اور دوسروں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے اصل میں وہ سبب جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ عالم ملکوت کے مشاہدات انبیاء و رسل کو کراتا ہے۔ یہ مکاشفات کی شکل میں بھی ہوئے ہیں، یہ رؤیا کی شکل میں بھی ہوئے ہیں۔ یہ حالت نوم میں بھی ہوئے ہیں، حالت بیداری میں بھی ہوئے ہیں اور ان دونوں یعنی خواب و بیداری کی درمیانی کیفیت میں (بَیْنَ النَّوْمِ وَالْیَقْظَۃ) بھی ہوئے ہیں۔ اس میں کچھ چیزوں کو متمثل کر کے بھی دکھایا گیا ہے۔ بعض حقائق کا براہ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ جیسے جیسے مراتب ہیں ویسے ویسے ہی ان تجربات و مشاہدات کا معاملہ ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۷۵ میں فرمایا گیا:

Salman Saleem 03067163117

وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے رہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظام تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔''

''مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یعنی اس کائنات کی خفیہ حکومت کا جو انتظام و انصرام ہے، اس کے جو کارندے ہیں، اس کی جو سول سروس ہے، یعنی ملائکہ، جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہیں۔ ملائکہ تو ہر جگہ موجود ہیں، ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ہیں، کراماً کاتبین موجود ہیں لیکن وہ مخفی ہیں۔ وہ غیب میں ہیں یا ہم ان سے غیب میں ہیں۔ اس عالم کا ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کرایا جاتا رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی اس خفیہ حکومت، اس غیبی حکومت کے رموز و اسرار اور معاملات دکھائے جاتے رہے ہیں.... اس آیت کا آخری ٹکڑا میری اس گفتگو کے اعتبار سے بہت اہم ہے: وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○ ''تاکہ وہ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) اصحابِ یقین میں سے بن جائے''۔ ایمان تو محض خبر کی بنیاد پر بھی ہے، لیکن میں نے یقین کا جو بلند ترین درجہ عرض کیا ہے وہ مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔ اس بلند ترین درجے کا یقین انبیاء و رسل کو دینا مقصود ہوتا ہے، لہٰذا انہیں یہ مشاہدات و تجربات کرائے جاتے ہیں۔

البتہ جیسے نبوت و رسالت کے سلسلے کی تکمیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ہوئی ہے، اسی طرح ان مشاہدات کے بارے میں بھی چوٹی کا مشاہدہ اور ذاتی تجربات کے ضمن میں بھی بلند ترین تجربہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، جسے ہم معراج کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ واحد تجربہ نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار تجربات ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃِ کسوف پڑھا رہے ہیں اور جنت آپؐ کے سامنے لے آئی گئی اور بے اختیار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اُٹھا اور آگے بڑھا تاکہ آپ جنت کے کسی درخت کا پھل یا میوہ توڑ لیں۔ یہ ہاتھ کا اُٹھنا اور بڑھنا ایک غیر اختیاری عمل تھا۔ اس نوع کے عمل میں کسی ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ پھر جہنم

Salman Saleem 03067163117

سامنے لے آئی گئی اور آپ ؐ بے اختیار اس کی حرارت، اس کی گرمی، اس کی دہشت سے اچانک پیچھے ہٹے۔ یہ تمام تجربہ نماز میں ہو رہا ہے، عالَمِ بیداری میں ہو رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلوت میں نہیں ہیں، مجمع میں ہیں، وہاں ہو رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہم ان مشاہدات کا احاطہ کر ہی نہیں سکتے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئے۔

## روایاتِ معراج میں اختلاف کی حقیقت

آگے بڑھنے سے قبل واقعہ معراج سے متعلق ایک ظاہری الجھن کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک نفسِ واقعہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب مانتے ہیں کہ سیرت میں ایسا کوئی واقعہ ہوا تو ضرور ہے۔ البتہ اس کی تفصیلات کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں، جن میں بظاہر بہت اختلاف ہے۔ یعنی مجرد واقعۂ معراج تو متفق علیہ ہے، لیکن اس خاکے میں جو رنگ ہیں، وہ مختلف روایات میں جدا جدا ہیں۔ ان میں بھی ایک تو اس نوعیت کی چیزیں ہیں جن میں ہم آہنگی کی جا سکتی ہے اور وہ باہم منطبق ہو جاتی ہیں۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک واقعہ آپ نے دیکھا اور وہی واقعہ کسی اور نے بھی دیکھا تو آپ اس کو جس انداز میں بیان کریں گے ہو سکتا ہے کہ دوسرا اس کو اس انداز سے نہیں بلکہ کسی اور انداز سے بیان کرے۔ یعنی آپ اس واقعہ کی ایک کڑی کو زیادہ تفصیل سے بیان کریں اور شاید دوسرے صاحب اس کو اجمالی طور پر بیان کریں اور کسی دوسری کڑی کو زیادہ تفصیل سے بیان کریں۔ ہر شخص کا ایک اپنا ذوق اور اپنا مزاج ہوتا ہے، اسی کے اعتبار سے واقعات کا بیان بھی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذوق کے اعتبار سے کوئی بات آپ کے نزدیک کم اہمیت رکھتی ہے تو اگرچہ آپ اسے سنیں گے یا دیکھیں گے بھی، لیکن وہ آپ کے حافظے میں محفوظ نہیں رہے گی، جبکہ ایک دوسری چیز کی طرف آپ کو زیادہ میلان ہے، اس کو آپ پوری طرح گرفت میں لائیں گے، اسے Catch کریں گے اور محفوظ کر لیں گے۔ تو ایک ہی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، اسے دو نے سنا، پانچ نے سنا، تو جب یہ حضرات اس کو بیان کریں گے تو تھوڑا تھوڑا فرق ہو جائے گا، لیکن آپ اس فرق کو جوڑ کر ایک وحدت بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا روایات میں ایک

Salman Saleem 03067163117

اختلاف تو اس نوعیت کا ہے جس میں کسی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں یہ ہوگا کہ اس واقعہ کا کوئی درمیانی یا بعد کا حصہ کوئی شخص پہلے بیان کر دے گا اور اسے جب یاد آ جائے گا تو وہ پہلا حصہ بعد میں بیان کر دے گا۔ یہ تقدیم و تاخیر والی باتیں بھی بالکل سمجھ میں آنے والی ہیں۔ عقل انسانی ان کو ہم آہنگ (Reconcile) کر سکتی ہے۔

البتہ بعض باتیں ایسی ہیں جو ناقابلِ تطبیق (irreconcilable) ہیں، وہ بالکل متضاد نوعیت کی ہیں۔ مثلاً کہیں تو یہ بیان کیا گیا کہ سفر معراج مقامِ حطیم سے شروع ہوا۔ کسی دوسری روایت میں بیان ہو رہا ہے کہ اس کا آغاز کسی گھر سے ہوا، حضور ﷺ کے اپنے گھر سے یا حضرت امِ ہانی ؓ کے گھر سے، جو آنحضرت ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ کسی روایت کے آخر میں الفاظ ایسے آ گئے ہیں: ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ ''پھر میں جاگ گیا۔'' جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ سارا واقعہ عالمِ خواب اور نیند میں ہوا۔ اس لیے کہ ''اِسْتَيْقَظْتُ'' کے معنی کوئی اور نہیں ہو سکتے، لہٰذا تاویل ممکن نہیں۔ یہ جو اس نوعیت کی تضاد کی حامل روایات ہیں، جن کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم جوڑنا ممکن نہیں ہے، ایسی روایات کی ایک نہایت عمدہ تاویل بہت سے محققینِ اُمت کی جانب سے یہ کی گئی ہے کہ واقعۂ معراج بھی ایک بار نہیں ہوا، کئی بار ہوا ہے۔ اس طرح کوئی روایت بھی رد نہیں ہوتی۔ بعض محققین اس تاویل کو تسلیم نہیں کرتے کہ واقعۂ معراج بار بار ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد اس روایت کو بناتے ہیں جسے وہ زیادہ معتبر سمجھتے ہیں اور صرف اسی کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ اس کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور بقیہ روایات کو وہ رد کر دیتے ہیں۔ سلف سے یہ اختلاف چلا آ رہا ہے اور یہ آئندہ بھی رہے گا۔ اپنے ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں، وہ میں آپ کے سامنے بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو معراج کی سعادت کم از کم دو مرتبہ حاصل ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ یہ واقعہ نبوت کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ معراج نبوت کے سن دو یا تین میں ہوا، یعنی ۴۲ یا ۴۳ سنِ ولادت میں۔ اور یہ معراج ہوا ہے حالت نوم میں۔ ایسی روایات اس معراج کے ساتھ جڑیں گی جن کے آخر میں مذکور ہے ''ثُمَّ

Salman Saleem 03067163117

اسْتَيْقَظْتُ۔۔یعنی ’پھر میں جاگ گیا‘‘۔ یہ جو تجربہ ہے اس کو نیند میں ایک روحانی تجربے، ایک مکاشفے یا خواب سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور جو دوسرا واقعہ ہے، جو انتہائی مشہور و معروف ہے اور جس کو ہم ’’معراج‘‘ کے نام سے جانتے ہیں، یہ نبوت کے سن گیارہ کے اواخر یا سن بارہ کے اوائل میں ہوا ہے۔ گویا یہ آنحضورﷺ کی عمر شریف کا ۵۲واں سال ہے، یعنی ہجرت سے لگ بھگ دو سال قبل۔ یہ واقعہ درحقیقت ان تجربات کی، جو آنحضورﷺ کو اُس وقت تک ہوئے تھے، تکمیل ہے اور یہ تجربہ ان تمام تجربات کا نقطہ عروج ہے۔ اور یہ سفر ہرگز نیند میں نہیں ہوا۔ یہ صرف روحانی تجربہ نہیں ہے، یہ کوئی رؤیا یا خواب نہیں ہے، بلکہ یہ سفر ہے ’’بِجَسَدِہٖ‘‘ نبی اکرمﷺ کے پورے جسدِ مبارک کے ساتھ معراج کا یہ پورے کا پورا سفر پیش آیا۔

## سفرِ معراج کی عقلی توجیہہ

اس ضمن میں اس دور میں، جو عقلیت پرستی کا دور ہے، اور جسے "18th Century Rationalism" کہا جاتا ہے، مغرب میں فکرِ انسانی کئی قلابازیاں کھا چکا ہے، لیکن مشرق کے کچھ مفکرین ہیں جو ابھی تک اٹھارہویں صدی ہی کے "Rationalism" کو بیٹھے چاٹ رہے ہیں۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کی وہ عقل پرستی مغرب میں ختم ہو چکی ہے، سائنس کے صغریٰ کبریٰ اور مقدمات و متعلقات (Premises) تبدیل ہو چکے ہیں، اصول و مبادی بدل چکے ہیں، لیکن علامہ اقبال کے اس مصرعے کے مصداق کہ ’’وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ!‘‘ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو ابھی تک نیوٹونین فزکس (Newtonion Physics) کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک معراج کا واقعہ محالات اور ناممکنات میں سے ہے۔ میں اسی لیے کہا کرتا ہوں کہ اگر سرسید احمد خان مرحوم نے ٹھوکر کھائی تو وہ قابلِ رحم اور معذور ہیں، وہ آج سے سوسوا سو سال پہلے کے انسان ہیں۔ وہ جس سائنس کی عقل پرستی سے مرعوب تھے اُس سائنس کے، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا،

Salman Saleem 03067163117

مقدمات (Premises) بدل گئے۔ لیکن تعجب اور حیرت تو ان لوگوں کی حالت پر ہوتی ہے جو سرسید کے فکر پر آج بھی اپنی دکانیں چمکا رہے ہیں۔ یہ مقلدِ محض ہیں۔ ان کے پاس تو درحقیقت عقلِ عام نام کی شے بھی نہیں ہے کہ ان کو اندازہ ہو کہ ہم کس دور میں سوڈیڑھ سو سال پہلے کی عقلیت پرستی کی بات کر رہے ہیں۔

آج کا دور آئن سٹائن کی فزکس کا دور ہے۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے کی فزکس کے مقدمات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب مادہ (matter) حتمی، قطعی اور ناقابلِ تردید اور مستحکم نہیں رہا۔ اب سائنس یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ نظری اعتبار سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی مادی جسم نور کی رفتار کے ساتھ حرکت کرے گا تو اس کے لیے وقت نہیں گزرے گا۔ حساب نے یہ ثابت کر دیا ہے، اگرچہ ابھی ہم اس کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ سب سے زیادہ رفتاریں انسان کے سامنے دو تھیں۔ ایک آواز کی رفتار اور دوسری روشنی کی رفتار۔ آواز کی رفتار سے تو انسان آگے گزر گیا ہے۔ پہلے بندوق کی گولی آواز سے تیز جاتی تھی۔ گولی پہلے لگتی تھی، آواز بعد میں آتی تھی۔ لیکن اب تو سپر سانک جیٹس ہیں۔ آواز سے کہیں زیادہ ان کی اپنی رفتار ہے۔ اب صرف ایک رفتار رہ گئی ہے اور وہ ہے نور یا روشنی کی رفتار۔ اگرچہ ایک مادی جسم کے لیے اس رفتار تک پہنچنا یا اس سے تیز سفر کرنا عموماً ناممکن قرار دیا جاتا ہے، تاہم طبیعیات کے حلقوں میں یہ امور اب اس قدر محال نہیں سمجھے جاتے جتنے یہ ایک صدی پہلے تھے۔ صرف فرق ہے انسانی قدرت اور اللہ کی قدرت کا، جس کی طرف اشارہ کر کے بات شروع کی گئی کہ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا "پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات لے گئی اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔"

## آیہ اِسراء کی تشریح و توضیح

آیت زیر مطالعہ میں پہلی قابلِ توجہ بات لفظ "سُبۡحٰن" ہے۔ یعنی جو ہستی اس فعل (اسراء) کی فاعلِ حقیقی ہے وہ "سُبُّوۡح" ذات ہے۔ اگر یہ بات کسی انسان کی طرف

منسوب ہوتی تو اور بات تھی۔ اگر یہ فعل حضور ﷺ کی طرف منسوب ہوتا کہ حضورؐ خود تشریف لے گئے تو اور بات تھی۔ لیکن وہاں تو صورت بالفعل یہ تھی: ع ''کہ میں آیا نہیں، لایا گیا ہوں''۔ حضور ﷺ خود نہیں گئے، لے جائے گئے تھے۔ اور لے جانے والی ذات کون ہے؟ (سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ.....) جو پاک ہے ہر عیب سے، ہر نقص سے، ہر ضعف سے، ہر کوتاہی سے، ہر درماندگی سے۔ اور وہ ذات سبوح ہے، منزہ ہے، ارفع ہے، اعلیٰ ہے، بالاترین ہے۔ لہٰذا اُس کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جائے اور واپس لے آئے اور مسجد حرام میں پہنچا دے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کی مراجعت پر وضو کا پانی ابھی بہہ رہا تھا اور حضورؐ کے مکان کے دروازے کی کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی وقت نہیں گزرا (1) اور یہ چیز، جیسا کہ میں نے

(1) اس موقع پر اس عاجز کو مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کی ''معراج'' کے موضوع پر کی گئی ایک تقریر کا وہ حصہ اچانک یاد آ گیا جو اسی مسئلہ سے متعلق تھا۔ یہ تقریر اس عاجز نے نوجوانی کے دور میں سنی تھی۔ ایک مسجد میں تقریر تھی۔ اس زمانے میں عموماً وقت بتانے والے وہ گھنٹے ہوا کرتے تھے جو چابی اور (لنگر) pendulum سے چلتے تھے۔ مولانا مرحوم جب تقریر میں اس موضوع پر آئے تو انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے اس مسئلہ کو سمجھایا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس گھنٹہ میں چابی بھری ہوئی ہے لیکن یہ گھنٹہ پینڈولم کے رقص کی بدولت چل رہا ہے اور وقت بتا رہا ہے۔ اس وقت اس میں گیارہ بج رہے ہیں۔ اب اگر میں اس کو روک دوں تو یہ گیارہ بجے کے وقت پر رک جائے گا۔ بعد ازاں ایک یا دو دن یا چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد اس پینڈولم کو حرکت دی جائے تو یہ ٹھیک گیارہ بجے سے، جہاں اسے روکا گیا تھا، حرکت میں آ جائے گا''۔ مولانا نے یہ مثال دے کر آگے فرمایا کہ ''ہم جس اللہ کو مانتے ہیں وہ ''علٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' ہے اور اس کائنات کے رواں دواں رہنے میں ہر لحظہ اور ہر آن اسی کا حکم کارفرما ہے ''لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ''۔ اب جبکہ اس نے اپنے بندے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو معراج عطا فرمایا تو اُس نے کائنات کو Suspend ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہر چیز کی حرکت اسی جگہ رک گئی۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ سبحانہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جہاں آپؐ کی امامت میں تمام انبیاء و رسل نے نماز پڑھی، جو گویا علامت تھی اس بات کی کہ آپؐ سید الانبیاء والرسل ہیں۔ اس کے بعد آپؐ حضرت جبرائیلؑ کی معیت میں کیے بعد (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

Salman Saleem 03067163117

عرض کیا، آپ کا جو ذہن ہے اس کی رو سے نا قابلِ قیاس اور نا قابلِ یقین نہیں رہی۔

دوسری قابلِ توجہ بات ہے لفظِ "عبد"..... ایک اس پہلو سے کہ لفظ عبد کا اطلاق صرف روح پر نہیں، بلکہ روح اور جسد دونوں پر ہوگا۔ ہم عبد ہیں، صرف ہماری روح کو عبد نہیں کہا جائے گا۔ ہم اپنی روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو روحِ محمد ﷺ کی حقیقت کو کیا سمجھ سکیں گے! بلکہ جان لیجیے کہ عبد کا اطلاق اکثر و بیشتر تو جسد پر ہوگا۔ اس صراحت سے یہ اضافی بات معلوم ہوئی کہ صرف روحِ محمد ﷺ نہیں لے جائی گئی بلکہ بنفسِ نفیس حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے جائے گئے۔ اور "محمد ﷺ" کا اطلاق روحِ محمدیؐ اور آپؐ کے جسد شریف دونوں کے مجموعے پر ہوگا، صرف روح پر نہیں ہوگا۔

**عبدیت و رسالت میں فرقِ مراتب:** تیسری بات جو بہت قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو مقامِ عروج ہے، جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہو رہا ہے، اس میں حضور ﷺ کی دو نسبتوں میں سے جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے، وہ نسبتِ رسالت نہیں ہے، بلکہ نسبتِ عبدیت ہے۔ ویسے بھی عام طور پر قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خصوصی اور شفقتِ خصوصی کا اظہار ہوتا ہے، وہاں آپ ﷺ کی نسبتِ عبدیت کا ذکر ملتا ہے، جیسے ہم نے یہاں دیکھا، یا جیسے اگلی سورۃ الکہف کے آغاز میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ○ اور جیسے سورۃ الفرقان کے آغاز میں ہے: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ○ اسی طریقے سے سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی ○ اسی طرح یہاں ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) دیگرے ساتوں آسمانوں پر اور پھر سدرۃ المنتہیٰ تک تشریف لے گئے۔ آپؐ کو جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ کو واپس اپنے مستقر پر بھیج دیا گیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے کائنات بھی رواں دواں ہوگئی۔ چنانچہ جو چیز جس مقام پر روک دی گئی تھی، اسی جگہ اس نے حرکت شروع کر دی"۔ مولانا نے فرمایا کہ "یہ ایک عقلی توجیہہ ہے اس بات کی کہ حضور ﷺ کی واپسی پر کنڈی ہل رہی تھی، وضو کا پانی بہہ رہا تھا اور بستر میں حرارت موجود تھی۔" (ج۔ر)

Salman Saleem 03067163117

یہاں یہ نکتہ جان لیجیے کہ نسبتِ عبدیت بالاتر ہے نسبتِ رسالت سے... اور اگر اسے صوفیاء کی اصطلاح سے سمجھیں تو وہ یہ ہے کہ نسبتِ عبدیت ایک عروجی نسبت ہے، جبکہ نسبتِ رسالت ایک نزولی نسبت ہے۔ اگر آپ اس امر کو ذہن میں رکھیں گے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب پہلی وحی ہوئی یا آپؑ اللہ تعالیٰ سے مخاطبہ یا مکالمہ سے جو مشرف ہوئے تو آپ کوہِ طور پر تھے، بلند مقام پر تھے اور اس سے اعلیٰ مقام کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ گفتگو ہو رہی ہے، درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ○ (النساء: ۱۶۴) ''اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام فرمایا جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے''۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام کیا ہیں؟ عبد ہیں! اور جب رسالت کا حکم ملا تو فرمایا گیا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ (طٰہٰ: ۲۴) ''جاؤ فرعون کی طرف، بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے''۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اتریں گے تو فرعون کی طرف جائیں گے۔ کسی کے پاس سے کوئی جاتا ہے تو اس کی طرف پیٹھ کر کے جاتا ہے، جبکہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے تو اس کے حضور میں ہے، مواجہہ کر رہا ہے، face to face ہے۔ تو غور کیجیے کہ کون سی نسبت بالاتر ہوئی!..... ظاہر ہے کہ نسبتِ عبدیت، جس میں رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ جبکہ رسالت ایک فرضِ منصبی ہے کہ جاؤ ادا کرو۔ اس کا رخ مخلوق کی طرف ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ نے اس کو ایک تمثیل کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں ان حقائق کو جاننے والے یہ صوفیاء ہی ہیں، یہ نہ فقہاء کا دائرہ ہے نہ محدثین کی دلچسپی کا میدان ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کے اپنے اپنے دائرے ہیں اور ان دائروں میں سب نے اپنے اپنے کام کیے ہیں۔ یہ تمام اصحاب ہمارے محسن ہیں، لیکن ہر طبقے کا اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا میدان (field) ہے۔ چنانچہ عبدیت و رسالت میں فرقِ مراتب ہمارے صوفیاء نے قائم کیا ہے۔ مولانا رومؒ نے اس کے لیے بارش کی مثال دی ہے۔ ہماری دنیا میں بارش کا جو نظام چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات اُٹھ رہے ہیں۔ یہ عروج ہے۔ بخارات نہایت لطیف حالت میں ہیں، نہایت پاک و صاف ہیں۔ اس عمل تبخیر کے

Salman Saleem 03067163117

ذریعے تطہیر ہو رہی ہے۔ پانی بھاپ بنایا جا رہا ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ کثافت تو ساتھ نہیں جائے گی۔ پانی انتہائی لطیف اور پاک وصاف صورت میں اوپر جا رہا ہے۔ اوپر جا کر ان بخارات نے بادلوں کی شکل اختیار کر لی۔ ہواؤں کے دوش پر یہ بادل فضا میں تیرتے ہیں۔ پھر بارش بن کر وہی پانی زمین پر نازل ہو رہا ہے۔ اب اس نزولِ بارش سے کیا ہوگا؟ پہلے وہ پانی فضا کو دھوئے گا۔ اس عمل میں فضا کی کچھ نہ کچھ کثافت برستے پانی میں شامل ہو جائے گی۔ پھر وہ بارش زمین تک پہنچے گی اور زمین کو دھوئے گی۔ اس مرحلے پر کچھ مزید کثافتیں اس میں شامل ہو جائیں گی۔ یہ پانی ندیوں، نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا پھر سمندر میں پہنچے گا۔ اب وہ ساری کثافتیں سمندر میں رہ جائیں گی اور پھر وہی پانی لطیف اور پاک وصاف ہو کر بخارات کی صورت میں آسمان کی طرف اُٹھ جائے گا۔ یہ عروج ہے اور وہ نزول ہے۔ نزول سے فضا اور زمین کی صفائی ہو رہی ہے جبکہ عروج میں پانی کی اپنی صفائی ہوتی ہے۔

عروج و نزول کا یہی سائیکل عبدیت و رسالت کے مابین چلتا ہے۔ رات کو اللہ کا بندہ اُس کے حضور میں کھڑا ہے۔ یہ کس کی صفائی ہے؟ اپنی.... کس چیز سے صفائی، یہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ اس کو کہیں اپنی کثافتوں پر قیاس نہ کر لیجیے گا۔ وہ کثافتیں ان ہستیوں کے کہیں آس پاس بھی نہیں ہوتیں۔ ع "گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی"..... لیکن دن کے لیے کیا حکم ہے؟ اب نزول کا مرحلہ ہے۔ جاؤ لوگوں کی طرف، انہیں اللہ کا پیغام پہنچاؤ، ان کو اللہ کے راستے کی طرف پکارو۔ یہ کام منصبِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ مکہ کے مشرکانہ ماحول میں نبی اکرم ﷺ توحید کی دعوت پہنچا رہے ہیں۔ مجمعوں میں قرآن پیش فرما رہے ہیں، گھروں پر دستک دے رہے ہیں، دربدر تشریف لے جا رہے ہیں۔ لیکن ہو کیا رہا ہے؟ یہی کہ کسی نے استہزا اور تمسخر کیا، کسی نے گالی دے دی، کسی نے شاعر کہا، کسی نے مجنون و دیوانہ کہا تو کسی نے ساحر اور جادوگر کہہ دیا، کسی نے کاہن کہہ دیا۔ ان باتوں سے قلبِ محمد ﷺ میں کچھ کدورت پیدا ہوتی ہوگی یا نہیں؟ آپؐ کی طبعِ مبارک کو رنج پہنچتا ہوگا یا نہیں؟ یہ اثرات بالکل مترتب نہ ہوں، یہ ناممکن ہے۔ اسی لیے تو قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے حضور ﷺ کو تسلی دی جاتی رہی ہے، جیسے فرمایا گیا: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ

Salman Saleem 03067163117

لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ (الانعام: ۳۳) ''ہمیں بخوبی علم ہے کہ آپ کی طبیعت پر ان کی باتوں سے تکدر پیدا ہوتا ہے، آپؐ ملول اور غمگین ہوتے ہیں''۔ اور نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝۱ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝۲ (القلم) ''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں (یعنی قرآن)۔ آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کے فضل سے ہرگز مجنون نہیں ہیں''۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف تسلی دی جا رہی ہے اور دوسری طرف جو تکدر آپؐ کے دل پر آ گیا ہے اسے دور کرنے کے لیے حکم ہو رہا ہے کہ راتوں کو کھڑے رہا کیجیے:

يَآيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ (المزمل)

''اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! آپ رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کریں مگر کم۔ آپ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیں، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دیں، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر (حالتِ قیام میں) پڑھا کریں۔ ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔''

اب یہ عروجی کیفیت ہے، یہ نسبتِ عبدیت ہے کہ "عَبْدُهٗ" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس (اللہ تعالیٰ) کا بندۂ خاص، اس کے حضور میں راتوں کو کھڑا ہے، اللہ تعالیٰ سے لو لگی ہوئی ہے اور اپنے رب، اپنے مولا، اور اپنے حامی و ناصر کے حضور میں مناجات ہو رہی ہے۔ دن میں نزولی کیفیت ہے کہ لوگوں کے اذہان و قلوب کو نورِ توحید سے منور کرنے کی سعی ہو رہی ہے، ماحول کو صاف کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے سورۃ المزمل کی آیات ایک تا دس میں، جن میں سے پہلی پانچ آیات اور ان کا ترجمہ ابھی آپ نے ملاحظہ کیا۔ اب اگلی چند آیات اور ان کا ترجمہ بھی دیکھ لیجیے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔ فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـًٔا وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ

Salman Saleem 03067163117

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) درحقیقت رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بلاشبہ آپ کے لیے دن میں (تبلیغ کی) بڑی مصروفیات ہیں (بڑی محنت اور مشقت ہے، لیکن اس میں بھی) اپنے رب کے نام کا ذکر کیجئے اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہیے۔ وہ (اللہ) مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو اپنا پشت پناہ بنائیے (اسی پر بھروسا کیجئے) اور (اے نبیؐ آپ کی دعوت پر) لوگ جو باتیں بنا رہے ہیں ان پر صبر کیجئے اور ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیے۔''

طنز و استہزاء اور طعن و تشنیع کے گھاؤ بڑے کاری ہوتے ہیں، ان کو جھیلنا آسان نہیں۔ اس سے طبیعتِ مبارک پر جو تکدر آتا تھا اس کا ازالہ اُس وقت ہوتا تھا جب "عبدُہٗ" نسبتِ عبدیت کے اعتبار سے رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا تھا اور حالتِ عروج کی کیفیات سے بہرہ مند ہوتا تھا۔ تو یہاں لفظ ''عبد'' کے حوالے سے ان حقائق کو ذہن نشین کر لیجئے۔

**چند وضاحت طلب پہلو:** زیر نظر آیات کے اس حصے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا میں دو مزید الفاظ وضاحت طلب ہیں، ایک "اَسْرٰی" اور دوسرا "لَیْلاً"۔ عربی میں ''اسراء'' کے معنی ہیں راتوں رات لے جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں سورۃ الشعراء کی آیت ۵۲ میں یہی لفظ آیا ہے: وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ (اے موسیٰ علیہ السلام) راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، تمہارا پیچھا کیا جائے گا''۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی یہی لفظ آیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ اس کے بعد "لَیْلاً" کیوں آیا، جبکہ اَسْرٰی میں ''راتوں رات'' کا مفہوم و معنی شامل ہے؟ اس لیے کہ سفر معراج میں پوری رات نہیں لگی تھی، بلکہ رات کا ایک

Salman Saleem 03067163117

نہایت قلیل، نہایت مختصر حصہ صرف ہوا تھا۔ اسی لیے "لَيْلًا" کا ترجمہ "رات کا ایک حصہ" کیا جاتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (الاسرا:1)

"پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے کو، شب کے ایک حصے میں، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے، تاکہ ہم (اپنے) اس (بندے) کو اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کروائیں۔ یقیناً سب کچھ سننے (اور) دیکھنے والا تو وہی (اللہ تعالیٰ) ہے۔"

اب دوبارہ ترجمے سے پوری بات آپ کے سامنے بالکل واضح ہو کر آ گئی ہوگی۔ اب دو باتیں وضاحت طلب رہ گئیں، ایک تو یہ کہ کونسی نشانیاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھائی گئیں! وہ میں آپ کو آگے چل کر احادیث کے حوالے سے بتاؤں گا، اس لیے کہ ان کا ذکر احادیث میں بصراحت موجود ہے۔ دوسرے اس آیت کا آخری ٹکڑا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ ہے۔ یعنی "سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے"۔ یہ دراصل اس کے علم کامل کی شرح ہے۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے۔ یعنی اُس کے سوا یہ وصف کسی اور میں ہے ہی نہیں، چاہے وہ ملائکہ ہوں، انبیاء و رسل ہوں یا اولیاء ہوں۔ البتہ یہ اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنے علم میں سے جتنا جس کو چاہے عطا فرما دے، اپنی سماعت میں سے جتنا حصہ چاہے کسی کو مرحمت فرما دے، اپنی بصارت میں سے جتنا چاہے کسی پر فیضان فرما دے۔ یہ اسی کو اختیار ہے: وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ (البقرۃ: ۲۵۵) "اور وہ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے ماسوائے اس کے جو وہ خود چاہے"۔ اور سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ (البقرۃ: ۳۲) "(اے اللہ) تو پاک ہے اور ہمیں کوئی علم حاصل نہیں ہے مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھایا"۔ یہ ملائکہ کا قول نقل ہوا ہے۔ پس فرشتوں کے علم کی نوعیت بھی یہی ہے اور انبیاء و رسل کے علم کی کیفیت بھی یہی ہے

Salman Saleem 03067163117

کہ جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، اتنا ہی ان کو علم ہے۔ باقی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا، سب کچھ جاننے والا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سبحانہ ہی ہے۔

## واقعۂ معراج۔ حدیث نبویؐ کے آئینے میں

اب میں چاہتا ہوں کہ پورا واقعۂ معراج آپ کو اس حدیث کے حوالے سے سنا دوں جو متفق علیہ ہے۔ میں خود بیان کروں گا تو کچھ نہ کچھ کمی بیشی کا احتمال ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ واقعۂ معراج اپنی پوری تفاصیل کے ساتھ حدیث کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے اور حدیث بھی دوسرے یا تیسرے طبقے کی کتابوں میں نہیں ہے، بلکہ متفق علیہ ہے، جس کا پایہ، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، روایت اور سند کے اعتبار سے تقریباً قرآن مجید کے برابر ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بارے میں ایک بڑی اہم بات نوٹ کر لیجئے کہ یہ انصاری صحابی ہیں اور ان صحابہؓ میں سے ہیں جنہیں حدیث بیان کرنے کا زیادہ شوق نہ رہا ہو۔ غالباً یہ واحد حدیث ہے جو اُن سے مروی ہے۔ ان کو اس حدیث سے نہایت شغف تھا، انہوں نے اس کو نہایت محبت کے ساتھ محفوظ کیا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کی تھی۔ چنانچہ بعض دوسرے صحابہ کرامؓ جنہوں نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ سنا ہوا تھا، جیسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وہ بھی ان کی خدمت میں خاص طور پر حاضر ہو کر اس روایت کو سنتے تھے۔ اس لیے کہ اس روایت میں انؓ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری میں "عن قتادة عن أنس بن مالك عن مالك بن صعصعة" کی اسناد سے روایت کرتے ہیں۔ مسلم شریف میں یہ روایت حضرت انس بن مالکؓ سے براہِ راست مروی بھی موجود ہے۔ ہم اس روایت کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے، ان شاء اللہ العزیز، اس ضمن میں بہت سے اشکالات دور ہو جائیں گے۔ حدیث یہ ہے:

عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ نَبِيَّ اللهِ ﷺ حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِيَ بِهٖ "حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہمیں وہ حالات و واقعات سنائے جو اس رات کو پیش آئے، جس رات آپؐ کو لے جایا گیا"۔ یعنی

Salman Saleem 03067163117

واقعۂ معراج بیان فرمایا۔ اب دیکھئے، یہ مرفوع حدیث ہوگئی۔ آگے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بَیْنَمَا اَنَا فِی الْحَطِیْمِ، وَرُبَّمَا قَالَ فِی الْحِجْرِ، مُضْطَجِعًا اِذْ اَتَانِیْ اٰتٍ'' ''اس اثنا میں کہ میں حطیم، یا شاید حجر کا لفظ ارشاد فرمایا (حجر بھی حطیم کے ایک حصے کو کہتے ہیں) میں لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک آنے والا آیا''۔ یہ آنے والا کون ہے؟ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، یہ آگے واضح ہو جائے گا ((فَشَقَّ مَابَیْنَ هٰذِهٖ اِلٰی هٰذِهٖ (مِنْ ثُغْرَةِ نَحْرِهٖ اِلٰی شِعْرَتِهٖ) فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِیْ ''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس نے یہاں سے وہاں تک میرا سینہ چاک کیا (یعنی حلق کے گڑھے سے لے کر ناف تک)، پھر میرا دل نکالا۔'' ((ثُمَّ اُتِیْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوْءَةٍ اِیْمَانًا فَغُسِلَ قَلْبِیْ)) ''پھر ایک سنہری طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا، پھر اس سے میرا دل دھویا گیا''۔ وفی روایة: ((ثُمَّ غُسِلَ الْبَطْنُ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِیءَ اِیْمَانًا وَحِكْمَةً)) اور ایک روایت میں آتا ہے کہ ''اسی طرح پیٹ کو بھی زمزم سے دھویا گیا اور اس میں ایمان و حکمت بھر دیئے گئے''۔ ((ثُمَّ اُتِیْتُ بِدَابَّةٍ، دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ، اَبْیَضَ، یُقَالُ لَهُ الْبُرَاقُ)) ''پھر میرے پاس ایک چوپایہ لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا، وہ بالکل سفید تھا، اس کا نام براق ہے''۔ ((یَضَعُ خَطْوَهٗ عِنْدَ اَقْصٰی طَرْفِهٖ)) ''اس کا ہر قدم، اس کی حد نگاہ تک پڑتا تھا''۔ ((فَحُمِلْتُ عَلَیْهِ)) ''پس مجھے اس پر سوار کیا گیا''۔ ((فَانْطَلَقَ بِیْ جِبْرِیْلُ)) ''اور جبرائیلؑ میرے ساتھ چلے''۔ اب یہاں نام کے ساتھ صراحت ہوگئی کہ آنے والے حضرت جبریلؑ تھے۔ ((حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ الدُّنْیَا)) ''یہاں تک کہ وہ آسمانِ دنیا تک پہنچ گئے''۔ یعنی یہ پہلا آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے۔

اس روایت میں سفرِ معراج کے زمینی حصہ کا ذکر نہیں ہوا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور دوسری روایات جوڑ کر اس خلا کو پُر کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے سفرِ معراج کا پہلا حصہ زمینی سفر پر مشتمل ہے۔ یعنی پہلے آپ مسجد اقصیٰ تک پہنچے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے اپنی سواری براق کو اس

Salman Saleem 03067163117

جگہ باندھا جہاں انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ مسجد میں بہت سے لوگ نماز کے لیے جمع تھے۔ میں منتظر تھا کہ کون امامت کرائے گا کہ حضرت جبرائیلؑ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے کیا، میں نے نماز پڑھائی اور پھر حضرت جبرائیلؑ نے مجھے بتایا کہ آپؐ کی اقتدا میں نماز ادا کرنے والے وہ تمام انبیاء ہیں جو دنیا میں مبعوث ہوئے اور آج آپؐ نے ان سب کی امامت کی''۔ یہ علامت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سید الانبیاء والمرسلین ہونے کی۔ پھر یہاں سے آسمانی سفر کا آغاز ہوا۔

اب پھر اسی روایت کا سلسلہ جوڑتے ہیں جو بیان ہو رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ پہلے آسمان پر پہنچے تو حضرت جبرائیلؑ نے دستک دی۔ ((فَاسْتَفْتَحَ)) ''پس اس نے دروازہ کھلوانا چاہا''۔ ((فَقِيْلَ: مَنْ هٰذَا؛ قَالَ: جِبْرِيْلُ)) ''تو پوچھا گیا: کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جبرائیل''۔ ((قِيْلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟)) ''پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟'' یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ آسمانِ اول کے دروازے پر تعینات فرشتوں کو معلوم ہو، پھر بھی پوچھ رہے ہوں۔ قانون قانون ہے، لہٰذا دروازے پر دستک دینی ہوگی اور شناخت کرانی ہوگی۔ کوئی جج اپنے علم کی بنیاد پر کبھی فیصلہ نہیں دے گا۔ فیصلہ تو مقدمے کی سماعت اور شہادتوں کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ کسی جج کو کسی واقعے کا ذاتی علم ہو تو بھی اسے مقدمہ کسی عدالت کو منتقل کرنا ہوگا اور وہاں گواہ کی حیثیت سے پیش ہونا ہوگا۔ پس قانون قانون ہے۔ ''پوچھا گیا ساتھ کون ہے؟'' ((قَالَ: مُحَمَّدٌ)) ''حضرت جبرائیلؑ نے جواب دیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)''۔ ((قِيْلَ: وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ)) ''پوچھا گیا، کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں''۔ ((قِيْلَ: مَرْحَبًا بِهٖ. فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ. فَفَتَحَ)) ''اس کے بعد کہا گیا: مرحبا ہے ان کے لیے (تہنیت ہے، مبارک باد ہے، خوش آمدید ہے) کیا ہی اچھے ہیں جو لائے گئے ہیں۔ پھر سماءِ دنیا کا دروازہ کھولا گیا''۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا فِيْهَا اٰدَمُ)) ''پھر جب میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا وہاں آدم علیہ السلام تشریف فرما ہیں''۔ ((فَقَالَ: هٰذَا اَبُوْكَ اٰدَمُ. فَسَلِّمْ عَلَيْهِ. فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ)) ''جبرائیلؑ نے کہا: یہ آپؐ کے جد

Salman Saleem 03067163117

امجد حضرت آدمؑ ہیں، پس آپ ان کو سلام کیجئے، تو میں نے ان کو سلام کیا"۔ ((فَرَدَّ السَّلَامَ. ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالِابْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) "انہوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید ہے، (تہنیت ہے) صالح بیٹے اور صالح نبی کے لیے۔"

((ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتَّى السَّمَاءَ الثَّانِيَةَ)) "پھر جبرائیل مجھے لے کر اوراوپر گئے یہاں تک کہ دوسرے آسمان تک پہنچ گئے"۔ یہاں بھی وہی سوال و جواب ہوئے۔ ((فَاسْتَفْتَحَ، قِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ جِبْرِيلُ. قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ (ﷺ) قِيلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيلَ: مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ. فَفَتَحَ)) اس ساری عبارت کا ترجمہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا يَحْيٰى وَعِيسٰى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ، قَالَ: هٰذَا يَحْيٰى وَهٰذَا عِيسٰى. فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا. فَسَلَّمْتُ. فَرَدَّا ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) "پھر جب میں (دوسرے آسمان میں) داخل ہوا تو وہاں یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) تھے اور یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں، ان کو سلام کیجیے، تو میں نے سلام کیا۔ انہوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: خوش آمدید، مرحبا صالح بھائی اور صالح نبی کو"۔ یہاں غور کیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضور ﷺ کا استقبال "بیٹا" کہہ کر کیا، جبکہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے "بھائی" کہہ کر خیر مقدم کیا۔ یہ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام تو کل بنی نوعِ انسان کے جدِ امجد ہیں، جبکہ حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، چنانچہ وہ بیٹا کہنے کے بجائے "بھائی" کہتے ہیں۔ اسی طرح آگے حضرات یوسف، موسیٰ اور ہارون علیہم السلام آپ ﷺ کو بھائی کہیں گے اور آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹا کہیں گے، کیونکہ آنحضور ﷺ ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

آگے چلیے، نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((ثُمَّ صَعِدَ بِي إِلَى السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ. فَاسْتَفْتَحَ، قِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ جِبْرِيلُ، قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ:

مُحَمَّدٌ(ﷺ)، قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ. قِيلَ: مَرْحَبًا بِهِ. فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ. فَفُتِحَ. فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا يُوسُفُ. قَالَ: هٰذَا يُوسُفُ. فَسَلِّمْ عَلَيْهِ. فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ. فَرَدَّ. ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) یعنی تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور وہی مکالمہ ہوا۔

اسی طرح چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر حدیث میں اس طرح ہے کہ سلام کے تبادلہ کے بعد ((فَلَمَّا جَاوَزْتُهُ بَكَى)) "جب میں آگے جانے لگا تو موسیٰ علیہ السلام رونے لگے"۔ ((قِيلَ لَهُ مَا يُبْكِيكَ؟)) "ان سے پوچھا گیا: آپ کو کیا چیز رلا رہی ہے؟" ((قَالَ: أَبْكِي لِأَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِي يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِهِ أَكْثَرُ مِمَّنْ يَدْخُلُهَا مِنْ أُمَّتِي)) "موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اس بات پر رونا آرہا ہے کہ یہ جوان (محمد ﷺ) جن کی بعثت میرے بہت بعد ہوئی ہے (اس کے باوجود) ان کی امت سے جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد میری امت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی"۔ وہ شفقت والفت جو کسی نبی کو اپنی امت سے ہونی چاہیے یہ اس کا بکمال وتمام اظہار ہے۔ اسے معاذ اللہ کسی حسد پر محمول نہ کرلیجئے گا، بلکہ یہ اپنی امت کی محرومی کا احساس ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ کیفیت طاری ہوئی۔

((ثُمَّ صَعِدَ بِي إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ.....)) "پھر مجھے ساتویں آسمان پر لے جایا گیا" وہاں بھی داخلہ کے لیے فرشتوں سے مکالمہ ہوا۔ اس آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا إِبْرَاهِيمُ. قَالَ: هٰذَا أَبُوكَ إِبْرَاهِيمُ. فَسَلِّمْ عَلَيْهِ. فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ. فَرَدَّ السَّلَامَ. ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) "پھر جب میں داخل ہوا تو وہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تھے۔ جبریل نے کہا: یہ آپ کے جد حضرت ابراہیم ہیں، انہیں سلام کیجئے، چنانچہ میں نے انہیں سلام کیا، جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کہا اور ان

Salman Saleem 03067163117

الفاظ سے میرا استقبال کیا: خوش آمدید ہو صالح بیٹے اور صالح نبی کے لیے۔"

((ثُمَّ رُفِعْتُ إِلَى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى)) "پھر مجھے اور بلند کیا گیا سدرۃ المنتہیٰ تک"۔ یہاں نوٹ کیجئے "صَعِدَبِیْ" کی جگہ "رُفِعْتُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور یہی سدرۃ المنتہیٰ ہے، جس کا ذکر سورۃ النجم میں ہوا ہے۔

## سورۃ النجم میں مشاہداتِ معراج کا ذکر

میں چاہتا ہوں کہ حدیث کے بیان کی تکمیل سے قبل ہم اس واقعہ سے متعلق سورۃ النجم کی آیات کا مطالعہ بھی کر لیں۔ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کی تفسیر و تشریح میں اختلاف سلف سے چلے آ رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جو مشاہدات کرائے گئے اور جن کا ذکر سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے، اس وقت میں ان سب سے بحث نہیں کروں گا، البتہ جس مشاہدے کا ذکر آیات ۱۱ تا ۱۸ میں آیا ہے، میں اس کا ذکر کروں گا، کیونکہ ان آیات کا تعلق تقریباً تمام مفسرین و علمائے امت کے نزدیک واقعہ معراج سے ہے۔ فرمایا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ "جو کچھ انہوں (ﷺ) نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اس کو ان کے دل نے جھٹلایا نہیں"۔ اس کی طرف میں قبل ازیں اشارہ کر چکا ہوں کہ ایک ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ وسوسے بھی ہوتے ہیں کہ یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں کیا یہ واقعتاً ایسا ہی ہے؟ جو آگ سامنے نظر آ رہی ہے وہ درحقیقت آگ ہے یا آگ کی سی صورت ہے؟ آج کل تو اس طرح کے لیمپ اور ہیٹر بنے ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان کو ان کے اندر حقیقی انگارے دہکتے نظر آتے ہیں، ان سے انسان دھوکہ کھا سکتا ہے، حالانکہ انگاروں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ تو ہماری آنکھ دھوکہ کھا جاتی ہے، لیکن نبیؑ کا جو مشاہدہ ہوتا ہے وہ آنکھ اور دل، نظر و قلب، بصارت و بصیرت کی یکجائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں فرق و تفاوت اور وسوسہ نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے نہایت فصاحت و بلاغت اور اعجاز و ایجاز کے ساتھ فرمایا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔

آگے فرمایا: اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ⑫ "لوگو! کیا تم ان چیزوں کے بارے میں ان سے جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتے ہیں؟" ان چیزوں کے بارے میں تو جھگڑا ہو سکتا ہے جو

Salman Saleem 03067163117

کہیں سے سنی سنائی ہوں، لیکن تم محمد (ﷺ) سے ان چیزوں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو وہ دیکھتے ہیں چشمِ سر سے اور دل کی بصیرت سے؟ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ ''اور وہ اسے ایک بار اور بھی دیکھ چکے ہیں''۔ ہمارے رسول ﷺ کا یہ مشاہدہ پہلی بار نہیں ہوا، ایک مرتبہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ موجودہ مشاہدہ ان کو کہاں ہوا؟ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس''۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ ''اسی (سدرۃ المنتہیٰ) کے پاس جنت الماویٰ ہے''۔ وہ جنت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور جو اللہ کے نیکوکار بندوں کا ٹھکانہ بنے گی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ جس کے متعلق سورۃ الزمر میں فرمایا گیا: وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ (آیت ۷۳) ''اور جنت کے داروغہ ان (نیکوکاروں) سے کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، تم بہت خوش بخت رہے، داخل ہو جاؤ اس (جنت) میں ہمیشہ ہمیش کے لیے''۔ یہاں نوٹ کر لیجئے کہ احادیث میں معراج کے موقع پر جنت کے مشاہدات کے جو احوال آئے ہیں، وہ جنت وہیں تو ہے۔ ان آیات میں ان احوال کا ذکر نہیں ہے۔

''سدرہ'' عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ لفظ ''منتہیٰ'' انتہا سے بنا ہے، جس کا مفہوم وہ جگہ اور مقام ہے جہاں جا کر کوئی چیز ختم ہو جائے۔ یہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' کیا ہے! اس کا سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اس کے متعلق میں آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔ قرآن مجید نے یہاں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ ہر شخص اس اسلوب سے یہ جان لے کہ یہ میرے فہم سے بالاتر ہے۔ یہ منتہیٰ کس اعتبار سے ہے، اب اس کو سمجھنا چاہیے۔ یہ اس اعتبار سے ''منتہیٰ'' ہے کہ یہاں سے آگے مخلوق کا گزر نہیں ہے۔ یہ انتہا ہے۔ یہاں سے آگے حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی نہیں جا سکتے اور نوٹ کیجئے کہ اس سے آگے جانے کا کہیں محمد رسول اللہ ﷺ کا بھی ذکر نہیں ہے۔ یہ صرف ہماری شاعری میں ہے کہ حضور ﷺ اس سے بھی آگے گزر گئے۔ لیکن اس کا قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ بھی یہیں تک گئے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اس بارے میں بھی وضاحت آئی ہے کہ وحی الٰہی بھی یہاں نازل ہوتی ہے اور یہاں سے فرشتے لے لیتے ہیں۔ گویا جو چیز بھی عرشِ الٰہی سے اترتی ہے، وہ بلاواسطہ اوّلاً یہیں نازل ہوتی ہے۔ اس

Salman Saleem 03067163117

سے آگے وہ حریم کبریا ہے جس میں مخلوق کا داخلہ ممکن نہیں ہے۔ عالمِ خلق کی کوئی شے جو کبھی اوپر آسکتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ یہیں تک آسکتی ہے، اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی رسائی بھی یہیں تک ہے۔ لہٰذا نوٹ کیجئے کہ قرآن مجید نے جو ذکر کیا وہ سدرۃ المنتہیٰ کے آگے یا پار کا نہیں کیا، بلکہ فرمایا: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾

آگے فرمایا: اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى ﴿١٦﴾ ''جب اس بیری کے درخت کو ڈھانپے ہوئے تھا جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ یعنی نہ اس کو زبان ادا کرسکتی ہے، نہ انسانی زبان میں وہ حروف و الفاظ ہیں جو اس کیفیت کو بیان کرسکیں یا اس کی تعبیر کرسکیں، نہ اس کا کوئی تصور انسان کے لیے ممکن ہے۔ جنت کی نعمتوں کے بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے: ((مَا لَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ))[1] ''وہ نعمتیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں، نہ کسی انسان کے دل پر کبھی ان کا خیال تک آیا''۔ اب انہیں بیان کریں تو کن الفاظ میں کریں! ان کا ابلاغ و اعلان کیسے ہو! وہ Communicate کیسے ہوں!... ابلاغ اور اعلان تو کسی ایسی چیز کے حوالے سے ہوتا ہے جس کا آپ کو تجربہ ہو، وہ آپ کی دید یا شنید میں آئی ہو، آپ کے ذہن میں اس کا کوئی تصور ہو، تو اس کے حوالے سے بات ہوسکتی ہے۔ لہٰذا یہاں اسلوب اور انداز یہ اختیار کیا گیا: اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى ﴿١٦﴾ ''جبکہ سدرہ کو ڈھانپے ہوئے تھا جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ تجلیاتِ ربانی کس نوعیت اور کس کیفیت کی حامل تھیں، اسے سمجھنا انسانی ذہن کے لیے ممکن نہیں، تجلیات کا جو براہِ راست نزول ہو رہا تھا، اس مہبطِ تجلیات اور ان کے نزول کا نبی اکرم ﷺ نے مشاہدہ فرمایا۔

### معراج اور رؤیتِ باری تعالیٰ

ہماری شاعری میں بے انتہا مبالغے ہو جایا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال جو کچھ بھی تھے

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق و کتاب تفسیر القرآن و کتاب التوحید. باب قول اللہ تعالیٰ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ۔ وصحیح مسلم، کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمھا۔

بہر حال شاعر بھی تھے اور شاعری میں مبالغہ لازماً ہو جاتا ہے، لہٰذا کہتے ہیں: ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری و تبسمی!

یعنی ''موسیٰ علیہ السلام تو ایک جلوۂ صفات ہی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے (وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا) جبکہ آپؐ عینِ ذات کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں''۔ میرے نزدیک یہ مبالغہ ہے، عینِ ذات کے مشاہدے کا ذکر نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں۔ تاہم اس ضمن میں اختلاف صحابہ کرامؓ سے چلا آ رہا ہے۔ یہ اختلاف سلف میں بھی ہے اور خلف میں بھی۔ لہٰذا کوئی یہ رائے رکھنا چاہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا تو رکھے۔ میں نے آغاز ہی میں واضح کر دیا تھا کہ اس واقعہ معراج کا بالکلیہ انکار کفر ہوگا، لیکن تفصیلات اور توجیہات و تاویلات کا اختلاف کفر نہیں ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ شب معراج میں حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا، براہِ راست دیدارِ الٰہی ہوا۔ لیکن زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا براہِ راست مشاہدہ نہیں ہوا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جب ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی؟ یعنی ''اللہ تو ایک نور ہے، اسے دیکھا کیسے جا سکتا ہے؟'' آپ نور کے ذریعے سے کسی اور شے کو دیکھتے ہیں، نور تو نور ہے، اس کو کہاں دیکھا جا سکتا ہے! نوٹ کیجئے کہ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا:

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾ (النجم)

درمیانی آیت کے متعلق تو میں بعد میں عرض کروں گا، پہلے آخری آیت پر غور کیجئے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ محمد ﷺ نے کیا دیکھا! ''بے شک انہوں نے اپنے رب کی عظیم الشان نشانیوں کو دیکھا''۔ ''کُبْرٰی'' اسم تفضیل ہے۔ پس یہاں عظیم ترین آیاتِ ربانیہ کے مشاہدے کا ذکر ہے۔ یعنی محمد ﷺ کو رب کا نہیں، آیاتِ ربانیہ کا مشاہدہ ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں معراج کے زمینی سفر کی غرض وغایت یہ بیان ہوئی کہ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا یعنی یہ سفر اس لیے کرایا گیا کہ ہم اپنے رسول کو اپنی آیات میں سے چند ایک کا

Salman Saleem 03067163117

مشاہدہ کرائیں۔ وہاں ''کبریٰ'' نہیں آیا۔ وہ زمینی آیات ہیں، وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن عظیم ترین آیات الٰہیہ وہ ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے ہیں، جن کا رسول اللہ ﷺ نے مشاہدہ فرمایا۔

اس حوالے سے اگر تقابل کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا اور اس اعتبار سے فضیلت محمدی ﷺ ثابت کی جائے تو درست ہوگی کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی ایک تجلی جو کوہِ طور پر پڑی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کا بھی تحمل نہ کر سکے اور یہاں تجلیاتِ ربانیہ کا سدرۃ المنتہیٰ پر براہِ راست جو نزول ہو رہا تھا جناب محمد ﷺ نے انہیں بھرپور انداز میں دیکھا اور ان کا تحمل کیا۔ اس اعتبار سے فرق و تفاوت ثابت ہے۔ لیکن اگر یہاں ذاتِ باری تعالیٰ کے دیدار کو لایا جائے تو یہ بلاسند ہے، اس کی قرآن یا حدیث میں سند موجود نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ اتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اس کی صراحت کر دی جاتی یا کم از کم حدیث میں ہی اس کی تصریح ہوتی۔ ہاں بعض صحابہؓ کے یہ اقوال کہ آپ شبِ معراج میں دیدارِ الٰہی سے بھی مشرف ہوئے تھے، سند کے ساتھ منقول ہیں۔ لیکن عظیم اکثریت کی رائے بھی یہی ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آنکھیں عطا کی ہیں اور ان میں بصارت کی جو صلاحیت رکھی ہے وہ دیدارِ الٰہی کا تحمل نہیں کر سکتیں۔ یہ رائے رکھنے والے اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم اس کے لیے قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (الانعام:۱۰۳) ''نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے''۔ البتہ قیامت کے روز اہلِ ایمان دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بعث بعد الموت پر ان کو وہ بصارت عطا فرمائے گا جو دیدارِ الٰہی کا تحمل کر سکے گی۔ سورۃ القیامہ میں ارشاد ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ ''کچھ چہرے اُس روز تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے''۔ نیز حدیث میں بھی آیا ہے کہ اہل جنت کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہوا کرے گی۔

Salman Saleem 03067163117

## مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝ کا مفہوم:

اب میں سورۃ النجم کی آیت ۱۷ کے متعلق کچھ عرض کروں گا جس کی تشریح وتوضیح موخر کی گئی تھی، یعنی: مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ اس مقام پر بڑی عجیب کیفیت بیان کی گئی ہے اور اس آیت کو سمجھنا آسان نہیں ہے جب تک آپ چند کیفیات کو اچھی طرح جان نہ لیں۔ ہمارے اپنے مشاہدے کے بارے میں ایک کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مشاہدے کا شوق ہے اور وہ شوق اتنا ہے کہ حدِ ادب سے بھی تجاوز کرنا چاہتا ہے لیکن ظرف اتنا نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ حسرت موہانی کا ایک شعر ہے:

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
مرے شوق کی بلندی، مری ہمتوں کی پستی!

شوق بہت بلند ہے، دیکھنا بہت کچھ چاہتے ہیں، لیکن آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، دیکھ ہی نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیتِ قرآنیہ: مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ ان دو متضاد کیفیات کو نہایت بلیغ اسلوب سے بیان کر رہی ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے کہ "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا" یعنی کسی شے حقیقت کو اس کی ضد (antonym) کے حوالے سے بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ جیسے رات کی حقیقت دن کے تقابل سے سمجھ میں آتی ہے اور دن کی حقیقت رات کے تقابل سے سمجھی جاسکتی ہے۔ اب علامہ اقبال کا وہ شعر ملاحظہ ہو جو اُن کی نظم "ذوق وشوق" میں ہے۔ علامہ کی یہ نظم میرے نزدیک ان کے اردو کلام کی معراج (climax) ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کا ایک شعر ہے:

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب!

دونوں اعتبارات سے جو ضد ہے اسے اقبال اس شعر میں لائے ہیں۔ یعنی ایک طرف میری نگاہ میں بے ادبی تھی، اور وہ چوری چوری بھی کچھ دیکھ لینا چاہتی تھی جس کا دیکھنا ادب کے خلاف ہے۔ لیکن دوسری طرف حوصلۂ نظر نہیں تھا، لہٰذا دیکھ نہیں سکی۔ اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اس مشاہدے کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو مشاہدہ محمد رسول اللہ ﷺ کر

Salman Saleem 03067163117

رہے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ مشاہدہ اللہ کا نہیں بلکہ "اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی" کا مشاہدہ ہے۔ لیکن اس مشاہدے کی شان یہ ہے کہ نگاہ جمی رہی۔ یہ ظرف ہے محمد عربی ﷺ کا کہ نگاہیں چکا چوند نہیں ہوئیں۔ جہاں تیز روشنی ہو نگاہیں اس کا تحمل نہیں کر سکتیں اور دیکھنے والا نگاہ ہٹانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں حال یہ ہے کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ نگاہ کج نہیں ہوئی، ٹیڑھی نہیں ہوئی۔ جو کچھ دیکھا ہے نگاہ کو جما کر دیکھا ہے، جو مشاہدہ کیا ہے، بھرپور کیا ہے، پورے ظرف کامل کے ساتھ کیا ہے، پورے تحمل کے ساتھ کیا ہے، لیکن: وَمَا طَغٰی حد سے تجاوز نہیں کیا، بے ادبی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ "طَغٰی" ہی سے طغیانی بنا ہے، یعنی حد سے نکل جانا:

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

طَغٰی، حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ وہ چونکہ مقامِ ادب بھی ہے، لہٰذا وہاں حد سے تجاوز نہیں ہوا۔ اَلعبدُ عبدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی، وَالرَّبُّ ربٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ "بندہ بندہ ہی رہے گا خواہ کتنے بلند مقام تک پہنچ جائے اور رب رب ہی رہے گا خواہ کتنا ہی نزولِ اجلال فرمائے"۔ سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ کر بھی محمد ﷺ مقامِ بندگی سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں۔ وہاں بھی حال یہ ہے کہ: فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴿۱۰﴾ "پس (وہاں بھی) وحی پہنچائی اپنے بندے کو جو وحی پہنچانی تھی"۔ لیکن عَبدہٗ وَرَسُوْلُه کے مشاہدے کی کیفیت یہ ہے کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ "نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ ہی اس نے حد سے تجاوز کیا"۔ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾ "بالتحقیق انہوں نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا"۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ آیاتِ کبریٰ ہمارے تخیل و تصور سے بالاتر ہیں اور انسانی زبان کے الفاظ اس کے بیان کا تحمل بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بھی ان کا ذکر مجمل طور پر ہی کیا گیا ہے۔

## حدیث معراج کا تسلسل

اب ہم دوبارہ زیر مطالعہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں سدرۃ المنتہٰی

Salman Saleem 03067163117

کی بات شروع ہوئی تھی۔ نبی اکرم ﷺ سے حضرت مالک بن صعصعہؓ روایت کرتے ہیں: ((ثُمَّ رُفِعْتُ اِلٰی سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی)) ''پھر مجھے اُٹھالیا گیا سدرۃ المنتہیٰ تک''۔ ((فَاِذَا نَبْقُھَا مِثْلُ قِلَالِ ھَجَرَ. وَاِذَا وَرَقُھَا مِثْلُ اٰذَانِ الْفِیَلَۃِ)) اب حضور ﷺ سدرۃ المنتہیٰ کی کچھ باتیں ہماری زبان میں سمجھا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ: ''اُس بیری کے درخت کے بیر تو علاقہ ہجر کے مٹکوں کے حجم کے ساتھ اور اُس کے پتے ہاتھی کے کانوں جتنے بڑے تھے''۔ ((قَالَ: ھٰذِہٖ سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی)) ''(حضرت جبرائیلؑ نے) کہا: یہ ہے سدرۃ المنتہیٰ''۔ ((فَاِذَا اَرْبَعَۃُ اَنْھَارٍ: نَھْرَانِ بَاطِنَانِ، وَنَھْرَانِ ظَاھِرَانِ)) ''میں نے وہاں چار نہریں دیکھیں، دو نہریں خفیہ طور پر اور دو ظاہر طور پر بہہ رہی تھیں''۔ ((فَقُلْتُ مَاھٰذَا یَاجِبْرِیْلُ؟)) ''تو میں نے پوچھا: جبرائیل! یہ کیا ہیں؟'' ((قَالَ: اَمَّا الْبَاطِنَانِ فَنَھْرَانِ فِی الْجَنَّۃِ)) ''یہ جو دو ڈھکی ہوئی نہریں جاری ہیں یہ تو جنت کی نہریں ہیں (ایک کوثر اور دوسری سلسبیل)''۔ ((وَاَمَّا الظَّاھِرَانِ، فَالنِّیْلُ وَالْفُرَاتُ)) ''اور یہ جو ظاہری نہریں جاری ہیں یہ نیل اور فرات ہیں''۔ یعنی جن کا مادی پرتو ہمیں دنیا میں نظر آتا ہے۔

((ثُمَّ رُفِعَ لِیَ الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ)) ''پھر بیت المعمور میرے قریب لایا گیا''۔ بیت المعمور درحقیقت ساتویں آسمان پر اللہ تعالیٰ کا اصل گھر ہے، جس کا ظل اور سایہ اس دنیا میں خانہ کعبہ ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جبرائیلؑ نے اس کے بارے میں بتایا: ((یُصَلِّیْ فِیْہِ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ، اِذَا خَرَجُوْا لَمْ یَعُوْدُوْا اِلَیْہِ آخِرُ مَا عَلَیْھِمْ)) ''اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور جب ایک بار اس سے نکلتے ہیں تو دوبارہ ان کے داخلے کی نوبت نہیں آتی''۔ اسی طریقے سے فرشتے بیت الحرام میں خانہ کعبہ کا بھی طواف کرتے ہیں۔ پھر جان لیجئے کہ یہ ہماری نگاہوں سے مخفی عالم غیب کی ایک دنیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک وجود ہے، چاہے وہ ہمیں نظر نہ آئے۔ (واضح رہے کہ بخاری و مسلم کی بعض روایات میں بیت المعمور کا ذکر سدرۃ المنتہیٰ سے مقدم ہے) ((ثُمَّ اُتِیْتُ بِاِنَاءٍ مِنْ خَمْرٍ، وَاِنَاءٍ مِنْ لَبَنٍ، وَاِنَاءٍ مِنْ عَسَلٍ)) ''پھر میرے سامنے تین

Salman Saleem 03067163117

برتن لائے گئے، ایک شراب کا، ایک دودھ کا اور ایک شہد کا''۔ ((فَاَخَذْتُ اللَّبَنَ)) ''تو میں نے دودھ والا پیالہ اُٹھالیا''۔ ((قَالَ: هِيَ الْفِطْرَةُ الَّتِيْ اَنْتَ عَلَيْهَا وَاُمَّتُكَ)) ''حضرت جبرائیلؑ نے کہا: یہی مطابق فطرت ہے، جس پر آپ بھی ہیں اور آپ کی اُمت بھی''۔ یعنی انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے انتخاب کی توثیق کی۔ یہی بات اس آیت میں فرمائی گئی ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط (الروم: ۳۰) چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اسی فطرتِ انسانی کا انتخاب فرمایا جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔

اُمت کے لیے معراج کے تحفے: نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا: ((ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلَوَاتُ، خَمْسِيْنَ صَلَاةً كُلَّ يَوْمٍ)) ''پھر مجھ پر (اور میری امت پر) پچاس نمازیں یومیہ فرض کی گئیں''۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ مجھے اس موقع پر تین چیزیں عطا کی گئیں: ایک تو پچاس نمازیں ایک دن رات میں فرض ہوئیں اور دوسری سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات:

> اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور تیسری چیز یہ ہے کہ آپؐ کی امت کے گناہ کبیرہ بھی بغیر توبہ کے معاف ہو سکیں گے۔ یہ خصوصی تحفے ہیں جو بارگاہِ رب العزت سے اس مقام پر شبِ معراج میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو امت کے لیے عطا ہوئے۔ اس میں اولین صلوٰۃ ہے۔ یہ معراج میں فرض ہوئی، لہٰذا اس کے متعلق اولیاء کرامؒ کا قول ہے: ''اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' یعنی

Salman Saleem 03067163117

نماز اہل ایمان کے لیے بمنزلہ معراج ہے۔

پھر اسی روایت میں آگے تفصیل آ رہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب واپسی کے لیے آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: ''یہ پچاس نمازیں بہت زیادہ ہیں، مجھے لوگوں کا تجربہ ہے، آپ کی امت اس کا تحمل نہ کر سکے گی، واپس جائیے اور تخفیف کے لیے درخواست کیجیے''۔ حضور ﷺ واپس گئے تو دس نمازیں معاف ہو گئیں، چالیس رہ گئیں۔ پھر آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے پھر وہی بات کہی اور آپ کو واپس بھیجا۔ پھر گئے تو تیس ہو گئیں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھیجنے پر پھر گئے تو بیس ہو گئیں، پھر تشریف لے گئے تو دس رہ گئیں۔ اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہی بات کہی۔ آپ ﷺ پھر گئے تو اب پانچ رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کہا کہ پھر واپس جائیے اور تخفیف کے لیے درخواست کیجیے، پانچ نمازیں بھی آپؐ کی امت کے لیے بھاری ہوں گی۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب مجھے شرم آتی ہے، اتنی مرتبہ جا چکا ہوں کہ اب مزید جانے میں حیا محسوس کر رہا ہوں، لہٰذا میں اسی پر راضی ہوں اور اس معاملے کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جب میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے واپسی کے لیے روانہ ہوا تو ایک ندا کرنے والے کی ندا آئی کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) ''میں نے اپنے فرض کو نافذ کر دیا ہے اور اپنے بندوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور میں نیکی کا بدلہ دس گنا دیتا ہوں''۔ ایک دوسری متفق علیہ روایت کے آخر میں اس کا ذکر ہے کہ ''اللہ کے ہاں یہ پانچ نمازیں اجر و ثواب کے حساب سے پچاس نمازوں کے مساوی ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں قول بدلا نہیں جاتا''۔ میں نے بقیہ حدیث کی ترجمانی اپنے الفاظ میں کر دی ہے۔ اب اس کے آخری حصے کا متن بھی ملاحظہ کر لیجیے:

((فَرَجَعْتُ اِلٰی مُوْسٰی، فَقَالَ: بِمَ اُمِرْتَ؟ قُلْتُ: اُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ کُلَّ یَوْمٍ. قَالَ: اِنَّ اُمَّتَکَ لَا تَسْتَطِیْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ کُلَّ یَوْمٍ، وَاِنِّیْ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَکَ، وَعَالَجْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ. فَارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ، فَاسْأَلْهُ التَّخْفِیْفَ

Salman Saleem 03067163117

لِأُمَّتِكَ. قَالَ: سَأَلْتُ رَبِّيْ حَتَّى اسْتَحْيَيْتُ وَلٰكِنِّيْ أَرْضٰى وَأُسَلِّمُ، قَالَ: فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰى مُنَادٍ: أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِيْ وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِيْ وَأَجْزِي الْحَسَنَةَ عَشْرًا))

صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ اور کتاب المناقب، باب المعراج میں وارد ہوئی ہے، جبکہ صحیح مسلم میں کم وبیش الفاظ کے ساتھ کتاب الایمان، باب الاسراء بِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِلَی السَّمٰوات وفرض الصلوات میں بھی آئی ہے۔ اس متفق علیہ روایت کے علاوہ بھی واقعہ معراج کے متعلق کثیر روایات موجود ہیں۔ آنحضور ﷺ کو جنت ودوزخ کے جو مشاہدات کرائے گئے وہ دوسری روایات میں مذکور ہیں، لیکن اسناد کے اعتبار سے کسی دوسری روایت کا وہ درجہ اور مرتبہ نہیں ہے جو اس روایت کا ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ پھر حضور ﷺ واپس مسجد اقصیٰ تشریف لائے اور وہاں سے بُراق پر مکہ مکرمہ مراجعت ہوئی۔ میں چند دوسری روایات کی روشنی میں عرض کر چکا ہوں کہ اس پورے سفر معراج کے دوران وقت بالکل نہیں گزرا۔ گویا وقت کہیں روک دیا گیا اور پوری کائنات کو کہیں تھام دیا گیا۔ یہ بات تو وہ ہے جو آج سے پہلے بھی سمجھ میں آسکتی تھی کہ شاید کسی ایک وقت پر پوری کائنات کو روک دیا گیا ہو اور کسی کے لیے بھی وقت بالکل نہ گزرا ہو۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت تو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سب کے لیے وقت گزر رہا ہو، لیکن صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے نہ گزرے۔ تاہم یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس پورے سفر کے لیے وقت کی رفتار کو روک دیا گیا ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎ ''آگے بڑھو یا وقت کی رفتار روک دو!''... تو یہ وقت کی رفتار محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے روک دی گئی تھی۔ واللہ اعلم!!

## مشرکین کا ردِعمل

اس واقعہ کو نبی اکرم ﷺ نے جب ایک مجمع میں سنایا تو اس پر جو ردِعمل اور جو ہنگامہ ہونا تھا، وہ ہوا۔ یہاں تک بھی ہوا کہ بعض مومنین صادقین متزلزل، متردد اور

Salman Saleem 03067163117

متذبذب ہو گئے۔ مشرکین مکہ نے بغلیں بجائیں کہ اب ہمیں اپنے پروپیگنڈے کے لیے بڑا سنہری موقع مل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک تو یہ شک ہی کی بات تھی کہ (نقل کفر، کفر نہ باشد) ان کو کچھ خللِ دماغ کا عارضہ ہے، اب تو ثابت ہو گیا، اب تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ آپ حضرات خود اس کا اندازہ کیجیے کہ یہ واقعہ مکہ میں مجمع عام میں بیان کیا جارہا ہے، جہاں منکرین نبوت کی عظیم ترین اکثریت ہے، وہاں کیسی ہنگامہ آرائی ہوئی ہوگی! پھر مشرکین کی جانب سے امتحانی سوالات کیے گئے: اچھا! یہ بتایئے کہ مسجد اقصیٰ کے ستون کتنے ہیں؟ وہاں کی کھڑکیاں کیسی ہیں؟ فرش کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ.... حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں گھبرا گیا۔ اس لیے کہ ایسی تفصیلات کس کو یاد رہتی ہیں۔ مسجد اقصیٰ میں جا کر حضور ﷺ ستون تو نہیں گنتے رہے تھے۔ لیکن جب ایسے سوالات کیے جارہے تھے تو عین ممکن تھا کہ مجمع میں تالی پٹ جائے، مگر اچانک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سامنے مسجد اقصیٰ کو ظاہر کر دیا۔ اب آپؐ دیکھ دیکھ کر ان کے اس طرح کے سوالات کے جوابات دیتے رہے کہ لوگ دنگ ہوتے رہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ؓ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَمَّا كَذَّبَتْنِيْ قُرَيْشٌ قُمْتُ فِي الْحِجْرِ فَجَلَّى اللهُ لِيَ بَيْتَ الْمَقْدِسِ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُهُمْ عَنْ اٰيَاتِهٖ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهِ)) (1)

"حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا: "جب مجھ کو قریش نے (واقعۂ معراج پر) جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے ظاہر فرما دیا۔ چنانچہ میں نے ان کو اس کی نشانیاں بتانی شروع کر دیں اور میں اس کو دیکھتا جاتا تھا۔"

---

(1) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب حدیث الاسراء، و کتاب تفسیر القرآن، باب قوله: اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذکر المسیح ابن مریم والمسیح الدجال۔

Salman Saleem 03067163117

میں نے عرض کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ کی طرف سے بے شمار مشاہدات کرائے گئے۔ جنت آپؐ کے سامنے لے آئی جاتی ہے، جہنم سامنے لے آئی جاتی ہے۔ بیت المقدس سامنے لے آیا جاتا ہے اور مسجد اقصیٰ کے مشاہدے سے حضور ﷺ ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔

## حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تصدیق

اسی ضمن میں وہ واقعہ آتا ہے کہ چند لوگ دوڑے دوڑے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ پالا ہم مارلیں تو پھر ہماری جیت ہے، اگر ہم ابوبکرؓ کو متزلزل کردیں تو پھر گویا ہمارے لیے کوئی اور مسئلہ نہیں رہے گا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سن کر ایک مرتبہ تو جھرجھری لی، لیکن آنے والوں سے صرف ایک سوال کیا کہ "کیا واقعی وہؐ یہ فرما رہے ہیں؟" لوگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے کہا: ہاں ہاں وہ یہ کہہ رہے ہیں، چلو ہم تمہیں اپنے ساتھ لے چلتے ہیں، اپنے کانوں سے سن لو۔ انہوں نے سمجھا کہ ہمارا وار کارگر ہوا ہے، واقعی کوئی تزلزل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس سوال کے بعد یہ جواب دیا: "لوگو! اگر آپ ﷺ کہہ رہے ہیں تو صدفی صد درست کہہ رہے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ روزانہ فرشتہ آپ ﷺ کے پاس آتا ہے، اور اگر ایک مرتبہ آپ ﷺ کو آسمان پر لے جایا گیا تو یہ کون سی بڑی شے ہے؟ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں"۔ یہ دن ہے کہ جس دن سے بارگاہِ رسالتؐ سے ابوبکرؓ کو صدیق کا خطاب عطا ہوا اور اسی روز سے ابوبکر "صدیق اکبر" شمار ہوتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

تو یہ تھا وہ سفر معراج، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول حضرت محمد ﷺ کو ہفت آسمان اور سدرۃ المنتہیٰ پر موجود اپنی عظیم نشانیوں کا مشاہدہ کرایا۔

اَقولُ قولی ھٰذا وَاَسْتَغْفِرُ اللہ لِی وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

(بحوالہ "رسول اکرم ﷺ اور ہم")

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

## ہجرتِ مدینہ کا فیصلہ

اس کے بعد حکم خداوندی آیا اور ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ ادھر اہل مکہ کی مخالفت نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ دار الندوہ میں آپ ﷺ کے قتل کے فیصلے کے بعد پورا نقشہ بن چکا ہے کہ قریش کے جتنے گھرانے ہیں ان سب میں سے ایک ایک فرد قتل میں شریک ہو، اس لیے کہ بنی ہاشم جو کبھی لڑائی تو نہیں لڑسکیں گے، کس کس سے قصاص طلب کریں گے؟ ہر گھرانے کا ایک ایک شخص جمع ہو اور رات کی تاریکی میں پل پڑو۔ یہ بھی تعین نہ ہو سکے کہ محمد (ﷺ) کس کی تلوار سے قتل ہوئے۔ یوں سمجھیے کہ قبائلی زندگی کے تمام معاملات و مسائل کو پیش نظر رکھ کر مکمل منصوبہ بندی کی گئی اور رات کو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس محاصرے کے باوجود محمدٌ رسول اللہ ﷺ نکلے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی حفاظت تھی جو نظر نہیں آتی۔ غارِ ثور میں تین دن رہے ہیں اور ڈھونڈے نہ جا سکے، اگرچہ کھوجی تلاش کرنے والوں کو عین غار کے دہانے تک لے گیا ہے۔ کھوج لگانے والے بھی غضب کے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ سیدھا مدینے کا رخ کرنے کی بجائے بالکل دوسری طرف سے گئے ہیں جو بڑا دشوار گزار راستہ ہے۔ بارہ میل کی بڑی ہی سخت چڑھائی ہے اور وہاں جا کر آپ نے غارِ ثور میں روپوشی اختیار کی ہے، لیکن پہنچنے والے وہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ایک دفعہ گھبرا گئے کہ حضور ﷺ ان میں سے کسی نے اگر غیر اختیاری طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔

یہاں اس یقینِ نبوت کا اظہار ہوتا ہے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (الشعراء: ۶۲) "نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ میرے لیے راستہ نکال دے گا!" یہاں آپ ﷺ نے ثانی اثنین رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبہ: ۴۰) "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے!" وہاں سے تین دن کے بعد نکلے ہیں۔ پھر بھی تعاقب جاری ہے۔ اعلان کر دیا گیا ہے کہ محمد کو زندہ پکڑ لاؤ یا ان کا سر لے آؤ اور سو اونٹ لے لو! سو اونٹوں کا اعلان بہت بڑا اعلان ہے۔ سراقہ نے دوڑ لگائی ہے، پہنچ

بھی گیا ہے، لیکن جب قریب پہنچتا ہے تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ پھر توبہ کرتا ہے، باز آتا ہے، لیکن پھر وہ لالچ نظر آتا ہے تو پھر دوڑ لگا دیتا ہے۔ تین مرتبہ پاؤں دھنستے ہیں۔ یہ ہے وہ نصرت وحمایت خداوندی' اس کا انکار نہیں ہے، لیکن اصل بات یہ سمجھنے کی ہے کہ تائید غیبی کب آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آتی ہے! جبکہ انسان اپنے صبر وثبات سے' اپنی محنت' اپنے استقلال سے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کی مدد کا حقدار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کا دس سال کا عرصہ سامنے رکھیے' اس کے بعد یہ راستہ کھلا ہے۔ کیسے کیسے امتحان اور کیسی کیسی آزمائشیں اور کیسی کیسی ناکامیاں پیش آئی ہیں! یومِ طائف کی دعا کو ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کیجئے جو جگر کو چھید دینے والے دعا ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کی اس انقلابی جدوجہد کا یہ خلاصہ اور لب لباب ہے۔

(بحوالہ ''خطباتِ سیرت'')

Salman Saleem 03067163117

سکین بائے ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

سکین بائے ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

Salman Saleem 03067163117

# مدنی دور

ہجرتِ نبوی ﷺ سے وصالِ نبوی ﷺ تک

# حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے میں

سیرتِ مطہرہ میں راست اقدام بالفاظ دیگر نظام باطل کو چیلنج کرنے کا جو مرحلہ آیا ہے اس کا تعلق ہجرت کے متصلاً بعد کے زمانے سے ہے۔ یعنی جیسے ہی ہجرت ہوئی اور حضور ﷺ مکہ کو خیر باد فرما کر عازمِ مدینہ ہوئے اسی لمحے یہ مرحلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلہ کے لیے قرآن مجید میں متعلقہ آیات سورۃ الحج کی ہیں۔ آیت ۳۹ میں فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۙ۝ (الحج: ۳۹) یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے قتال کا اذنِ عام تھا۔ اب تک انہیں حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں لیکن اب ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے کہ اب انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے۔ یہ آیات اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئیں۔ سفر میں کم از کم بیس دن لگے ہیں اور ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو حضور ﷺ کا مدینہ منورہ میں ورودِ مسعود ہوا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی حضور ﷺ کی تاریخ وفات ہے۔

اب سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ملاحظہ ہو:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝ (الحج: ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن واقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے"۔

اس آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو تمکن فی الارض عطا کیا جانے والا تھا اور اس میں جو توسیع ہونے والی تھی اس کے پیش نظر یہ آیت گویا حزب اللہ اور اسلامی انقلاب کے منشور (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے آج کل کوئی سیاسی جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے تو اپنا ایک منشور

Salman Saleem 03067163117

شائع کرتی ہے کہ اگر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم کیا کریں گے اور ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں یہ Divine Manifesto نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا جا رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) آپ مدینہ تشریف لے جا رہے ہیں، جہاں آپ کا داخلہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوگا۔ تو آپ کے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے یہ منشور ہے جسے وہاں روبعمل لایا جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کا مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو ورودِ مسعود ہوا۔ چھ مہینے تک تو حضور ﷺ نے نہ کوئی جوابی کارروائی فرمائی نہ مکہ کی طرف کوئی اقدام کیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے بنا دیئے تھے کہ حضور ﷺ کو خود مدینہ آنے کی دعوت ملی تھی، لہٰذا یہاں آ کر آپ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دو بڑے قبیلے آباد تھے۔ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور رؤساء رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے اکثریت بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھی اور حضور ﷺ کے دست مبارک پر دو سال قبل بیعت کر چکی تھی۔ لہٰذا آپ نے استحکام کے لیے چھ ماہ صرف فرمائے۔ اس عرصہ میں کیے جانے والے تین اقدامات بہت اہم ہیں۔

### مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر

پہلا فوری اقدام اقامت صلوٰۃ سے متعلق تھا، اس لیے کہ منشور الٰہی کی پہلی شق یہی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے پہلا کام جو کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ اس کے لیے جگہ کا انتخاب کیا گیا، پھر اس کے حصول کے بعد تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ اس تعمیر کا یہ پہلو قابل غور ہے کہ حضور ﷺ اس میں بنفس نفیس شریک رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ایک مزدور اور کارکن کی حیثیت سے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنے آباء و اجداد کی سنت کی تجدید فرمائی۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھانے کا ذکر بایں الفاظ کیا گیا ہے: { وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط} (آیت: ۱۲۷) بیت اللہ کی دیواریں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اٹھائی تھیں تو مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر میں محمد رسول اللہ ﷺ کی توانائیاں اور آپ کی محنت کا پسینہ شامل تھا۔

Salman Saleem 03067163117

(۲)مواخات

دوسرا اقدام جو آپؐ نے فرمایا اس کا عنوان مواخات ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم اور ضم (Integrate) کرنا تا کہ وہ اس معاشرہ میں علیحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں بلکہ اس کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔ چنانچہ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرا دیئے گئے۔ مواخات کا یہ اقدام داخلی استحکام کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرتِ مطہرہ کے ابواب میں ایک نہایت اہم باب ہے اور معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے نتیجہ میں انصار نے مہاجرین کے لیے اپنے گھر اور دکانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابیؓ کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اس وقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا لہٰذا انہوں نے پیشکش کی کہ ان دونوں میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں' آپ اس سے نکاح کر لیں۔ اس لیے کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔

یہ مواخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اقدام ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بنفسِ نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا، لیکن اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کر دیا گیا ہوتا اور ان کے مابین مواخات قائم نہ کر دی گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کی فراست' تدبر' معاملہ فہمی اور حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

(۳)یہودی قبائل سے معاہدے

تیسرا اقدام جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں استحکام کے لیے فرمایا وہ یہودیوں کے

Salman Saleem 03067163117

ساتھ معاہدوں سے متعلق تھا' جن کے تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ بہت اہم' بااثر اور طاقتور تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبہ پر ان کا مضبوط تسلط تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں تھیں' جن میں کافی اسلحہ اور ساز و سامان تھا۔ اگرچہ یہود اصل مالکانِ دِہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے' مالکانِ دِہ تو اوس و خزرج تھے، لیکن سرمایہ' تنظیم اور تعلیم' یہ چیزیں یہود میں بہت زیادہ تھیں اور وہ بہت مؤثر عامل کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ حضور ﷺ کی دور اندیشی کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی فوراً یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ ان سے معاہدہ طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے' ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے اور اگر کبھی مدینے پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ان کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانبدار رہیں گے۔ وہ اس معاہدے میں ایسے بندھ گئے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ اگرچہ بعد میں اسلام کی اشاعت اور استحکام کو دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتے رہے اور مشرکین قریش سے ساز باز کر کے پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے، لیکن یہ سب کچھ چوری چوری ہو رہا تھا' وہ علی الاعلان مقابلہ میں نہیں آسکتے تھے۔ مختصراً یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنانے کے لیے جو اقدام فرمایا وہ ہر لحاظ سے دور اندیشی اور فراست و ذہانت کا ایک شاہکار تھا۔ اس اقدام نے اسلامی تاریخ میں نہایت اہم اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔

## فوجی مہمات کا آغاز

ربیع الاول سے لے کر رمضان ۱ھ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے کوئی مہم مدینہ منورہ سے باہر نہیں بھیجی۔ یہ چھ مہینے آپ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور ہجرت کی وجہ سے اسلامی انقلابی جماعت کے جو دو عناصر وجود میں آگئے تھے یعنی مہاجرین و انصار' ان کو باہم شیر و شکر کرنے اور بنیانِ مرصوص بنانے میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے...... وہ مرحلہ کیا ہے؟ اس کو صرف تاریخی اعتبار سے سمجھنے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کے منہج انقلاب کے نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے۔ حضور ﷺ نے آٹھ فوجی مہمات مکہ کی طرف روانہ فرمائیں جن میں سے چار میں حضور ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے، لہٰذا انہیں غزوات کہا جاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ وہ غزوات ہیں جو غزوۂ بدر

Salman Saleem 03067163117

سے پہلے کے ہیں۔ عام طور پر ہمارا تصور اور تاثر یہ ہے کہ پہلا غزوہ غزوۂ بدر ہے۔ پہلی باقاعدہ جنگ یقیناً غزوۂ بدر ہے۔ غَزَا یغزو عربی میں اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہتے ہیں اور اصطلاحاً غزوہ خاص ہو گیا اس مہم کے لیے جس میں نبی اکرم ﷺ بنفس نفیس نکلے ہوں۔ تو ابتدائی چھ ماہ کے بعد چار فوجی مہمات وہی ہیں جن میں حضور ﷺ خود مدینہ سے باہر نکلے، جبکہ چار سرایا ہیں۔ سریہ اس فوجی مہم کو کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی مہم بھیجی یا کوئی لشکر روانہ فرمایا اور کسی صحابی کو اس کا سربراہ یا سپہ سالار مقرر فرما دیا۔ آپ ﷺ خود اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کو ہمارے اکثر سیرت نگاروں اور مؤرخین نے بمشکل تمام دو یا تین صفحات میں سمیٹ لیا اور اس میں بھی نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا۔ حالانکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا وہ اہم اور نازک مرحلہ ہے جس میں اقدام اور پیش قدمی اب حضور ﷺ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یا بالفاظ دیگر صبر محض (Passive Resistance) اب ''راست اقدام'' (Active Resistance) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس راست اقدام کی نوعیت تھی کیا؟ اصل میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے خلاف جو اقدام کیا اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے حوالہ سے پہلا مکہ کا Economic Blockade یعنی معاشی ناکہ بندی ہے۔ اہل مکہ اور قریش کی معاشی زندگی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ مکہ کا اپنا حال بالفاظ قرآن ''بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ'' تھا۔ وہاں کسی نوع کی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو کھانے پینے کے لیے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اگتا تھا۔ البتہ ان کے ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے جن کا دودھ اور گوشت انہیں حاصل تھا۔ لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دار و مدار تجارت پر تھا، اور اُس دور کی مشرقی اور مغربی ملکوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (Link) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ غور کیجیے کہ آج کل نہر سویز کی کتنی اہمیت ہے۔ اگر یہ کچھ عرصہ کے لیے بند ہو جائے تو تجارت کا کیا حال ہو جائے گا؟ اگرچہ دوسرے راستے موجود ہیں جو بہت طویل ہیں، لیکن آپ اس زمانے کا تصور کیجیے جس زمانہ میں اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ جنوبی افریقہ سے ہندوستان اور مشرقی ایشیا کے بحری راستے تو

Salman Saleem 03067163117

پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت ہوئے ہیں، لہٰذا مشرق و مغرب کی تجارت حضور ﷺ کی بعثت کے دور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان' ملائیشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامانِ تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ اُدھر مغرب کے ممالک یعنی یونان' اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامانِ تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامانِ تجارت بحیرۂ روم سے ہوکر اِدھر پہنچتا تھا اور اُدھر بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے ہوکر مشرقی ممالک و جزائر کا سامانِ تجارت یمن پہنچ جاتا تھا۔ اب ان کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حمل (Transfer and Transport) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی' جس کا قرآن مجید میں سورۂ قریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾ ان کے قافلے سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اسفار میں مکمل امن حاصل رہتا تھا، جبکہ عرب کے دوسرے قبائل کو یہ امن میسر نہ تھا، بلکہ ان کے قافلے اکثر لوٹ لیے جاتے تھے، کیونکہ عرب کے اکثر قبائل کا پیشہ ہی لوٹ مار' رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا، جب کہ قریش کے قافلہ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قریش کعبہ کے متولی تھے جسے تمام عرب اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے، بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے ''خدا'' قریش کے پاس بطور ''یرغمالی'' رکھے ہوئے تھے۔ اگر ان کے قافلہ پر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے ''خدا'' کی گردن مروڑ سکتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا۔

سورۂ قریش میں آگے فرمایا گیا:

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

Salman Saleem 03067163117

یعنی بدبختو! تمہیں اللہ کے اس گھر کی وجہ سے رزق مل رہا ہے اور تم نے اس کی حرمت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔ تم پر تو لازم ہے کہ اس گھر کے مالک اللہ واحد کی عبادت کرو جس نے تم کو بھوک سے نجات دلا رکھی ہے اور خوف سے محفوظ کر رکھا ہے۔ تو اس منظر کو سامنے رکھئے کہ مغرب و مشرق کی تجارت میں قریش کو بلاشرکت غیرے اجارہ داری حاصل تھی۔ اس وجہ سے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ میں تمام قبیلوں کے بت رکھے ہوئے تھے، لہٰذا ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اب حضور ﷺ نے ان پر ہاتھ ڈالنا شروع فرمایا اور آپ نے اب ایک قوت ہونے کے اعتبار سے اپنی موجودگی ثابت فرمادی۔ حضور ﷺ کے اس اقدام کا ایک مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ حضور ﷺ نے درحقیقت قریش کی رگِ جان (Lifeline) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنایا۔ اس طرح ان کی معاش کے لیے ایک خطرہ پیدا فرمادیا۔ قریش کی معاشی ناکہ بندی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ بندی (Isolation or Political Containment) تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے میں جو دوسرے قبیلے آباد تھے ان کے قریش سے معاہدے تھے اور وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضور ﷺ نے اس علاقے میں متعدد سفر کیے جن میں اپنی قوت کا مظاہرہ بھی فرمایا اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی کیا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ بقول اقبال: ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد..... تو تبلیغ و دعوت کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو اب یوں سمجھئے کہ جیسے سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آ رہا ہے وہاں حضور ﷺ کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی:

وَقُل رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا۝ (الاسراء ۸۰)

''اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے وہاں میرا داخلہ سچائی اور راست بازی کے ساتھ ہو اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے سچائی اور راست بازی کے ساتھ نکال، اور اپنے خاص خزانۂ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما۔''

Salman Saleem 03067163117

یہ ہے وہ قوت اور طاقت جو حضور ﷺ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی۔ تو اب حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ نکلتے تھے۔ کسی قبیلہ میں جا کر آپ نے دس بیس دن قیام فرمایا' ان کے ساتھ معاہدے کیے' اول تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانبدار ضرور بنا لیا کہ اگر تمہارا قریش کے ساتھ معاہدہ ہے تو ہمارے ساتھ بھی کرو' ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو' بالکل غیر جانبدار ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضور ﷺ کے وہ اقدامات جن کو جدید اصطلاحات کے حوالے سے قریش کی معاشی اور سیاسی ناکہ بندی کہا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے لیے چار سفر تو حضور ﷺ نے بنفس نفیس فرمائے اور چار مہمات ایسی روانہ کیں کہ جن میں آپ شریک نہیں تھے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان مہموں میں آپ نے کسی انصاری صحابی ؓ کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ جملہ مہمات مہاجرینؓ پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصارؓ نے عرض کیا تھا کہ "آپ مدینہ تشریف لے آیئے۔ اگر قریش نے آپ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔" دوسری خاص بات یہ کہ کُل ایک سال کے اندر یہ ساری کارروائی عمل میں آ گئی۔ یعنی رمضان ۱ھ سے لے کر رمضان ۲ھ تک کے عرصہ میں حضور ﷺ نے آٹھ مہمات سرانجام دیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر کم وقت میں کس قدر شدومد اور زور و شور کے ساتھ یہ عمل ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ نے بکتر بند گاڑیوں پر کوئی مہم بھیج دی ہو، بلکہ یہ تمام مہمات اونٹوں کے ذریعے یا پاپیادہ طے کی گئیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ سیرت نگاروں نے غزوۂ بدر سے قبل کی ان مہموں کا بہت ہی سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور اس مقام سے ایسے گزر گئے ہیں کہ جیسے یہ سیرت کے غیر اہم واقعات تھے۔ ان کے نزدیک ہجرت کے بعد پہلا قابل ذکر واقعہ غزوۂ بدر ہے، حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر ہوا کیوں؟ غزوۂ بدر سے تو اصل میں حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد چھٹے اور آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن Passive Resistance (یعنی صبر محض) نے ہجرت کے بعد Active

Resistance (یعنی راست اقدام) کی صورت کیسے اختیار کی' جس کے نتیجہ میں مسلح تصادم کی نوبت آئی؟ یہ ہے وہ قریباً ڈیڑھ دو سال کی تاریخ جس پر غور و تدبر سے حضور ﷺ کا منہج انقلاب صحیح طور پر سمجھ میں آ سکے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ حضور ﷺ کو تلوار کیوں اٹھانا پڑی۔

درحقیقت پہلے چھ مہینوں میں جبکہ نبی اکرم ﷺ نے ابھی کوئی اقدام نہیں فرمایا تھا ایک واقعہ پیش آیا جو بہت اہم ہے۔ رئیس اوس حضرت سعدؓ بن معاذ مدینہ سے مکہ گئے۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کھلا اعلانِ جنگ نہیں ہوا تھا۔ مکہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا حلیف امیہ بن خلف تھا جو کبھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آقا ہوا کرتا تھا اور اس نے ان کو بہت ستایا تھا۔ حضرت سعدؓ نے اس کے یہاں قیام کیا اور پھر طواف کے لیے حرم گئے۔ وہاں ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس نے اُمیہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ اوس کے رئیس سعدؓ بن معاذ ہیں۔ ابوجہل ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا اور کہنے لگا: ''اگر تم امیہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آ کر بیت اللہ کا طواف کرو'' ...... اس کے نزدیک تو جناب محمد ﷺ اور آپ کے ساتھی، معاذ اللہ، بے دین تھے، کیونکہ انہوں نے قریش کا بت پرستی کا آبائی دین چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سعدؓ بن معاذ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا ''اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے۔'' یہ واقعہ سیرت النبی ﷺ میں موجود ہے۔ ان واقعات کی مدد سے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح انقلاب محمدی ﷺ کا منہاج مختلف مراحل سے گزرا ہے؟ حقائق اور واقعات کو اس طرح سمجھنا چاہئے جیسے وہ پیش آئے اور ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے۔

انقلاب نبوی ﷺ کے ضمن میں ایک حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سیرت مبارکہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح نظر آئے گی کہ حضور ﷺ کے منہج عمل میں انسانی جدوجہد (Human Efforts) محنت' کوشش'

Salman Saleem 03067163117

کشاکش، کشمکش، ایثاروقربانی، صبرومصابرت اور جہادواستقامت کے عناصر غالب نظر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا عمل زمین پر قدم بقدم چل کر مصائب و شدائد جھیل کر، قربانیاں دے کر انجام دیا گیا ہے۔ انقلابِ محمدی ﷺ کا یہ سارا راستہ اور فاصلہ انسانی سطح پر ان تمام مرحلوں سے گزر کر طے کیا گیا ہے جو ہر انقلابی عمل کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کے بے شمار حسی معجزات، کرامات اور خرقِ عادت واقعات ہیں، حضور ﷺ کے دست مبارک سے متعدد بار عظیم ترین برکات کا ظہور ہوا ہے...... لیکن اس انقلابی جدوجہد میں ان کا کتنا کچھ دخل ہے؟ اس اعتبار سے کبھی سوچیں اور اس نقطۂ نظر سے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اس میں غالب ترین عنصر انسانی سطح کی جدوجہد کا ہے جس میں مشکلات ہیں، مصائب ہیں، جوروستم ہے، تعدی وظلم ہے، شدائد ہیں۔ خود محبوبِ رب العالمین ﷺ کے لیے قید و بند اور معاشی مقاطعہ ہے، رحمۃ للعالمین ﷺ پر پتھروں کی بارش ہے، جس سے جسم اطہر سے اتنا خون بہا ہے کہ نعلین مبارک پیروں میں جم گئے ہیں۔ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر آپؐ طائف کی گلیوں میں کئی بار گرے ہیں اور ظالموں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیا ہے اور چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سب کچھ خود محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا ہے، لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسائے گئے...... ایسا کیوں ہوا؟ اس کی بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ حضور ﷺ نے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کا دین عرب پر غالب فرمایا، تو اگر نبی اکرم ﷺ کی یہ جدوجہد معجزوں کے ساتھ کامیاب اور غالب ہوئی ہوتی تو بعد والوں کے لیے بھی معجزے ہونے چاہئیں تھے، حالانکہ معجزہ صرف انبیاء و رسل کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔ امت کے لیے معجزات نہیں ہوتے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد وہاں بھی آئی تھی اور جب کبھی بھی حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کی جائے گی اللہ کی غیبی مدد تب بھی ضرور آئے گی۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور نصرت کا دروازہ بند نہیں ہوا، لیکن معجزہ صرف انبیاء و رسل کے لیے مختص ہوتا ہے۔ نبوت و رسالت کے اختتام کے ساتھ ہی معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہوا، اب

Salman Saleem 03067163117

جو بھی کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی' وہ زمین پر قدم بقدم چل کر خالص انسانی سطح پر کرنی ہوگی۔ لہٰذا جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت پر یہ حجت قائم فرما دی کہ آپ نے بالکل انسانی سطح پر' زمین پر قدم بقدم چل کر' مصائب و شدائد جھیل کر اور ہر طرح کے موانعات سے نبردآزما ہو کر جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا فرما دیا...... بہرحال سعدؓ بن معاذ کا مذکورہ بالا قول بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔

## عبداللہ بن اُبی کی بدبختی

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے باہمی مشاورت سے اسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لیے تاج بھی تیار ہو گیا تھا اور یہی بات اس شخص کی بدبختی کا اصل سبب بن گئی کہ وہ منافقین کا سردار بن گیا، کیونکہ اس کی بادشاہت کا آئینہ نبی اکرم ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری کے باعث چکنا چور ہو گیا۔ اب ان بے تاج بادشاہ ﷺ کے ورودِ مسعود کے بعد کسی کے باتاج بادشاہ بننے کی گنجائش کہاں رہی! وہ ایمان تو لے آیا، کیونکہ دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے، لیکن پہلے ہی دن سے اس کے دل میں نفاق کا بیج جو پڑا تو وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس قریش کے خطوط آ رہے تھے کہ تم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھ مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکالو' تم کھڑے ہو جاؤ' تمہیں اقدام کرنا چاہئے' ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم لشکر لے کر آنے کے لیے تیار ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس کی ریشہ دوانیاں ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ آپ ﷺ بنفس نفیس چل کر عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضور ﷺ اس کو طلب فرماتے اور خود انتظار فرماتے...... لیکن نہیں' معاملہ دین کا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی ہیٹی نہیں ہو جاتی۔ بقول غالب ؎ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا...... یہاں دربدر جانا پڑتا ہے...... حضور ﷺ نے خالص دنیوی انداز اور دلیل سے اسے سمجھایا اور فرمایا: دیکھو اگر تم نے کوئی اقدام کیا تو کیا اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرو گے؟ حضور ﷺ اسے سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا سارا قبیلہ ایمان لا چکا ہے۔ اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا! تمہیں اپنے بھائی بندوں

Salman Saleem 03067163117

کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی۔ ....اسی وجہ سے اسے کوئی عملی اقدام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا، جیسے یہودی کرتے رہے، لیکن اسے کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

## غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

اب غزوۂ بدر سے قبل کی آٹھ مہمات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ رمضان المبارک ۱ھ میں سب سے پہلا سریہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ یہ سریہ تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر ساحل سمندر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جا رہا تھا۔ وہاں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ لیکن مجدی بن عمر جہنی ایک شخص تھا جس کا حضور ﷺ سے معاہدہ ہو چکا تھا، وہ بیچ میں پڑ گیا اور اس نے کوئی مسلح تصادم نہیں ہونے دیا۔ لہٰذا کوئی جنگ یا خونریزی نہیں ہوئی۔ ورنہ تیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا تین سو مشرکین مکہ سے مقابلہ ہوتا۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ یہ پہلی مہم تھی جو حضور ﷺ نے رمضان ۱ھ میں بھیجی تھی۔ یہ بات تاریخ کے حوالہ سے سامنے رکھیے۔ اس سریہ کے بارے میں تاریخ میں آیا ہے کہ پہلا جھنڈا جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بلند فرمایا وہ اس سریہ کے لیے تھا جو حضور ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا۔

دوسری مہم ایک ماہ بعد ہی شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مہاجرین کے ساتھ بھیجی گئی۔ اس کا بھی ابوسفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر آمنا سامنا ہو گیا اور ٹکراؤ کی نوبت آ گئی۔ رابغ بھی ساحل بحر پر ہے۔ (حج اور عمرہ کرنے والے حضرات اس مقام سے بخوبی واقف ہیں، کیونکہ یہ مدینہ کے راستہ میں آتا ہے) بہرکیف اس موقع پر بھی جنگ نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ابھی تک کسی فریق کی طرف سے بھی باقاعدہ اعلانِ جنگ نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ اپنی موجودگی ثابت کر دیں کہ اب یہ تجارتی راستہ تمہارے لیے پہلے کی طرح محفوظ و مامون نہیں ہے کہ بے کھٹکے گزرتے رہو، بلکہ یہ اب ہماری زد میں ہے۔ اس موقع پر پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا، اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں بھی بیچ بچاؤ ہو گیا اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

Salman Saleem 03067163117

رسول اللہ ﷺ نے تیسرا سریہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی ذوالقعدہ میں بھیجا جو بیس مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھا۔ اس طرح حضور ﷺ مسلسل ہر ماہ ایک ایک مہم روانہ فرما رہے تھے۔ اس سریہ کے لیے حضور ﷺ نے ضرار کا مقام متعین فرمایا تھا۔ تاریخ میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرما دیا تھا کہ وہاں تک جاؤ' اس سے تجاوز نہ کرنا۔ ان مہموں کا مقصد دراصل قریش کے تجارتی راستوں پر اپنی موجودگی کا اعلان کرنا اور قریش کو ان راستوں کے مخدوش ہونے کی تشویش میں مبتلا کرنا تھا۔ حضور ﷺ کے یہ اقدامات قریش مکہ کی معیشت کے اعتبار سے نہایت نازک اور پریشان کن (Critical and Cruical) تھے، کیونکہ ان کے شام کے لیے تجارتی قافلے انہی راستوں سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اس سلسلے کا پہلا سفر ۲ھ میں ہوا۔ بنو زمرہ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا، وہاں حضور ﷺ نے قیام فرمایا۔ اس سفر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنی موجودگی کا اظہار ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا اس قبیلہ کے ساتھ حلیف ہونے کا معاہدہ طے پا گیا۔ دوسرا سفر ربیع الاول یا ربیع الآخر میں ہوا (اس میں کچھ اختلاف ہے) اس میں غزوۂ بواط واقع ہوا' جس میں حضور ﷺ خود شریک تھے۔ سیرت کی کتابوں میں مقام کا نام اور مہینہ تو موجود ہے لیکن اس کی تفاصیل نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کے ایک نہایت اہم سفر کا ذکر کتب سیرت میں غزوۂ ذی العشیر ہ کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ سفر قریباً دو ماہ پر محیط تھا۔ یعنی جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ۲ھ...... اور حضور ﷺ نے یہ سفر اس قافلے کو روکنے کے لیے اختیار فرمایا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو جا رہا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے کہ جب واپس آ رہا تھا تو حضور ﷺ نے اس کو روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہو گیا...... اس قافلہ کا بھی ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکہ سے مہاجرین رضی اللہ عنہم نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، لیکن اکثر و بیشتر مہاجرین اپنے اہل و

Salman Saleem 03067163117

عیال کو ساتھ نہیں لا سکے تھے اور وہ مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ اسی طرح ان کا ساز و سامان اور اثاثہ و سرمایہ بھی مکہ ہی میں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مشرکین مکہ نے دارالندوہ میں یہ طے کیا تھا کہ مہاجرین کی تمام چیزیں ضبط کر لی جائیں اور ان کی فروخت سے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کیا جائے' جس سے ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تشکیل دیا جائے اور اس تجارت سے جو منافع ہوگا اس کو ہم مسلمانوں پر لشکر کشی کے لیے استعمال کریں گے۔ تو گویا یہ محض ایک تجارتی قافلہ نہیں تھا، بلکہ آئندہ جو مسلح تصادم ہونے والا تھا اس کے لیے مالی ذرائع فراہم کرنا بھی اول روز سے اس قافلہ کی ترتیب و تشکیل میں پیش نظر تھا۔ یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حمزہؓ نے حضور ﷺ سے درخواست بھی کی تھی کہ اب ہمیں جنگ کرنی چاہئے۔ اس لیے کہ ہم جو ساز و سامان اور اثاثہ مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے وہ سارے کا سارا قریش نے ضبط کر لیا ہے اور اس کے منافع سے جنگی تیاری ان کے پیش نظر ہے۔

بہر حال نبی اکرم ﷺ اس قافلے کے تعاقب کے لیے نکلے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ڈیڑھ سو مہاجرین اور تیس اونٹ تھے۔ مجاہدین قافلہ کے تعاقب میں ینبوع تک پہنچ گئے، لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا تھا اور قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف نکل چکا تھا' لہٰذا اس کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ البتہ نبی اکرم ﷺ نے وہاں قیام فرمایا اور وہاں آباد قبیلہ بنی مصطلق کے ساتھ مصالحت کی۔ طے یہ ہوا کہ قبیلہ بنی مصطلق کے لوگ غیر جانبدار رہیں گے' نہ تو قریش مکہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کی۔ یہ غزوہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق غزوۂ بدر سے جڑ جاتا ہے۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ایک غزوہ اور ہے جسے غزوۂ بدر اولیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص عرض بن شعری نے اپنی ذاتی حیثیت سے مسلمانوں پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور مدینہ کے قرب و جوار میں لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے تعاقب کیا اور آپ بدر تک پہنچے، لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ حضور ﷺ اس سے آگے تشریف نہیں لے گئے اور مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضور ﷺ کا ایک سفر ہے' طاقت اور نفری کے ساتھ' لہٰذا یہ بھی ان غزوات کی فہرست میں شامل ہے۔

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

## مسلح تصادم کا آغاز: واقعۂ نخلہ

اس سلسلے کا اہم ترین واقعہ نخلہ کا ہے' جس نے اصل میں مکہ میں آگ لگائی۔ یہ واقعہ سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نام سے سیرت کی کتب میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک بند خط دیا اور فرمایا کہ مکہ کی طرف جاؤ اور جب مدینہ سے دو دن کی مسافت طے کر لو تب یہ خط کھولنا' پھر اس میں دیکھنا کہ کیا لکھا ہے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا...... اب آپ اندازہ کیجئے کہ رازداری (Secrecy) کس درجہ کی ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس درجہ مخفی رکھا ہے کہ خود کمانڈر کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مہم کیا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے! بعض روایات میں بارہ صحابہ اور بعض میں آٹھ کی تعداد کا ذکر آتا ہے جو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ مدینہ سے دو دن کی مسافت کے بعد انہوں نے خط کھولا تو اس میں ہدایت تھی کہ وادی نخلہ (1) پہنچو۔ یہ وادی نخلہ کہاں ہے؟ اب ذرا جغرافیہ کو ذہن میں لایئے۔ مکہ جنوب میں ہے' مدینہ شمال میں اور طائف مکہ سے جنوب مشرق میں ہے۔ مدینہ سے وہاں کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ یہاں مہم بھیجنا بغیر کسی اہم منصوبہ کے اور بغیر کسی سوچے سمجھے اقدام کے ممکن نہیں تھا' یہ تمام کارروائی بلاسبب نہیں تھی۔ تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھو اور ہمیں اس کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو۔ یمن کی طرف جانے والے قریش کے قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یمن کا راستہ طائف سے ہو کر گزرتا ہے اور وادی نخلہ طائف اور مکہ کے درمیان واقع ہے۔ جو قافلے شام کو جاتے تھے ان کے راستوں کے متعلق سات مہمات آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں' جو ان راستوں میں اپنی موجودگی ثابت کرنے اور ان کو مخدوش بنانے کے لیے بھیجی گئی تھیں' لیکن یہ مہم اس راستہ کے لیے تھی جو طائف سے ہو کر یمن جاتا تھا۔

---

(1) وادی نخلہ وہ وادی ہے جہاں ۱۰ نبوی میں سفر طائف سے واپس آتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس وقت جنوں کا ایک گروہ وہاں سے گزرا اور قرآن سن کر ایمان لے آیا۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے جب خط پڑھا تو چونکہ مہم بڑی سخت اور کڑی آ پڑی تھی، لہٰذا آپؓ نے اپنے ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ میں تو جاؤں گا، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، لیکن تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے دے، میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن ان سب نے کہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ ان سب نے جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک مختصر سا قافلہ آ گیا جس میں قریش کے کل پانچ افراد شامل تھے، اگرچہ وہ سبھی بڑے اونچے گھرانوں کے لوگ تھے۔ متعدد اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامانِ تجارت ان کے ساتھ تھا جو وہ طائف سے مکہ لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ جب وہاں سے گزرا تو مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خط میں صراحت نہیں تھی کہ حملہ کیا جائے، لیکن ان کی رائے یہ بنی کہ ہمیں حملہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ مقابلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو بن عبداللہ الحضرمی بیان کیا گیا ہے وہاں قتل ہو گیا۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیہ بن حرب (ابوسفیان کے والد) کا حلیف تھا اور وہاں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس تجارتی قافلے میں مغیرہ کے دو پوتے اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ مغیرہ کے خاندان کا شمار قریش کے چوٹی کے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ بہرکیف مقابلہ کے نتیجہ میں عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے اور بقایا دو کو انہوں نے قیدی بنا لیا۔ ان دو قیدیوں اور جو بھی مالِ غنیمت ہاتھ لگا اس کو لے کر یہ حضرات مدینہ واپس آ گئے۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ آپ نے مالِ غنیمت میں سے خمس بھی قبول فرما لیا۔ جو دو قیدی تھے ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرما دیا۔ ان میں سے ایک قیدی حکم بن کیسانؓ وہیں مسلمان ہو گئے۔ مغیرہ کے پوتوں میں سے ایک بھاگ گیا تھا۔ دوسرا جو قید ہوا تھا فدیہ دے کر چلا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں رضی اللہ عنہم کو نہ کوئی سرزنش فرمائی اور نہ ہی کوئی وضاحت طلب

Salman Saleem 03067163117

فرمائی کہ تم نے میرے حکم سے تجاوز کیوں کیا؟ (یہ ایک روایت ہے جسے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے)...... دوسری روایت جو بہت سی کتابوں میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا' مالِ غنیمت قبول نہیں فرمایا، بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حملہ کی اجازت نہیں دی تھی' میری ہدایت صرف یہ تھی کہ وہاں قیام کرو' قریش کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھو اور اس کی ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ یہ اقدام تم نے خود کیا ہے۔

اس میں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا تھا، وہ یہ کہ وہ رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب کا مہینہ اشہر حرم میں شامل ہے، یعنی ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں مشرک و کافر بھی جنگ نہیں کرتے تھے...... عبداللہ بن محمد بن عبدالوہابؒ نے لکھا ہے کہ مہم کے ارکان نے مشورہ کیا کہ ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں۔ اگر ہم قافلہ کو چھوڑ دیتے ہیں تو رجب کی حرمت تو بچ جائے گی لیکن پھر یہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور وہاں ان پر حملہ ممکن نہ ہوگا۔ ہم دو حرمتوں کے مابین آ گئے ہیں۔ رجب کی آخری تاریخ تھی۔ رات شروع ہوئی تو رجب بھی ختم ہوا اور اشہر حرم بھی ختم ہوئے...... بہرحال مشورے سے یہ طے ہوا کہ جنگ کی جائے اور جنگ کا نتیجہ وہ نکلا جو اوپر بیان ہوا۔

اس پوری صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد امکانی نتیجہ یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا تب بھی یہ بات مسلّم ہے کہ انہیں کوئی سزا نہیں دی۔ کیونکہ صورتِ حال (Situation) ایسی بن گئی تھی کہ اس میں اگر صحابہ کرامؓ اپنے ہاتھ بندھے رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ سب شہید ہو جاتے۔ اس لیے کہ مڈبھیڑ ہوئی' آمنا سامنا ہوا، جس کے نتیجہ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ واللہ اعلم۔

اب یہ جان لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا! مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں گویا آگ لگ گئی۔ اس لیے کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلا علم محمد ﷺ نے بلند فرمایا...... پہلا تیر محمد ﷺ کے جاں نثار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے چلا...... اور اب پہلا قتل بھی اصحابِ محمد (ﷺ ورضی اللہ عنہم) کے ہاتھوں سے ہو گیا۔ حضور ﷺ نے حکم دیا

Salman Saleem 03067163117

تھا یا نہیں' بہر حال بالفعل یہ کام حضور ﷺ کے آدمیوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی ذمہ داری تو یقیناً آئے گی۔ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا ہے کہ جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری جماعت کے قائد پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ حضور ﷺ اس سے بالکلیہ برات کا اظہار فرماتے یا اقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصان کی تلافی فرماتے۔ لیکن ایسی کوئی شکل حضور ﷺ نے اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اس اقدام کو قبول (Own) فرما لیا...... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ میں چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل' خون کا بدلہ خون!...... مکہ میں جو آگ لگی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔

ایک طرف مکہ میں ہیجان خیز صورتِ حال تھی' دوسری طرف ابوسفیان کے قافلہ کی واپسی کا وقت آ گیا۔ وہی قافلہ جسے غزوۂ ذی العشیرہ کے موقع پر حضور ﷺ نے روکنے (Intercept کرنے) کی کوشش فرمائی تھی مال و اسباب سے لدا پھندا واپس آ رہا تھا۔ تو ابوسفیان کی طرف سے مکہ میں یہ ہنگامی پیغام (S.O.S.Call) پہنچ گیا کہ مجھے محمد (ﷺ) کے ساتھیوں سے خطرہ ہے کہ وہ ہمارے قافلہ کو لوٹ لیں گے، لہٰذا مجھے فوراً کمک پہنچائی جائے اور قافلہ کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے...... یہ دونوں باتیں تھیں کہ جن کی بنا پر مکہ میں وہ لوگ جو جنگجو' جوشیلے اور مشتعل مزاج (Hawks) تھے، وہ قابو سے باہر ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آ گئی تھی۔ اس طرح کے نمایاں اشخاص ابوجہل اور ابوسفیان تھے...... اس کے ساتھ ساتھ مکہ میں ٹھنڈے مزاج' بردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ (یعنی Doves) بھی موجود تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام کی تھیں۔ آخر الذکر تو بعد میں ایمان لے آئے۔ جلیل القدر صحابی ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ان کی پھوپھی تھیں' اور اس رشتہ سے حضور ﷺ ان کے پھوپھا ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس نے ہجرت کے بعد قریش سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (ﷺ)

Salman Saleem 03067163117

کے خلاف کوئی اقدام مت کرو۔اب انہیں عرب کے حوالے کر دو۔اب ان کا عرب سے ٹکراؤ ہوگا' ہم تو بس تماشا دیکھیں گے۔اگر محمد (ﷺ) جیت جاتے ہیں اور پورے عرب پر ان کا قبضہ و تسلط ہو جاتا ہے تو ہماری ہی جیت ہے۔آخر وہ قریشی ہیں' ہمارے ہی آدمی ہیں...... وہ بڑا دوراندیش' سیاستدان اور مدبر آدمی تھا۔اس نے مزید کہا کہ "اگر عرب محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے نہیں پڑیں گے۔" اس قدر دوراندیشی کا مشورہ تھا جو عتبہ نے دیا تھا۔تو عتبہ اور حکیم بن حزام آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔دوسری جانب ابوجہل Hawks کا سرخیل تھا۔وہ چاہتا تھا کہ فوری اقدام کیا جائے......اب جب یہ صورت حال پیش آ گئی تو یوں سمجھئے کہ ان کے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں کو تقویت حاصل ہو گئی کہ ایک تو ہمارا آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی وادئ نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔لہٰذا خون کا بدلہ خون ہوگا اور دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلہ کو شدید خطرہ درپیش ہے، لہٰذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر مکہ سے مدینہ روانہ ہوا جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر ہوا۔یہ غزوہ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا نقطۂ آغاز ہے۔

(بحوالہ "منہج انقلاب نبوی ﷺ")

Salman Saleem 03067163117

# غزوۂ بدر

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے جا کر حضور ﷺ نے چھ ماہ داخلی استحکام میں لگائے اور اس کے بعد رمضان ۱ھ میں مہمات بھیجنے کا اقدام فرمایا۔ غزوۂ بدر رمضان ۲ھ میں ہوا ہے۔ اس سے قبل ڈیڑھ سال کے اندر حضور ﷺ نے آٹھ مہمات بھیجی تھیں، جن میں ایک غزوۂ ذوالعشیرہ بہت اہم ہے اور دوسرا وادیٔ نخلہ کا فیصلہ کن واقعہ۔ یہ دونوں واقعات غزوۂ بدر کا اصل سبب بنے ہیں۔ غزوۂ بدر سے حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا اندرونِ عرب آخری اور چھٹا مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوا ہے۔

مذکورہ بالا دو واقعات کی وجہ سے مکہ میں Hawks کی بن آئی اور ایک ہزار جنگجوؤں کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑا ہوا۔ ابوسفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری عتبہ بن ربیعہ کے پاس تھی لہٰذا اس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ ابوجہل، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، عتبہ بن ابی معیط، شیبہ بن عتبہ اور بہت سے وہ لوگ جو اہل ایمان کے خون کے پیاسے تھے، سب کے سب نکلے۔ اس لشکر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ سردارانِ قریش میں سے سوائے ابولہب کے اور کوئی پیچھے نہیں رہا۔ ابولہب بزدل انسان تھا۔ اس نے اپنی جگہ ایک Mercenary یعنی کرائے کا فوجی بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ لڑے گا۔ اس شخص میں انسانیت کا کوئی جوہر نہیں تھا، وہ بخیل اور بزدل شخص تھا۔ اس کی اپنے معاشرہ میں کوئی عزت نہیں تھی۔ لوگ اسے غزالِ زریں کا چور سمجھتے تھے۔ چونکہ یہ کعبہ کے بیت المال کا متولی تھا اور وہاں سے چڑھاوے کے طور پر آیا ہوا سونے کا ہرن چوری ہو گیا تھا تو یہ اس غزالِ زریں کا چور مشہور ہو گیا تھا۔ پس ابولہب کے سوا قریش کا کوئی

Salman Saleem 03067163117

گھرانہ نہیں بچا کہ جس کے تمام سر برآوردہ لوگ اس لشکر میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ البتہ ابوسفیان رہ گئے تھے جو قافلہ کے ساتھ تھے۔ ان کو بھی ابوجہل نے پیغام بھیج دیا کہ اپنی نفری اور ساز و سامان کے ساتھ ہم سے آ کر مل جاؤ۔ لیکن ابوسفیان دھیمے مزاج کے حقیقت پسند انسان تھے، محض جذباتی انسان نہیں تھے۔ انہوں نے دو احتیاطیں کیں۔ ایک طرف مدد کے لیے مکہ پیغام بھیج دیا اور دوسری طرف جب ان کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کچھ لوگوں کے ساتھ قافلہ کا قصد فرما رہے ہیں تو انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ چنانچہ وہ بدر کی طرف آئے ہی نہیں بلکہ بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر نکل گئے۔ انہیں ابوجہل کا پیغام مل بھی گیا تھا کہ لشکر کے ساتھ آ کر شامل ہو جاؤ، لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں براہِ راست مکہ جا رہا ہوں۔

## غزوۂ بدر سے قبل مشاورت

صحیح و معتبر ترین روایات کے مطابق مدینہ میں حضور ﷺ نے کسی جنگ کا اعلان کیا نہ تیاری فرمائی۔ بلکہ پیش نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اسے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے نکل کھڑے ہوئے۔ یاد رہے کہ غزوۂ ذوالعشیر ہ میں شامل ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین ہی تھے جبکہ غزوۂ بدر میں صرف ساٹھ یا تراسی (۸۳) مہاجرین ساتھ تھے۔ تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے پیش نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپؐ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد زیادہ ہوتی۔ پھر یہ پہلی بار ہوا کہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ساتھ نکلے، بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلس مشاورت منعقد فرمائی، لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً نہیں فرمایا کہ ساتھ چلو۔ انصار رضی اللہ عنہم بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ کی طرف سے کوئی خصوصی ترغیب نہیں تھی۔

آپ ﷺ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ مکہ سے ایک ہزار

Salman Saleem 03067163117

افراد پر مشتمل کیل کانٹے سے لیس لشکر سوئے مدینہ نکل پڑا ہے اور منزل بہ منزل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب یہ دوطرفہ معاملہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوئی جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے، لہٰذا سورۃ الانفال کی آیات کے بین السطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور ﷺ نے از راہ مشورہ ہی یہ بات پیش کی ہو گی کہ ''مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں' مالِ تجارت بہت ہے اور ایک لشکر جنوب سے آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کر لیا ہے' بتاؤ کدھر چلیں؟'' ان حالات میں کچھ لوگوں نے اپنی مخلصانہ سوچ کے مطابق تجویز کیا کہ حضور قافلہ کی طرف چلیے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے' وہ آسانی سے قابو میں آ جائیں گے' سازوسامانِ تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی' جو آئندہ جنگ میں کام آئے گا۔ لیکن حضور ﷺ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشائے مبارک کچھ اور ہے، حضور ﷺ کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر مہاجرینؓ نے تقریریں شروع کیں کہ حضور! آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپ کا ارادہ ہو' بسم اللہ کیجیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی' لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی تقریر کی، لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے حضور ﷺ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بھی مہاجرینؓ میں سے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے کہ ''حضور! جو آپ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے۔ ہمیں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے' جنہوں نے اپنے نبی (موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کہہ دیا تھا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ: ۲۴) ''پس آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' آپ بسم اللہ کیجیے، ہم آپ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی

Salman Saleem 03067163117

ٹھنڈک عطا فرما دے۔'' لیکن حضور ﷺ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعد رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا قول یہی ہے۔ ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ میرا رجحانِ غالب یہی ہے کہ یہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ انصار کے دو قبیلے تھے' خزرج اور اوس..... خزرج کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا تھا اور اس کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ خزرج ہی کی ایک شاخ کا سردار عبداللہ بن ابی تھا جو منافق اعظم تھا اور پورے قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ سردار کی طرف سے کسی رائے کا اظہار گویا پورے قبیلہ کی طرف سے اظہارِ رائے کے مترادف تھا۔ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ بہر حال ان دونوں میں سے کسی نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ ''حضور! معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے.....'' اس خیال کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ حضور نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی جو دعوت قبول کی تھی تو اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ''اگر قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں''۔ گویا انصار اس معاہدہ کی رو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرار سے جا ٹکرانا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں کہا: ''اِنَّا اٰمَنَّا بِکَ وَصَدَّقْنَاکَ'' یعنی حضور ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی ہے' ہم نے آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ (اُس وقت معاہدے میں کیا طے ہوا تھا' کیا نہیں ہوا تھا' اس وقت وہ بات غیر متعلق ہے) آپ ﷺ جو بھی حکم دیں گے سر آنکھوں پر سِرْ بِنَا یَارَسُوْلَ اللہِ... ''اے اللہ کے رسول (ﷺ) لے چلیے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں

Salman Saleem 03067163117

گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو یمن کے آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لیے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے"۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل اٹھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جماعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرے وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ جس نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانا ہے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت لازم ہے۔ جیسے فرمایا گیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

(النساء:٦٥)

"سو آپؐ کے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں آپؐ کو منصف نہ مان لیں، پھر آپؐ کے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں۔"

ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہ مانیں؟ لہٰذا اس وقت حضرت سعد بن عبادہ یا حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہما) نے بڑی پیاری، بڑی بنیادی اور اصولی بات کہی تھی کہ "انا امنابك وصدقناك"۔ اس بات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور کھل اٹھا۔ گویا آپؐ انصار کی رائے معلوم کرنے کے منتظر تھے۔

اس مشاورت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ قریش کا لشکر وادی کے دوسرے سرے تک پہنچ چکا ہے تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لیے فرمایا۔ وہاں کا ایک واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، لیکن اگر یہ آپ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ جنگی مہارت اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقام کے

Salman Saleem 03067163117

بجائے دوسرے مقام پر کیمپ ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ نے ان حضرات کی رائے کو قبول فرمایا۔ جہاں تک خالص دنیوی امور کی تدابیر اور تجرباتی علوم کا تعلق ہے، جس طرح تابیر النخل کا معاملہ تھا، تو ان میں آپؐ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امت کے لیے یہ ہدایت و تعلیم دے دی ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیا کم" یعنی اپنے دنیوی معاملات میں تم بہتر جانتے ہو۔ پھر نبی اکرم ﷺ کا مزاج ہی ایسا تھا کہ آپ دنیوی تدابیر کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر فرمایا تھا۔

## حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ کی آخری کوشش

جنگ سے ایک رات قبل خبر پہنچ گئی کہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ اب مکہ میں چہ میگوئی شروع ہوئی کہ اب جنگ کا کیا فائدہ ہے؟ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کے لیے آئے تھے۔ اس صورتِ حال سے مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) کے مقابلہ میں صلح جو لوگوں (Doves) کے ہاتھ میں پھر ایک دلیل آ گئی کہ ہمارا مقصد تو قافلہ کی حفاظت تھا' قافلہ بچ کر نکل گیا' پھر جنگ کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنوزہرہ اور بنو عدی یہ کہہ کر لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حکیم بن حزام عتبہ کے پاس گئے جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا: عتبہ! تم اس وقت نیکی کا ایک ایسا کام کر سکتے ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ کے استفسار پر انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے، اب اس ہونے والی خونریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ اس طرح جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عتبہ بن ربیعہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن وہ جو Hawks کا سرغنہ ابوجہل موجود تھا' فی الاصل تو اس کو

Salman Saleem 03067163117

سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا ہے' عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ اب ابوجہل کی چالاکی دیکھئے۔ اُس نے ایک تو عتبہ کو بزدلی کا طعنہ دیا اور کہا کہ تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو (یاد رہے کہ عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جو سابقون الاولون میں سے تھے' جبکہ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا) ابوجہل نے مزید نمک پاشی کرتے ہوئے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ محبت پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا مدمقابل ہے' اسی لیے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ اس کا عتبہ نے وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر ایک باغیرت و باحمیت انسان کو دینا چاہئے۔ اس نے کہا کل کا دن بتا دے گا کہ بزدل کون ہے! وہ اس طعنہ کو برداشت نہیں کر سکا۔

ابوجہل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں، لیکن یہ صلح پسند لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ اس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے' بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچا دیا: وَاعَمرواہ وَاعَمرواہ۔ اسے قبائلی زندگی میں Blood Cry (خونی چیخ) کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں آگ سی لگ گئی۔ الغرض مشرکین کے کیمپ میں آخری رات تک یہ کشمکش جاری رہی۔ لیکن بالآخر فیصلہ ہو گیا کہ بہرصورت کل جنگ ہوگی۔ چنانچہ دوسرے دن جنگ ہوئی۔

## مشرکین کی دعائیں

مشرکین مکہ میں سے دو اشخاص کی غزوۂ بدر شروع ہونے سے متصلاً قبل رات کی دعائیں کتب تاریخ میں نقل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی شب کو دعا کی۔ مشرکین میں سے ایک ابوجہل اور دوسرے نضر بن حارث کی دعا تاریخ میں منقول ہوئی ہے۔ وہ دونوں مشرک تھے، اللہ کے منکر نہیں تھے۔ قرآن میں بار بار آتا ہے کہ جب تم پر کوئی مشکل

Salman Saleem 03067163117

وقت آ پڑتا ہے تو تم اپنی دیویوں اور من گھڑت معبودوں کو بھول جاتے ہو اور صرف اللہ کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل آپ کو قرآن میں متعدد بار مل جائے گی۔ چنانچہ ابوجہل کی غزوۂ بدر کی رات کی دعا منقول ہے: "اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ وَاٰتَانَا بِمَا لَانَعْرِفُ فَاَحِنْہُ الْغَدَاۃَ" یعنی "اے اللہ (محمدؐ) ہم میں سب سے زیادہ رحمی رشتے کاٹنے والا ہے اور ایسی چیز لے آیا ہے جس سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ پس کل تو اسے ہلاک کر دیجیو!" یہ اُس شخص کی پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی، نسل پرستی، قبائل پرستی پڑی ہوئی تھی۔ جناب محمد ﷺ کے خلاف قریش کا سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انہوں نے آ کر اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت ہمیں تقسیم کر دیا، ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا۔ بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا، ہماری جو قوت تھی وہ اس طور پر پراگندہ ہو گئی، ہمارے رحمی رشتے محمد (ﷺ) نے منقطع کر دیئے۔

اور نضر بن حارث کی جو دعا منقول ہوئی ہے اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کی شخصیتیں اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں اور جن کی سوچ اس قدر غلط ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھیوں سے بہتر جماعت ہیں۔ اس کی دعا منقول ہوئی ہے کہ "اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَیْرَ الْحِزْبَیْنِ" یعنی یہ جو دو حزب بالمقابل آ گئے ہیں، اے اللہ! ان میں سے بہتر جماعت کی مدد فرمائیو! غور کیجئے، اس مشکل گھڑی میں دونوں اَللّٰھُمَّ کہہ رہے ہیں۔

## غزوۂ بدر کے موقع پر آنحضور ﷺ کی دعا

دوسری طرف اسی رات کو حزب اللہ کے لشکر میں گھاس پھونس کی اس جھونپڑی میں جو آپؐ کے لیے بنائی گئی تھی، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے طویل ترین سجدہ کیا، جس میں طویل ترین دعا کی۔ اس دعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! کل اگر یہ لوگ یہاں شہید ہو گئے تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ حضور ﷺ

Salman Saleem 03067163117

نے ایسا کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں اور آپؐ کے بعد تا قیامِ قیامت کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے بارگاہ رب العزت میں مزید عرض کیا: بارِ الٰہا! میں نے اپنی پندرہ برس کی کمائی میدان میں لا کر ڈال دی ہے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تلوار لیے پہرے پر کھڑے تھے جس وقت حضور سربسجود تھے۔ (۱)

جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ الفاظ سنے تو انہوں نے عرض کیا: "حسبك حسبك یارسول الله" اے اللہ کے رسول! بس کیجئے، بس کیجئے، یقیناً اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ اس پر حضور ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: {سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ○} (القمر: ۴۵) گویا اللہ کی طرف سے خوشخبری تھی کہ "اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے۔"

بہرحال اس غزوۂ بدر سے انقلابِ نبویؐ کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ Active Resistance کے مرحلہ میں اقدام حضور ﷺ کی جانب سے ہوا، لیکن پہلی باقاعدہ جنگ جو ہوئی ہے وہ غزوۂ بدر ہے۔ اس معاملہ میں اس بحث میں پڑنے کی بجائے کہ جنگ کس نے شروع کی، کس نے نہیں کی، آیا اسلام میں صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے یا جارحانہ جنگ یعنی خود حملہ میں پہل کرنا بھی درست ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ جناب محمد ﷺ باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے یا باطل کو acknowledge اور تسلیم کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے؟ حق کبھی باطل کو تسلیم اور برداشت کر سکتا ہے؟ اس کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے کہ حق کے نام لیوا بے حمیت اور بے غیرت ہو گئے ہوں، ان کو زندگی

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آنجنابؓ کے فرزندگان میں سے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سب سے زیادہ شجاع، دلیر اور بہادر کون تھا؟...... سوالی کا خیال تھا کہ آنجنابؓ اپنا نام لیں گے... لیکن حضرت علیؓ نے جواب دیا: وہ شخص کہ جس کو نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر سے پہلے والی شب کو اپنی جھونپڑی پر پہرے کے لیے معین فرمایا تھا، یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

زیادہ عزیز ہوگئی ہو تو وہ حق کو مغلوب دیکھ سکتے ہیں، ورنہ غیور' باحمیت' حق کے ماننے والے اور حق کے علمبردار' باطل کا وجود کبھی گوارا نہیں کر سکتے! حق کے پاس اگر طاقت ہو تو وہ یقیناً جارح ہوگا۔ صرف ایک فرق ذہن میں رکھئے۔ کسی فرد (Individual) کو نہ کبھی پہلے اپنا دین بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے' نہ آئندہ کیا جائے گا۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی نص موجود ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (البقرة: ۲۵۶) ''دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت کی راہ گمراہی سے جدا ہو کر روشن اور واضح ہو چکی ہے''۔ لیکن باطل کا غلبہ گوارا نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں تشریعی نظام (Law of the Land) بہر صورت اللہ کا قائم و نافذ ہوگا: {اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ} اگر اہل حق میں کوئی غیرت و حمیت ہے تو وہ حق کا بول بالا کرنے' اسے غالب کرنے اور باطل کو مٹانے' اسے سرنگوں کرنے کی جدوجہد کے لیے تن' من' دھن سب کچھ لگا دیں گے۔ اس راہ میں جان دینے اور سر کٹانے سے زیادہ دنیا میں ان کو کوئی شے محبوب نہیں ہوگی۔ اقبال نے بڑا پیارا شعر کہا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

یعنی باطل تو یہ چاہے گا کہ یہ صورت برقرار رہے کہ دو متضاد فکری نظام پُرامن طریق پر پہلو بہ پہلو رہیں۔ اس لیے کہ اسے تو اس طرح اپنے وجود اور بقا کی ضمانت (Lease of Existance) ملتی ہے، لیکن یاد رکھئے کہ حق و باطل کے مابین Peaceful co-existance خود باطل ہے۔ حق اسے کیسے گوارا کرے گا؟ چنانچہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ میں بھی تصادم کا آغاز جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا جب آپ نے یہ نعرہ لگایا: لا الٰہ الا اللہ...... جس نے ان کے عقائد کی نفی' ان کے نظام کی نفی' ان کے رسم و رواج کی نفی' ان کے رذائل اخلاق کی نفی' ان کے معاشرتی نظام کی نفی' معاشرتی اونچ نیچ کی نفی' نسل پرستی کی نفی' آباء پرستی کی نفی' ہوائے نفس کی نفی کر دی۔ یوں سمجھئے کہ اس کلمۂ توحید کی زد سے باطل نظریات کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں بچ سکتا اور ہر چیز کی نفی اس کلمہ

Salman Saleem 03067163117

میں موجود ہے۔

ہجرت کے بعد کے اقدامات بھی حضور اکرم ﷺ نے کیے۔ وادیٔ نخلہ جیسے دور دراز مقام پر مہم بھیجی۔ ابوسفیان کا قافلہ جا رہا تھا تب بھی اس میں خلل اندازی کرنے کے لیے حضور ﷺ بنفس نفیس ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے۔ مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ ابوسفیان کا قافلہ جب واپس آ رہا تھا تو ایسے ہی خبر اڑ گئی کہ حضور ﷺ شاید اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین مہینے پہلے خود محمد رسول اللہ ﷺ اس قافلے کو Intercept کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہ تو ایک دن رات کا فصل پڑ گیا کہ قافلہ بچ کر نکل گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شبلی مرحوم نے غزوۂ ذوالعشیرہ کا ذکر تک نہیں کیا اور واقعۂ نخلہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہمارے سیرت نگاروں نے خواہ مخواہ ایسی باتیں لکھ دی ہیں...... میرے نزدیک شبلی مرحوم ہمدردی کے لائق ہیں۔ اس لیے کہ ان کا دور انگریز کا دور تھا جب مستشرقین کی طرف سے اسلام پر پے بہ پے حملے ہو رہے تھے اور کہا جا رہا تھا کہ ع "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!" لہٰذا انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ وادیٔ نخلہ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس واقعے نے مکہ میں جوشِ انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔

## فرار نہیں، ہجرت!

ایک اور غلط فہمی بھی دور ہو جانی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ سے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، جان بچا کر نہیں بھاگے تھے۔ جس کسی کا بھی یہ تصور ہو وہ اس کی اصلاح کر لے۔ ہمارے کچھ تجدد پسند دانشور مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو کر ایسا تصور رکھتے ہیں۔ یہ حضرات ہجرت کے واقعہ کا ذکر "Flight to Madinah" یعنی "مدینہ کی طرف فرار" کے الفاظ سے کرتے ہیں، وہ اسے ہجرت نہیں کہتے۔ ہجرت اور فرار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق اس تصور کا ذرا سا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اسے کھرچ دے، ورنہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائے۔ یہ بالکل ویسے ہے جیسے سورۃ الانفال میں

آیا ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھا دینا بہت بڑا جرم اور نا قابل معافی گناہ ہے۔سوائے اس کے کہ پینترا بدلنا ہو یا یہ کہ پیچھے جو نفری ہے اُس تک پہنچ کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو۔تو ہجرت درحقیقت باطل کے خلاف پینترا بدلنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی حیثیت سے پہلے طائف کا انتخاب کیا تھا،لیکن طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔اللہ تعالیٰ نے یہ خوش قسمتی اور سعادت یثرب کے لیے رکھی تھی، چنانچہ اہل یثرب چل کر گئے اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے آئے، بلکہ اس کی منظوری لے آئے۔اب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنا تھی۔ جوں ہی اجازت آئی حضور ﷺ عازمِ ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا۔لیکن حضور ﷺ یہاں کھجوروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام فرمانے نہیں آئے تھے' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

ٹھنڈی چھاؤں سب کو پسند آتی ہے،لیکن حضور ﷺ تو غزوۂ بدر سے پہلے بنفس نفیس چار مہموں میں تشریف لے گئے۔حضور ﷺ نے تو ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں کیا۔ ابتدائی چھ مہینے ایسے ضرور ہیں جس میں حضور ﷺ نہ خود کسی غزوہ کے لیے تشریف لے گئے نہ کوئی سریہ بھیجا،لیکن یہ چھ ماہ حضور ﷺ نے داخلی استحکام میں صرف فرمائے۔اقامت صلوٰۃ اور اجتماعات مسلمین کے لیے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر' انصار و مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی اور آس پاس کے قبائل سے معاہدے کیے۔ان کاموں کو سنبھالنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فوراً اقدامات کا آغاز فرما دیا۔تو یہ ہے اقدام (Active Resistance) جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا' جس کے نتیجہ میں آخری اور چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا جو سلسلہ شروع ہوا، غزوۂ بدر اس کا آغاز ہے۔یوم البدر ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ ہے۔

Salman Saleem 03067163117

ابوجہل سے ایک بات اور بھی منسوب ہے کہ اس نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ! اس جنگ کو یوم الفرقان بنادے" اور اللہ تعالیٰ نے اس دن کو واقعتاً حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنادیا اور سورۃ الانفال میں اس کو "یوم الفرقان" ہی قرار دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہجرت اور غزوۂ بدر ہی دینُ اللہ کے بالفعل غلبہ کی تمہید بنے۔

## غزوۂ بدر کا معرکۂ کارزار

اس خبر کے بعد کہ ابوسفیان کا قافلہ خیر و عافیت سے مکہ پہنچ گیا ہے' عتبہ بن ربیعہ نے حکیم بن حزام کی تجویز پر یہ کوشش کی تھی کہ جنگ ٹل جائے' اس پر ابوجہل نے اسے طعنہ دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو مدمقابل دیکھ کر تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے اور محبت پدری سے مغلوب ہو کر تم یہ تجویز لے کر آئے ہو کہ جنگ نہ ہو۔ یہ ایسا طعنہ تھا جو عتبہ کو گھائل کر گیا اور اس طرح صلح جو لوگوں (Doves) کی جانب سے جنگ کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ چنانچہ اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبازرت طلب کی۔ اہل ایمان کے لشکر سے تین انصاری صحابیؓ مقابلہ کے لیے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا: "مَن انتم؟ مَن القوم؟"...... انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو' ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا: محمد (ﷺ) ہماری توہین نہ کرو' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں' جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے نکلنا چاہا' لیکن نبی اکرم ﷺ نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ' حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب' تین صحابی رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لیے نکلے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو جلد ہی واصل جہنم کر دیا۔ لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا ولید بن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ آگے بڑھے' ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو جو

Salman Saleem 03067163117

جان بلب تھے' اٹھا کر لے آئے۔ انہوں نے کہا مجھے نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرے متعلق فرمائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''تمہیں یقیناً جنت ملے گی'' تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے نکلا کاش! آج ابوطالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضور ﷺ پر نچھاور کر دی ہے۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکین مکہ کا جناب ابوطالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم محمد (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ تا کہ ہم ان سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو قتل کر دیں تو عام طور پر جناب ابوطالب اس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:

''تم محمد (ﷺ) پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکو گے جب تک ان کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ نہ مرے گا۔''

حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا انتقال میدانِ بدر میں نہیں ہوا، بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدانِ بدر سے آگے مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

بہر حال ۱۷ رمضان المبارک ۲ ھ کو میدانِ بدر میں باقاعدہ اور دوبدو جنگ کی صورت میں اندرونِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابوسفیان اور ابولہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھیت رہے۔ واضح رہے کہ ابوسفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اور اس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کل ستر سربرآوردہ لوگ مقتول ہوئے۔ ابوجہل مارا گیا۔ عتبہ بن ربیعہ' اس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر بن حارث' امیہ بن خلف' عتبہ بن ابی معیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خون کے پیاسے تھے' گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔

Salman Saleem 03067163117

سُنّتُ اللہ کا ظہور

غزوۂ بدر میں مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں قریش کی شرمناک ہزیمت اور ان کے ستر (۷۰) سر برآوردہ لوگوں کا کھیت رہنا اصل میں یہ عذاب الٰہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی طرف کسی رسول کو بھیجتا اور وہ قوم انکار پر اس درجہ اڑ جاتی تھی کہ رسول کی جان لینے کے درپے ہو جائے، یہاں تک کہ رسول کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑے تو رسول اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اس قوم پر عذاب کا آنا لازم ہوتا تھا۔ رسول اور ان کے اصحاب کو بچا لیا جاتا تھا اور پوری قوم ہلاک کر دی جاتی تھی۔

البتہ عذاب الٰہی کی صورتیں اور نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ پوری قوم کو ایک عظیم طوفانِ باد و باراں کے ذریعہ غرق کر دیا گیا، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ ہوا۔ اور کہیں ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قوم کو ان کی بستیوں کے اندر ہی ختم کر دیا گیا، جیسے قوم لوطؑ قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیاں: تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰٓ إِلَّا مَسَٰكِنُهُمْ ۚ (الاحقاف: ۲۵) کہیں ایسا ہوا کہ اہل تمرد کو زمین میں دھنسا دیا گیا، جیسے قارون کے ساتھ معاملہ ہوا۔ اور کہیں ایسا بھی ہوا کہ کفار و مکذبین کے سر برآوردہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو ان کی بستیوں سے باہر نکالا گیا اور ان کو عذاب الٰہی نے ملیامیٹ کر دیا، جیسے آلِ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکالا گیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ سورۃ العنکبوت میں ان چاروں انواع کے عذاب کا ذکر بایں الفاظ فرمایا گیا ہے:

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنۢبِهِۦ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ ٱلصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ ٱلْأَرْضَ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ (العنکبوت: ۴۰)

''آخرکار ہر ایک کو ہم نے اُس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا۔''

Salman Saleem 03067163117

آلِ فرعون کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس سے ملتا جلتا معاملہ قریش مکہ کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں اسی سنت اللہ کا ظہور ہمیں صرف اس فرق کے ساتھ ملتا ہے کہ آلِ فرعون کو تو سمندر میں غرق کر دیا گیا، لیکن قریش کے جو نامی گرامی سردار نبی اکرم ﷺ کو ایذا پہنچاتے رہے تھے' جو حضور ﷺ کے خون کے پیاسے تھے' جو توحید کی انقلابی دعوت کے شدید مخالف تھے' ان سب کو میدانِ بدر میں کھینچ لایا گیا اور انہیں اہل ایمان کے ہاتھوں قتل کرا دیا گیا۔ اسی سنت اللہ کی جانب اشارہ سورۃ الانفال کی آیت ۱۷ کے آغاز میں ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ''اے مسلمانو! تم نے ان (مشرکین مکہ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔''

ابولہب میدان میں نہیں آیا تھا لیکن عذاب الٰہی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مکہ کے اندر ہی پلیگ جیسی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر نہایت عبرتناک موت سے دوچار ہوا۔ اس کا تمام جسم سڑ گیا تھا اور اس میں شدید تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اس کی نعش کو لکڑیوں سے دھکیل دھکیل کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا۔

پس دراصل غزوۂ بدر میں صنادید مشرکین کی ہلاکت اس سنت اللہ کے مطابق دنیوی عذابِ الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب اور ان کو دیس سے نکلنے پر مجبور کرنے والے کفار و مکذبین کے لیے طے کر رکھا ہے۔

صحابہ کرامؓ میں سے تیرہ حضرات نے میدانِ بدر میں جام شہادت نوش فرمایا' اور حضرت عبیدہؓ جو زخمی تھے' واپسی کے سفر میں اثنائے راہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے چودہ افراد نے اپنے رب کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دیا جبکہ کفار و مشرکین کے ستر صنادید خاک و خون میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے۔ مزید یہ کہ ستر مشرکین کو اہل ایمان نے قید کر لیا۔

## غزوۂ بدر کے اثرات

غزوۂ بدر کے نتیجہ میں پورے عرب میں، خاص طور پر بدر کے قریب کے علاقہ پر،

Salman Saleem 03067163117

اہلِ ایمان کی دھاک بیٹھ گئی اور اس طرح اس غزوہ میں فتح و کامرانی کی بدولت دعوت توحید اور اسلامی تحریک کی انقلابی جدوجہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ پورے عرب میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر جناب محمد ﷺ کے تین سو تیرہ قریباً نہتے اور بے سروسامان ساتھیوں سے شکست کھا گیا...... یہ نفوسِ قدسی جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے' یہ تو اولاً صرف ابوسفیان کے قافلہ کا راستہ روکنے کے لیے نکلے تھے۔ مدینہ سے روانگی کے وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہزار کے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہو جائے گی...... سیرت نبویؐ پر جناب محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے صاحبزادے شیخ عبداللہ کی تالیف ''مختصر سیرۃ الرسول ﷺ'' میں یہ واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت صرف اس قافلہ پر یورش کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا جو مالِ تجارت لے کر شام سے واپس آ رہا تھا، لہٰذا کوئی نفیر عام نہیں تھی' کوئی اعلانِ جنگ نہیں تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظوں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضور ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ تو مدینہ سے باہر نکل کر حضور ﷺ کو خبر ملی کہ قافلہ پر مسلمانوں کی یورش کے ارادہ کی خبر قریش کو مل چکی ہے اور قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ خبر ملنے کے بعد حضور ﷺ نے مشورہ فرمایا کہ قافلہ کی طرف چلیں یا لشکر کی طرف! اس موقع پر صحابہ کرامؓ میں سے جن حضرات نے قافلہ کی طرف چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگ کے لیے تو تیار ہو کر نکلے ہی نہیں' نہ ہم نے اس اعتبار سے اپنی نفری بنائی ہے اور نہ ہی اس کے لیے ساز و سامان ساتھ لیا ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو مہاجرین نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، جبکہ غزوۂ بدر کے موقع پر صرف تریسٹھ یا تراسی مہاجرین رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔ گویا مہاجرین کی نفری بھی پوری نہیں تھی۔ لہٰذا یہ رائے نہ تو بزدلی کی بنیاد پر تھی اور نہ منافقت کی بنیاد پر، بلکہ جو بھی احوال و اسباب تھے ان کی بنیاد پر صحیح تھی کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے، لہٰذا قافلہ کی طرف چلنا بہتر اور مناسب ہوگا۔ لیکن حضور ﷺ کا منشا کچھ اور تھا۔ حضور ﷺ اللہ کی

Salman Saleem 03067163117

مشیت کے مطابق چاہتے تھے کہ فیصلہ ہو جائے: {لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ} (الانفال: ۴۲) ''کہ جو مرے وہ دلیل کے ساتھ مرے اور جو جئے وہ دلیل کے ساتھ جئے۔''

اب عالم عرب میں جب یہ خبر پہنچی کہ قریش کی ایک ہزار کی جمعیت تین سو تیرہ مسلمانوں سے شکست کھا گئی اور غزوۂ بدر کے میدان میں ان کے ستر بڑے بڑے سورما کھیت رہے تو عالم عرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ غزوۂ بدر میں سردارانِ قریش کے جسم اس طرح کٹ کر گرے ہوئے تھے جس طرح سورۃ الحاقہ میں قوم عاد کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ○ (الحاقہ: ۷) یعنی مشرکین مکہ میدانِ بدر میں ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ ابوجہل میں ابھی جان باقی تھی جب نبی اکرم ﷺ نے پاس آ کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں مبارک رکھا اور فرمایا: ((هٰذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ)) ''یہ شخص اس امت کا فرعون ہے''۔ پس اس فتح سے اہلِ ایمان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ایک طرف ان کا حوصلہ (Morale) بہت بلند ہوا تو دوسری طرف تمام عرب پر مسلمانوں کی ہیبت اور رعب پڑ گیا۔ لہٰذا غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کے تیرہ ماہ شادمانی اور مسرت کے گزرے اور اس دوران اسلام کی دعوت کے اثرات میں وسعت پیدا ہوئی، لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب کچھ کچے اور ضعف ارادہ کے حامل لوگ بھی آ کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ یہ تھا کہ جو آتا تھا وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دعوتِ اسلام قبول کرنے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہو جائیں گی اور اسے کن کن خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسے ہر لحہ جان ہتھیلی پر رکھنی ہو گی، اس راہ میں مشکلات کے پہاڑ آئیں گے، مصائب و شدائد سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن بدر کی فتح سے جب صورتِ حال بدل گئی تو کچھ کچے اور ناپختہ لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(بحوالہ ''منہجِ انقلاب نبوی ﷺ'')

Salman Saleem 03067163117

# غزوۂ احد

Salman Saleem 03067163117

غزوۂ بدر رمضان المبارک ۲ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ تیرہ ماہ بعد شوال ۳ھ میں مشرکین مکہ کے ایک لشکر جرار نے مدینہ پر چڑھائی کردی جو جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات کو قبائلی زندگی کا کچھ تجربہ ہے اور جنہیں عرب کے انتقامی جذبات و احساسات سے کچھ واقفیت ہو اور جنہوں نے ان کی اس دور کی شاعری اور خطبات پڑھے ہوں وہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت ان کی زندگی کس طور پر اجیرن ہو گئی تھی۔ مکہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین اور آرام سے نہیں گزارا۔ انتقامی جذبات لاوے کی طرح ہر دل میں کھول رہے تھے۔ ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولین بدر کا انتقام نہیں لے لیا جائے گا نہ خوشبو لگاؤں گا نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اسی طرح اس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا ہے وہ بھی ناقابل تصور ہے' جس کا باپ مارا گیا' چچا مارا گیا' بھائی مقتول ہوا۔ یہ ہندہ ابوسفیان کی بیوی' عتبہ کی بیٹی اور حضرت ابوحذیفہؓ' جو سابقون الاولون میں سے ہیں' کی بہن ہیں۔ ہندہ بھی فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں اور مومنہ صادقہ ثابت ہوئیں۔

## قریش کی پیش قدمی اور حضور ﷺ کی مشاورت

بہر حال اب جو لشکر مدینہ پر چڑھ دوڑا تھا وہ تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا' قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت جمع کر کے لا سکتے تھے وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ اس موقع پر بھی نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی کہ اس موقع پر کیا حکمت عملی اختیار کی جائے جبکہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتی رائے تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق

ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی یہی تھی۔ آخر جھوٹا انسان ہر موقع پر تو جھوٹ نہیں بولتا' کبھی وہ سچ بھی بولتا ہے۔ عبداللہ بن اُبی مدینہ کا رہنے والا تھا' لہٰذا وہ اپنے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی صورتِ حال میں مدینہ والے محصور ہو کر مدافعت کیا کرتے تھے تاکہ مرد گلیوں میں دو بدو لڑیں اور عورتیں اوپر سے دشمن پر پتھراؤ کریں۔ اس طرح گویا کہ ان کی دوہری طاقت روبکار آجاتی تھی۔ چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیش نظر عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی یہ تھی کہ ہمیں کھلے میدان میں جنگ کرنے کی بجائے محصور ہو کر اپنی مدافعت کرنی چاہئے۔ بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا رجحان بھی یہی تھا۔

لیکن ایک تو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھی نام شامل ہے...... اب یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا کہ اسی جبل احد کے دامن میں ان کی شہادت ہونی ہے، لہٰذا ان کی طرف سے خصوصی جوش وخروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا کہ ہمیں محصور ہو کر نہیں بلکہ مردانہ وار دو بدو جنگ کرنی چاہئے' ہمیں تو شہادت درکار ہے...... دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا' خاص طور پر ان حضرات کی طرف سے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے، کیونکہ غزوۂ بدر کے موقع پر نفیر عام تو تھی ہی نہیں۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم جو نکلے تھے وہ جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے۔ تو اندازہ کیجئے کہ جو لوگ اس غزوہ میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان کے سینوں میں کتنی حسرت ہو گی کہ وہ کتنی بڑی سعادت سے محروم رہ گئے۔ لہٰذا ان کا جوش وخروش بھی دیدنی تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہئے۔ پھر اس تیرہ ماہ کے عرصہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے' ان کے ذہنوں میں ہو سکتا ہے یہ بات ہو کہ جب تین سو تیرہ اہل ایمان نے بدر میں اتنی بڑی فتح حاصل کی ہے تو اللہ کی مدد آخر یہاں بھی تو ہمارے شامل حال ہو گی، لہٰذا فتح تو ہمیں ہونی ہی ہونی ہے' ہم اپنے دامن پر یہ داغ کیوں گوارا کریں کہ ہم نے مردوں کی طرح کھلے میدان میں جا کر جنگ نہیں کی۔ پس یہ مختلف اسباب تھے جن کی وجہ سے محسوس ہوا کہ زیادہ لوگوں کی خواہش ہے کہ کھلے میدان میں جنگ ہو۔

Salman Saleem 03067163117

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان ہی میں مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح جماعتی زندگی کا ایک اہم اصول سامنے آ گیا۔ مشورہ اور اس کی اہمیت سامنے آ گئی۔ اگرچہ اسلامی نظم جماعت میں فیصلہ کا آخری اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے' وہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا، لیکن تدبیر کے معاملہ میں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لیے اور ان کے اندر ایک باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے امیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بعض مواقع پر اپنے ساتھیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ دے' جیسا کہ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے سامنے آتا ہے۔ البتہ یہ طرزِ عمل صرف تدبیر کے معاملہ میں اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ نص میں' یعنی ایسے معاملے میں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا صریح حکم موجود ہو یہ طرزِ عمل ہرگز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ تدبیر کے معاملہ میں بھی یہ بات ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ گو تدبیر ہماری ہے لیکن مآلِ کار تمام معاملات کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے' جو وہ چاہے گا نتیجہ اس کے مطابق ظاہر ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہوگی۔ اس کے بعد غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ماتھا ٹھنکا...... قبل ازیں حضور ﷺ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے، اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں جن کی بنا پر حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ میدانِ احد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ حضور ﷺ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' آپ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے اور انتظام فرمائیے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کیے انہیں اتار دے۔

قریباً یہی بات سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں فرمائی گئی ہے جو گویا حضور ﷺ

یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورۂ آل عمران کا بیشتر حصہ غزوۂ احد کے بعد نازل ہوا ہے۔ محولہ بالا آیت میں بالکل وہی نقشہ ہے جس پر حضور ﷺ نے عمل فرمایا تھا۔ گویا جو کام نبی اکرم ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کیے بعد میں اللہ کی طرف سے قرآن مجید میں ان کی توثیق آ گئی..... وہ آیت مبارکہ یہ ہے کہ کے اس طرزِ عمل کی توثیق میں نازل ہوئی

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ

"(اے نبیؐ!) یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل وکرم اور بڑی رحمت ہے کہ آپ اپنے ان ساتھیوں کے حق میں بڑے نرم ہیں (جو ان کی دلجوئی فرماتے ہیں) اگر آپ کہیں سخت دل اور تند خو ہوتے تو یہ لوگ منتشر ہو گئے ہوتے (آپ کے پاس سے چھٹ گئے ہوتے)"

اقبال نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

یہ خوئے دلنوازی جناب محمد رسول اللہ ﷺ میں بہ تمام وکمال موجود تھی۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب سے فرمائی: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ "پس آپ ان کی خطاؤں سے درگزر کیجیے' ان کے لیے استغفار بھی کرتے رہا کیجیے اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی لیجیے" فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ "پس جب آپ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجیے" یعنی پھر فیصلے کا بار بار بدلنا درست نہیں۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان عظیم ترین الفاظ مبارکہ پر: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ "بلاشبہ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" جن کو اللہ محبوب قرار دے ان سے خوش بخت و خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے!

## احد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبل احد کی جانب کوچ فرمایا،

Salman Saleem 03067163117

لیکن راستے ہی میں عبداللہ بن اُبی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ واپس لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں؟ اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دور کے قریباً اڑھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی حصہ منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا اندازہ کیجئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں تو کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جو سات سو افراد باقی رہ گئے تھے ان میں کمزور اور ضعیف ایمان والے بھی تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دامن احد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں کے افراد نے کم ہمتی کے باعث واپس لوٹنا چاہا...... سورۂ آل عمران میں اس کا ذکر بھی موجود ہے:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ (آیت ۱۲۲)

''یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ ڈھیلے پڑ گئے تھے (کمزوری دکھانے والے تھے) حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا۔''

وہ ان کا پشت پناہ تھا' اس نے ان کو سنبھال لیا اور وہ میدان میں ڈٹے رہے۔ چنانچہ یہ دونوں گروہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مِنْكُمْ قرار دیا ہے۔ یعنی امت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی میں شامل قرار دیا ہے اور اپنی ذات سبحانہ کو ہمارا ولی' دوست اور پشت پناہ فرمایا ہے۔ البتہ اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں میں کمزوری پیدا ہوئی تھی اور ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی، لیکن وہ تھے بہر حال اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے، ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری منافقین پر مشتمل تھی۔

## فوری فتح

بہر حال جنگ شروع ہوئی اور پہلے ہی ہلّے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا نقشہ سامنے آ گیا۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو افراد! قریش کے ساتھ دو سو

Salman Saleem 03067163117

گھوڑوں کا رسالہ تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ واضح رہے کہ میدانِ بدر میں ان کے پاس سو گھوڑے جبکہ اہل ایمان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت مقدادؓ بن الاسود اور ایک حضرت زبیر بن العوامؓ کے پاس۔ اسی طرح قریش کے ساتھ سات سو اونٹ تھے جبکہ نبی اکرم ﷺ کے لشکر کے ساتھ ستر تھے۔ اسی کے متعلق حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کی ایک نظم ''بدر کی فریاد'' میں بڑے پیارے انداز میں نقشہ کھینچا ہے:

یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے غسل فرماتے

## نبی اکرم ﷺ کی جنگی حکمت عملی

احد میں قریش کی جو فوج آئی تھی ان کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ تھا اور ان پر خالد بن ولید بن مغیرہ سپہ سالار تھے..... نبی اکرم ﷺ نے احد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا اور اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین تھے۔ جبل احد کے ساتھ ایک درہ ایسا تھا کہ احد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس درہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں ادھر سے حملہ نہ ہو جائے اور کہیں ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپے جانے والا معاملہ نہ ہو جائے' اس درہ پر پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تعینات فرمایا۔ حضور ﷺ نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ تم لوگوں کو یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا۔ آپ اس تاکید اور شدت کا اندازہ کیجئے جو اس حکم میں نظر آتی ہے۔

## ایک خوفناک غلطی

بہر حال جنگ ہوئی تو پہلے ہلے ہی میں مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے ان کا پیچھا شروع کیا۔ چند کفار کا تعاقب کر رہے تھے اور چند مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔ ادھر جو صحابہ کرامؓ درہ پر تعینات تھے ان میں اختلافِ رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیر

Salman Saleem 03067163117

اندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں' مالِ غنیمت جمع کریں' اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں' حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا' لہٰذا میں کسی کو اجازت نہیں دیتا''۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس درّے کو چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس غلطی کے باعث فتح شکست میں بدل گئی۔

یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ اس غلطی کی نوعیت کیا تھی۔ ان حضرات نے جو درے کو چھوڑ گئے اپنے نزدیک غالباً یہ تاویل کی ہو گی کہ حضور ﷺ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہو گئی ہے، لہٰذا اب یہاں سے ہٹنے میں کیا حرج ہے۔ درّہ میں متعین سب کے سب مومنین صادقین تھے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے غلطی خلوص سے بھی ہو جاتی ہے' نیک نیتی سے بھی ہو جاتی ہے، لہٰذا میری تعبیر یہ ہے کہ ان سے تاویل میں غلطی ہوئی ہو گی۔ واللہ اعلم!

### نظم کی اہمیت

درہ چھوڑ کر چلے جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصل غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلیے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تاویل کر لی، لیکن یہاں ان کے اور حضور ﷺ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ نے امیر مقرر فرمایا ہے...... اس امیر کی تو نافرمانی ہو گئی! ڈسپلن تو بہرحال ٹوٹ گیا! نظم کی اہمیت کے بارے میں بیعت عقبہ ثانیہ کے دو الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ حدیث یہ ہے:

((عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلَى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ أَهْلَهُ وَعَلَى

Salman Saleem 03067163117

أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))

''حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تھی کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ مشکل ہو خواہ آسانی' خواہ ہماری طبیعت کو خوشگوار لگے خواہ ناگوار ہو' خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے، اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں، اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں، اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔''

ظاہر بات ہے کہ نبی ﷺ ہر جگہ بنفسِ نفیس تو موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اس کا ایک کمانڈر یا امیر مقرر فرما دیتے۔ اب وہ امیر نبی اکرم ﷺ کا قائم مقام ہے اور معروف میں سمع و طاعت کے اعتبار سے اُس کا حکم بالکل اسی طرح مانا جائے گا جیسے نبی اکرم ﷺ کا حکم مانا جائے گا، یہی Army Discipline ہے۔ اس کے لیے حضور ﷺ کی ہدایت بایں الفاظ موجود ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِي فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِي فَقَدْ اَطَاعَنِي وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِي فَقَدْ عَصَانِي))

اور بعض احادیث میں "امیری" کی جگہ "الامیر" کا لفظ ہے، یعنی:

((وَمَنْ يُطِعِ الْأَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِي، وَمَنْ يَعْصِ الْأَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِي)) (بخاری و مسلم)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے معین کردہ امیر کا کہا مانا' اس نے میرا کہا مانا اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

## اسلام کا نظمِ جماعت

اسلامی جماعت کا نظم ملاحظہ ہو کہ پچاس کی نفری میں سے کمانڈر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور ایسے چودہ حضرات مزید بھی تھے جنہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق جگہ نہیں

Salman Saleem 03067163117

چھوڑی، لیکن پینتیس افراد وہاں سے چلے گئے۔ سات سو کی نفری میں پینتیس پانچ فیصد ہوتے ہیں' لیکن پانچ فیصد اشخاص کی یہ غلطی جس کو آپ Indiscipline کہیں گے یعنی نظم کو توڑا گیا، اس کی کتنی بڑی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس سے نظم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ یہ امت ناقۂ بے زمام بن گئی ہے۔ سمع وطاعت کا نظام کہیں قائم نہیں ہے اور جب نظام ہی نہ ہو تو امت سمع وطاعت اور نظم کی خوگر بنے تو کیسے بنے! ہر شخص انانیت کا شکار ہے! کوئی دوسرے کو امیر مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرے! یہ جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔

آج ہماری امت مسلمہ میں انتشار کی جو انتہا ہے ذرا اس کو سامنے رکھئے اور یہ واقعہ نوٹ کیجئے۔ کیا (معاذ اللہ) اس میں حضور ﷺ کی کوئی غلطی تھی؟ ہرگز نہیں! صرف پینتیس صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے ایک حکم کی غلط تاویل کر لی تھی' لیکن اپنے کمانڈر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے یقیناً ڈسپلن توڑ دیا تھا۔ نظم کی خلاف ورزی کی تھی اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی تھی...... اس کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ان کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ درہ خالی ہے۔ اصل جنگ تو پیدل فوج (Infantry) کی ہوتی تھی' وہ مار کھا چکی تھی۔ بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اب انہوں نے احد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑ سواروں کا دستہ لے کر اس درہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے جو حملہ آور ہوئے تو یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ درہ پر صرف پندرہ تیر انداز رہ گئے تھے' ان کے لیے دو سو گھڑ سواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری برقرار رہتی تو خالد بن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درہ کو کراس کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحابِ رسول ﷺ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم!

## صورتِ حال کی تبدیلی

خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں' کچھ لوگ کفار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مالِ غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔ بھاگنے والے کفار نے جب خالد بن ولید اور ان کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ

Salman Saleem 03067163117

کرزوردار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں اس صورتِ حال پر تبصرہ موجود ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۵۲)

"(مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا جبکہ (ابتدا میں) تم اُس کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے، مگر جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے کمزوری دکھائی) اور تم نے معاملہ میں اختلاف کیا اور تم (اپنے امیر کی) حکم عدولی کر بیٹھے' بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی (یعنی فتح) جو تمہیں محبوب تھی...... اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔"

درے پر متعین تیراندازوں نے اپنے مقامی امیر کی جو حکم عدولی کی تھی تو یہ اصل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی تھی، کیونکہ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے پچاس تیراندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضور ﷺ کی نافرمانی ہو گئی۔ بعض مفسرین نے مَّا تُحِبُّوْنَ سے مراد مالِ غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۃ الصف کی آیت ۱۳ کے اس حصہ سے کہ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ سے استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلے میں اہل ایمان کے لشکر کو حاصل ہو گئی تھی۔ میں اس آخر الذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

Salman Saleem 03067163117

## حکم عدولی کی سزا

غزوۂ احد کی فتح کا شکست میں بدلنا درحقیقت فشل، تنازع فی الامر اور معصیت امیر کے جرم کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ تصور کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی کہ سات سو میں سے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ یعنی دس فیصد نفری شہید ہوگئی، حالانکہ خطا صرف پانچ فیصد کی تھی۔ پھر شہداء میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے کیسے کیسے جان نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد ﷺ نے جمع کیے تھے۔ ان ہی میں اسدُاللہ واسدُرسولہٖ حمزہ بن عبدالمطلبؓ ہیں' ان ہی میں المُقری یعنی مصعب بن عمیرؓ ہیں کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلامی انقلاب آیا اور اوس و خزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ مہاجرین و انصار میں سے اڑسٹھ (۶۸) دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ اور جان نثارانِ محمد (ﷺ و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے جام شہادت نوش کیا۔ حضور ﷺ خود بھی مجروح ہوئے، دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضور ﷺ کے رخسارِ مبارک میں اس طرح سے گھس گئیں کہ نکالنے کے لیے زور لگایا تو نہیں نکلیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا۔ حضور ﷺ پر غشی بھی طاری ہوئی۔ کفار نے ایک موقع پر حضور ﷺ کو نرغے میں لے لیا اور تیروں کی بارش برسائی۔ جاں نثاروں نے اپنے جسموں کو حضور ﷺ کے لیے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں ترازو ہوں' محمد ﷺ کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ حضور ﷺ ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے: ''سعد تم پر میرے ماں باپ قربان' تیر چلاتے جاؤ''۔ صرف حضرت سعدؓ ہی وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لیے حضور ﷺ نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

الغرض مسلمانوں کو بڑی واضح شکست ہوئی۔ افراتفری پھیلی۔ نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہر حال ان حالات میں سیرت نگاروں کے سامنے ایک عجیب سا سوال اور مسئلہ آتا ہے کہ اس صورتِ حال میں قریش واپس کیوں چلے گئے! ایک حدیث شریف کے مطابق انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہوتا ہے، وہ اسے جس طرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ اُس نے قریش کے

Salman Saleem 03067163117

دل پھیر دیئے، ورنہ وہ اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ احد میں موجود تمام مسلمانوں کا صفایا کر دیتے۔ بہر حال بعض ذرائع سے اس کی یہ توجیہ ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ اگر چہ خالد بن ولید رئیس لشکر ابو سفیان سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں پہاڑ پر چڑھ کر اس معاملہ کو ختم کر دینا چاہئے، اس قضیہ کو ہمیشہ کے لیے چکا دینا چاہئے، لیکن ابو سفیان بڑے حقیقت پسند' زیرک اور حالات کا بہت صحیح صحیح جائزہ لینے اور ان پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں' اس لیے کہ مسلمان بلندی پر ہیں، وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ ہو گی تو ہمارا بہت جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہر حال ہم نے بدلہ لے لیا ہے' یہی بہت ہے۔

## نعروں کا تبادلہ

ابو سفیان نے دامن کوہ سے نعرہ لگایا کہ محمد (ﷺ) زندہ ہیں یا فوت ہو گئے؟ حضورؐ خاموش رہے۔ ادھر سے تین بار اسی نعرے کی تکرار ہوئی۔ تیسرے نعرے پر حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا' انہوں نے نعرہ کا جواب نعرہ سے دیا کہ ''اے دشمن خدا! رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔'' پھر ابو سفیان نے کہا: ''دیکھو یہ یومِ بدر کا بدلہ ہے جو آج ہم نے چکا لیا۔'' حضرت عمرؓ نے جواباً کہا: ''تمہارے مقتول جہنم میں ہیں جبکہ ہمارے شہداء جنت میں ہیں۔'' ابو سفیان نے پھر نعرہ لگایا ''اُعْلُ هُبل''۔ اس موقع پر ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ مشرکین نے کسی بت کا نعرہ لگایا۔ یہ دراصل خوشی کا موقع تھا۔ ورنہ جب مشکل کا وقت ہوتا تھا تو مشرکین بھی صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ یہاں تو انہیں فتح ہو گئی تھی، اسی لیے ابو سفیان نے نعرہ لگایا ''اُعْلُ هبل''۔ حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو: ''اللّٰہ اعز واجلّ''۔ مسلمانوں نے ادھر سے یہ نعرہ بلند کیا۔ ادھر سے ابو سفیان پھر پکارا ''لنا عزّٰی وَلَا عُزّٰی لکم'' (ہمارے لیے تو عزیٰ ہے جس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے' تمہارے لیے کوئی دیوی نہیں ہے۔) حضور ﷺ نے فرمایا جواب دو ''اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم'' (اللہ ہمارا مولا ہے' ہمارا پشت پناہ اور مددگار ہے' تمہارا کوئی مولا نہیں) پھر ابو سفیان یہ کہہ کر اپنے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ہو گئے کہ ''اگلے سال یہیں پھر مقابلہ کے لیے ملاقات ہو گی!''

Salman Saleem 03067163117

## غزوۂ احد کی شکست کے اثرات

غزوۂ احد کے بعد کے دو سال نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کے لیے نہایت پریشان کن اور تکلیف دہ رہے ہیں۔ اس لیے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب' ہیبت اور دھاک کی جو فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہو گئی۔ اب عین مدینہ کے قریب آ کر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو اس سے ایک تو مسلمانوں کے دل زخمی تھے۔ ان کا حوصلہ (Morale) اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہو گیا تھا۔ دوسرے گرد و پیش کے مشرکین کے قبائل پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی' بلکہ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت و تحریک کے مقابلہ میں دلیر ہو گئے اور ان کی طرف سے مخالفت و مزاحمت کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

## اللہ کی طرف سے تسلی و تشفی

ان تمام ناموافق و نامساعد حالات میں اہل ایمان کی تسلی کے لیے فرمایا گیا:

اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ (آل عمران:۱۴۰)

مسلمانو! کیوں دل شکستہ ہوتے ہو، اگر تمہیں چرکہ اور زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکہ اور زخم لگ چکا ہے۔ انہوں نے تو ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ میدانِ بدر میں اپنے ستر مقتول چھوڑ کر گئے تھے اور ستر قیدی۔ اس کے باوجود وہ تین ہزار کی نفری لے کر مدینہ پر چڑھائی کے لیے آ گئے۔ تم کیوں ہمت ہار رہے ہو؟ کیوں تنگ دل ہو رہے ہو؟ وَتِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ ۚ "یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں"۔ گھبراؤ نہیں: وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝ (آل عمران:۱۳۹) "دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو"۔ یہ تو تمہاری غلطی تھی جس پر غزوۂ احد میں تمہیں شکست کی صورت میں سزا دے کر ہم نے تمہیں سبق سکھایا ہے، ورنہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پشت پر نہیں ہے' تمہارا مددگار اور حامی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی اندرونِ عرب کا معاملہ ہے' تمہیں تو ابھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرنا ہے۔ اگر آج تمہارا نظم اور ڈسپلن ڈھیلا رہا تو

Salman Saleem 03067163117

آئندہ کیا ہوگا۔ لہٰذا سبق سکھانا ضروری تھا۔ تمہارے اندر اس کے بغیر نظم کی اہمیت کا احساس کہاں سے آتا! اگر اللہ چاہتا تو اس خطا کو نظر انداز (Condone) کر دیتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ تمہاری اس خطا کے باوجود تمہیں فتح دے دیتا۔ لیکن اس طرح تمہاری اس موقع کی کمزوری اور غلطی کی اصلاح نہ ہوتی بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا۔ لہٰذا ایک وقتی سی شکست کی صورت میں ہم نے تمہیں متنبہ کر دیا کہ اپنی صفوں (Ranks) کا جائزہ لے لو، جہاں جہاں کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کی فکر کرو، اپنی جمعیت کو اور مضبوط کرو، جو نئے لوگ مشرف بایمان ہوئے ہیں ان کی تربیت کی کمی کو دور کرو تا کہ یہ بھی اسی طرح کندن بن جائیں جیسے مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین اور السابقون الاولون انصار...... تمام اہل ایمان کو نظم کی پابندی کا خوگر بناؤ۔ تم یہ سب کچھ کر لو تو تم سے استخلاف اور تمکن فی الارض کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پختہ وعدہ ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (النور:۵۵)

"اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا، جیسے اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی، اور وہ ضرور ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جو ان کے لیے اُس نے پسند کیا ہے اور وہ ان کی (موجودہ) خوف کی حالت کے بعد اس کو لازماً امن سے بدل دے گا۔"

(بحوالہ "منہج انقلاب نبوی ﷺ")

Salman Saleem 03067163117

# غزوۂ احزاب

غزوۂ احد کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں تشویش اور خوف کی حالت رہی' جو غزوۂ خندق کے موقع پر اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچی۔

رمضان المبارک ۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا۔ پھر شوال ۳ھ میں معرکۂ احد پیش آیا۔ ذیقعدہ ۵ھ میں یعنی دو سال اور ایک ماہ بعد اب قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لیے جمع ہو گیا۔ جنوب سے قریش آ گئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آ گئے، جن میں بنو فرازہ اور بنو غطفان بھی تھے جو نجد کے علاقے کے بڑے جنگ جو اور خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے وہ یہودی قبائل حملہ آور ہو گئے جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح ان قبائل نے مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں غزوۂ احزاب کا ذکر پورے دو (۲) رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔

## مدینہ پر یلغار کا نقشہ

کفار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار اور کمزور ایمان والوں اور منافقین کے خوف و بے اطمینانی کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ

"یاد کرو جب لشکر آ گئے تھے تم پر تمہارے اوپر سے بھی اور تمہارے نیچے سے بھی۔"

چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے' اسی لیے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں' جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو مشرق سے آئے ان کے لیے مِنْ فَوْقِكُمْ کے الفاظ آئے...... اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ قریش اور ان کے حلیف مغربی یعنی نچائی اور اتار کے راستہ سے آئے، لہٰذا ان کے لیے وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل

Salman Saleem 03067163117

جمع ہو کر آ گئے تھے..... اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ:

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا○

''اور یاد کرو جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔''

یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا...... راقم کی رائے ہے کہ ذاتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر سب سے سخت دن ''یومِ طائف'' گزرا ہے اور مسلمانوں پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام غزوۂ احزاب کے گزرے ہیں۔

غزوۂ احد کے موقع پر تین سو افراد تو بطور منافقین منظر عام پر آ چکے تھے۔ اب غزوۂ احزاب تک ان کی تعداد کتنی ہو گی' واللہ اعلم۔ بہرحال قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ان کی معتد بہ تعداد موجود تھی۔ ان کے دل ہمارے محاورہ کے مطابق بلیوں اچھل رہے تھے اور ان کو ہر چہار طرف موت نظر آ رہی تھی اور بظاہرِ احوال بچنے کی کوئی شکل سامنے نہیں تھی۔

میں جب بھی غزوۂ احزاب کا ذکر کرتا ہوں تو جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے۔

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

ہدایت کا ایک چراغ تھا جو مدینہ میں روشن تھا اور اس کو بجھانے کے لیے اتنی بڑی بڑی آندھیاں آ رہی تھیں کہ الامان والحفیظ!

## منافقین کی کیفیت

امتحان یقیناً شدید تھا۔ نتیجتاً منافقین کے دلوں میں جو خبث' نجاست اور گندگی تھی وہ اس

Salman Saleem 03067163117

ابتلاء وآزمائش کو دیکھ کر ان کی زبانوں پر آ گئی جس کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ○ (الاحزاب:١٢)

''اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا''۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو دھوکا دے کر مروا دیا گیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی' جبکہ اس وقت حالات یہ ہیں کہ ہم رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے' اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ فاقوں پر فاقے آ رہے ہیں۔ غضب کی سردی نے الگ زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ منافقین کی یہ وہ باتیں ہیں جو ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آ گئیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

## اہل ایمان کی کیفیات

ادھر مومنین صادقین کی کیفیت کیا تھی؟ ملاحظہ ہو: وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز (الاحزاب:٢٢) ''اور حقیقی مومنین کا اس وقت حال یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہی تو وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات بالکل سچی تھی''۔

یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مومنین اشارہ کرتے رہے ہیں؟ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و امتحان اور ابتلاء کے وعدوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کی آیات ٢۔٣ میں فرمایا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ○ (العنکبوت:٢۔٣)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ

ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!"

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۵ میں فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○

"اور ہم البتہ تم کو خوف وخطر اور بھوک اور مال و جان اور فصلوں کی تباہی میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے۔ جو ان حالات میں صبر کریں تو ان کو (اے نبیؐ) بشارت دے دیجیے"۔

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مومنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آ گیا: **هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ**

## خندق کی تیاری کا عجیب نقشہ

غزوۂ احزاب میں کفار و مشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا اور اس دوران اہل مدینہ پر بڑے ہی سخت قسم کے حالات پیش آئے۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو نبی اکرم ﷺ بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے اور پتھر اٹھا اٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے۔ چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھ رکھے تھے تاکہ کمریں دوہری نہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے۔ دراصل یہ اس معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (Hunger Pain) نہیں ہوگا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کرتے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ اب فاقہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے، ہم نے اسی لیے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے اپنا کرتہ اٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

Salman Saleem 03067163117

یہ دراصل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے خندق کھودی جائے۔ عرب تو جانتے ہی نہیں تھے کہ خندق کس بلا کا نام ہے۔ پرانی جنگوں میں دفاع کے جو طریقے اختیار کیے جاتے تھے ان میں شہر پناہ کے گرداگرد خندق کھودنے کا رواج بھی تھا۔ اہل ایران دفاع کے اس طریقہ سے بخوبی واقف تھے۔ ایران اور روم کی تو کئی سو سال سے جنگ چل رہی تھی۔ تاریخ دونوں کے مابین جھولا جھول رہی تھی۔ کبھی رومی ایران کے دارالسلطنت مدائن تک چڑھ دوڑتے تھے تو کبھی ایرانی ان کو ایشیائے کوچک میں دھکیل دیتے تھے۔ جب مدینہ میں خبر پہنچی کہ تین اطراف سے کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لیے چلا آ رہا ہے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کو پشت پر رکھتے ہوئے خندق کھودی جائے تاکہ خندق کی وجہ سے دشمن براہِ راست مدینہ پر یورش نہ کر سکیں۔ چنانچہ خندق کھودنے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔

روایات میں خندق کی کھدائی کے وقت دو اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ محبت الٰہی میں سرشار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے سالارِ اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی کھدائی کے لیے اس سنگلاخ زمین پر جرأتِ مومنانہ اور ہمت مردانہ کے ساتھ کدالیں چلا رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرب لگاتے ہوئے کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے: "اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ" اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' آخرت کا عیش ہی اصل عیش ہے۔ گویا ان کے نزدیک اس وقت کی کلفتیں' تکالیف اور مصائب ہیچ ہیں' انہیں تو آخرت کی فوز و فلاح چاہیے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دے رہے تھے: "فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ" اے اللہ! پس تو بخشش فرما دے ان انصار و مہاجرین کی!

دوسرا شعر جس کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے وہ نظم جماعت کی اساس و بنیاد بیعت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ صحابہ کرامؓ ترانہ کے انداز میں کدالوں کی ضرب کے ساتھ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا　　عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا!

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ جہاد اُس وقت تک جاری رہے گا جس وقت تک جان میں جان ہے۔"

Salman Saleem 03067163117

جسم و جان کا تعلق منقطع ہو جائے تو بات دوسری ہے، جب تک یہ تعلق باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ یہ ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کی وہ شان جس کی بنیاد بیعت ہے۔

## نصرتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہل ایمان کو اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی جو بیس دن تک جاری رہا تھا۔ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی جس سے کفار و مشرکین کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پر چڑھی ہوئی جو بڑی بڑی دیگیں تھیں الٹ گئیں اور ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک غیبی تدبیر تھی جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے...... اسی کا ذکر ہے سورۃ الاحزاب کی آیت ۹ میں:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ○

"اے اہل ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا' جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے ان پر بھیج دی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں، اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے چند اور تدابیر بھی اختیار فرمائی تھیں، لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا امتحان لینا اور دودھ کا دودھ' پانی کا پانی کر دینا مقصود تھا، تاکہ نظر آ جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں!!...... جب یہ امتحان ہو گیا تو مدمقابل دشمنوں کے لیے ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت کے مقابلہ میں تو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار کیا بارہ لاکھ کا لشکر بھی ہوتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ تلپٹ اور تتر بتر

Salman Saleem 03067163117

کر دیا اور کفار و مشرکین جو ایک زبردست جمعیت کی شکل میں بڑے ارمانوں اور بڑی تیاریوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے، ایک ہی رات میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا۔

## نبی اکرم ﷺ کا تاریخی ارشاد

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کتنی دور رس نگاہ اور کتنی بصیرت وفراست عطا فرمائی تھی۔ کسی انقلابی رہنما کے لیے یہ وصف (Quality) اشد ضروری ہے کہ وہ حالات پر صحیح صحیح نگاہ رکھے...... چند اصولوں کو جان لینا اور ان کو بیان کرتے چلے جانا ہی سب کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیت اور نگاہِ دور رس کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ حالات کی نبض پر بھی ٹھیک ہاتھ ہو۔ صحیح اندازہ ہو کہ حالات کا رخ کیا ہے' وہ کدھر جا رہے ہیں! صحیح صحیح تشخیص (Assessment) ہو کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور ہمارا دشمن کتنے پانی میں ہے! اس کی طاقت کیا ہے! اس کے اور ہمارے اثرات کا تناسب کیا ہے! ظاہر بات ہے کہ ایک انقلابی عمل میں ان سب امور پر گہری نگاہ رکھنی ناگزیر ہے۔ اگر صرف ایک خانقاہ ہے اور اس میں لوگوں کی تربیت کرنی ہے تو اس کے لیے بھی ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ لیکن اس میں ان چیزوں پر نگاہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک دار العلوم ہے' جہاں درس دینا ہے' قرآن پڑھانا ہے' حدیث وفقہ پڑھانی ہے تو ان کاموں کے لیے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہے، مگر وہاں بھی مذکورہ بالا امور پر نظر ہونی ضروری نہیں ہے...... لیکن انقلابی عمل میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امر پر نگاہ ہو کہ انقلابی دعوت اور تحریک کو مختلف مراحل سے گزار کر کامیابی تک کیسے پہنچا دیا جائے! یہ شئے دِگر ہے۔ اس کے لیے اور قسم کی صلاحیتیں چاہئیں۔ اس کی ایک عظیم مثال ہے جو غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد سیرتِ مطہرہ میں نظر آتی ہے۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر' جس کا دوسرا نام غزوۂ خندق بھی ہے' اگرچہ قریش بارہ ہزار کا لشکر لے آئے تھے اور عرب کی حد تک اس وقت تک کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر پہلی بار جمع

Salman Saleem 03067163117

ہوا تھا، لیکن اب جو یہ لشکر منتشر ہوا اور بھیڑ چھٹی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو ان الفاظ میں خوشخبری سنادی کہ ((لَنْ تَغْزُوْ كُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) ''اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے، بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے''۔ میرے نزدیک سورۃ الصف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے: وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ''اور (اے مسلمانو!) ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے' یعنی اللہ کی مدد تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت سنا دیجئے''---- نبی اکرم ﷺ نے جو یہ الفاظ فرمائے کہ: {لَنْ تَغْزُوْ كُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ} تو راقم کے نزدیک یہ الفاظ حضور ﷺ نے سورۃ الصف کے اس حکم (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ) کے امتثالِ امر میں فرمائے تھے۔ واللہ اعلم!

نبی اکرم ﷺ کو بخوبی اندازہ تھا کہ قریش نے کتنی محنتوں اور کوششوں سے اس عظیم لشکر کی تیاری کی ہوگی اور اپنے حلیف قبائل کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کیا ہوگا۔ بنو غطفان' بنو فرازہ اور خیبر کے یہود کے قبائل کو آمادہ کرنے کے لیے کتنی سفارتیں بھیجی ہوں گی' کتنی خط و کتابت کی ہوگی اور اس کام کے لیے پیامبری کے سلسلہ میں کتنے سوار دوڑائے ہوں گے...... یہ سارے پاپڑ بیل کر قریش نے اتنی طاقت جمع کی تھی اور اسے لے کر وہ مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے، لیکن نتیجہ کیا نکلا! یہ کہ بے نیلِ مرام واپس جانا پڑا' ساری محنتیں اور کوششیں اکارت گئیں۔ اتنی بڑی جمعیت......لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے اس کی حیثیت کیا تھی! اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیج دی اور ان کے تمام ارمان ملیامیٹ ہو گئے۔ حضور ﷺ کو اندازہ تھا کہ اس ہزیمت سے قریش کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ اب قریش یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے متعلق سوچیں۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اہل ایمان کو بشارت سنادی کہ اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ نہیں کر سکتے بلکہ اب تم چڑھائی کر کے جاؤ گے' اب پیش قدمی تمہاری طرف سے ہوگی۔ اب جنگ کے لیے اقدام ہماری طرف سے ہوگا جو اب تک قریش کے ہاتھ میں تھا۔

Salman Saleem 03067163117

# صلح حدیبیہ

## حضور ﷺ کا خواب

غزوۂ احزاب کے اگلے ہی سال ۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی اہل ایمان رضی اللہ عنہم عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلان عام کروا دیا کہ ہم عمرہ کے لیے جائیں گے' جو ہمارے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے' وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اگرچہ عمرہ کی نیت سے جا رہے تھے' لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لیے اہل ایمان کو مکہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لیے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لیے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لیے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ حضور ﷺ کے ساتھ چلنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات میں چودہ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تعداد کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم زیادہ تر روایات کے مطابق تعداد چودہ سو تھی۔ ذوالحلیفہ کا مقام مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے۔ یہاں سے عمرہ یا حج کے لیے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں حضور ﷺ اور آپ کے تمام ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور ہدی (قربانی) کے جو جانور ساتھ تھے ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے' جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے مکہ کی طرف سفر جاری رکھا حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم ﷺ اور مشرکین قریش کے

Salman Saleem 03067163117

مابین وہ صلح ہوئی جو تاریخ میں ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورۃ الفتح میں ''فتح مبین'' قرار دیا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (الفتح:۱)

## اہل مکہ کا ردعمل

نبی اکرم ﷺ نے ادھر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ فرمایا' ادھر جب قریش کے علم میں آ گیا کہ حضور ﷺ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت بھی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آ کر قریش کی مدد کریں تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمد (ﷺ) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بُدَیل بن ورقہ خزاعی قبیلہ بنوخزاعہ سے تعلق رکھتے تھے جو مکہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بُدَیل بن ورقہ کو اس کام کے لیے مامور کیا کہ وہ مکہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورتِ حال کیا ہے! انہوں نے آ کر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزمِ مصمم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم مکہ جا کر ہماری طرف سے قریش سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے' ہماری کسی سے لڑنے بھڑنے کی کوئی نیت نہیں ہے' ہم محض عمرہ کے لیے آنا چاہتے ہیں اور قریش کو سمجھاؤ کہ انہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچایا ہے' اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لیے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اسی میں خیر ہے' اسی میں ہماری اور ان کی بہتری ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں پُر امن طور پر عمرہ ادا کرنے دیں اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں۔

بُدَیل بن ورقہ حضور ﷺ کے اس پیغام کے ساتھ مکہ پہنچے۔ وہاں ایک بڑی چوپال میں جا کر جہاں قریش کے بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے' انہوں نے کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں' اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض

Salman Saleem 03067163117

کروں! انہوں نے یہ انداز شاید اس لیے اختیار کیا ہوگا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریش مکہ کا رجحان (Mood) کیا ہے! چنانچہ ان میں Hawks (یعنی مشتعل مزاج اور جنگجو لوگوں) نے تو فوراً کہا کہ ہم نہ تو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت ہے، مگر Doves (یعنی صلح پسند افراد) نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سننی چاہئے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمد (ﷺ) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور ﷺ کا پیغام من وعن سنا دیا۔

## عروہ بن مسعود ثقفی کا مدبرانہ رویہ

اس وقت طائف کے مشہور قبیلہ بنوثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی بھی وہاں موجود تھے۔ مکہ اور طائف کو جڑواں شہروں (Twin Cities) کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مابین رشتہ داریاں بھی بہت تھیں اور مکہ کے اکثر رؤسا کی جائیدادیں اور باغات بھی طائف میں کثرت سے تھے۔ اس موقع پر ان ثقفی سردار عروہ بن مسعود (۱) نے کھڑے ہو کر کہا: ''اے قریش! کیا میں تمہارے لیے باپ کی مانند نہیں ہوں اور کیا تم میرے بچوں کی مانند نہیں ہو؟'' مجلس کے شرکا نے کہا ''ایسا ہی ہے۔'' پھر انہوں نے کہا: ''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا تمہاری بہتری کے لیے کہوں گا؟'' لوگوں نے جواب میں کہا کہ ''ہاں ہمیں اس پر بھی اعتماد ہے''...... تو انہوں نے کہا: ''مجھے اجازت دو کہ میں محمد (ﷺ) کے پاس جاؤں اور ان سے بات چیت کروں۔'' لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

## عروہ بن مسعود کی نبی اکرم ﷺ سے گفت وشنید

حدیبیہ میں جہاں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا پڑاؤ تھا' عروہ وہاں آئے۔ وہ بہت ہی زیرک' دانا اور مدبر انسان تھے' آخر ثقیف کے سردار تھے جو قریش کے بعد سب سے معزز قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لشکر کے ماحول اور نظم وضبط کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے بھرپور جائزہ لیا۔ پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے خیمہ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلے تو انہوں نے خوفزدہ کرنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:

''محمد! (ﷺ) ایک طرف قریش اور ان کے حلیف ہیں' ان کی پوری قوت مجتمع

---

(۱) عروہ بعد میں ایمان لے آئے تھے اور انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (رضی اللہ عنہ)

Salman Saleem 03067163117

ہے اور ان کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے' وہ اس پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ اگر جنگ ہوئی اور بالفرض تم نے مکہ والوں کو ختم کر دیا تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہوگی؟ اس سے پہلے کیا کسی شریف انسان کی ایسی مثال موجود ہے کہ اس نے اس طرح اپنے ہی قبیلہ کو ختم کر دیا ہو؟ اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو جمعیت ہے وہ تو مختلف قبائل سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے (گویا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا والا معاملہ ہے) شکست اور ہزیمت کی صورت میں یہ سب تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں رہے گا۔"

عروہ بن مسعود کے پیش نظر چونکہ قبائلی نظام تھا اور وہ جانتے تھے کہ قبائل تو عموماً قبائلی حمیت کے تحت لڑتے تھے، چنانچہ انہوں نے یہ بات اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ان کو عروہ بن مسعود کی اس بات پر طیش آ گیا۔ ان کی زبان سے عروہ کے لیے ایک عریاں گالی نکل گئی اور انہوں نے کہا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔" گالی سن کر عروہ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ ابوبکرؓ ہیں، تو عروہ نے کہا: "ان کا مجھ پر ایک احسان ہے' ورنہ آج میں انہیں اس گالی کا جواب دیتا۔"

اس کے بعد عروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کے ساتھیوں کا طرزِ عمل کیا ہے!...... حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ ان کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضور کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا' واپس نہیں جا سکے گا...... بہر حال عروہ یہ گفتگو کر کے اور ایک اندازہ قائم کر کے واپس مکہ چلے گئے۔

## عروہ کا قریش کے سامنے اپنے تاثرات کا اظہار

مکہ پہنچ کر عروہ بن مسعود نے قریش کے سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس

Salman Saleem 03067163117

سے ان کے اس تاثر کا اندازہ ہوتا ہے جو اہل ایمان کے لشکر کے نظم وضبط، ان کے جوش و خروش اور ان کی فدائیانہ کیفیات کو دیکھ کر ان کے دل ودماغ پر مرتب ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

''اے قریش کے لوگو! دیکھو' میں قیصر وکسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں' میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں' ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے' لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (ﷺ) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمد (ﷺ) سے ہے اور جتنی عقیدت وتوقیر اور عزت محمد (ﷺ) کی ان کے دلوں میں ہے' اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدایانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے' وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمد (ﷺ) وضو کرتے ہیں تو لوگ ان کے وضو کا پانی تبرک کے طور پر لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کے لیے نہیں دیکھی، لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو' ان سے جنگ کا ارادہ ترک کردو اور مصالحت کرلو۔''

## قریش کے جوشیلے افراد کا ردعمل

عروہ کے اس اظہار خیال پر وہاں بڑا شوروغوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہم محمد (ﷺ) کو کسی صورت بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محمد (ﷺ) کو واپس جانا پڑے گا، ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ انہوں نے یہی پیغام اپنے دو دوسرے اشخاص کے ذریعے حضور ﷺ کے پاس بھیجا' لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی۔ فریقین میں سے کوئی بھی اپنے مؤقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور تناؤ (Tension) کی کیفیت برقرار رہی۔

## مصالحت کے لیے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مساعی

نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہونے کے بعد بدیل بن ورقہ خزاعی کے

Salman Saleem 03067163117

ذریعے پہلا پیغام بھیجا تھا' جس کے نتیجہ میں پہلے عروہ بن مسعود حضور ﷺ کی خدمت میں گفتگو کے لیے آئے تھے اور اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (Hawks) لوگ آپ کے پاس آئے، لیکن ان کا رویہ مصالحانہ نہیں تھا بلکہ جارحانہ اور رعب ڈالنے والا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے خود سلسلۂ جنبانی شروع کرنے اور اپنے اصحابؓ میں سے کسی کو مکہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لیے بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے آپ مکہ جائیں اور قریش سے مصالحت کی کوشش کریں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ اب مکہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے جس کی امان و حمایت میں' میں مکہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں۔ لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجئے۔ ان کا قبیلہ بنو امیہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں، جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مکہ جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ تعمیل حکم میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

## بیعت رضوان

نبی اکرم ﷺ کی جانب سے اس سفارت کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب آنجنابؓ کی بے شمار فضیلتوں میں سے ایک فضیلت ہے۔ بہر حال حضرت عثمانؓ ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچا زاد بھائی ابان بن سعید بن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجناب کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا، اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ قریش کسی صورت مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ تاہم انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اب جب تم مکہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم کعبہ کا طواف کر لو لیکن آپؓ نے نبی اکرم ﷺ کی معیت کی بغیر طواف کی یہ پیشکش قبول نہیں فرمائی۔ (۱)

(۱) حضرت عثمانؓ کے مکہ جانے کے بعد بعض اصحاب رسول ﷺ و رضی اللہ عنہم نے کہا کہ "عثمان رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو۔" حضور ﷺ تک جب یہ قول پہنچا تو آپؐ نے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Salman Saleem 03067163117

گفت وشنید میں جو دیر لگی تو اس طرح گویا وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں ''نظر بندی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دریں حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے وہ بیعت لی جو کتب سیر میں ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور و معروف ہے اور جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا○ (الفتح:۱۸)

''(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا، لہٰذا اس نے ان پر قلبی اطمینان و سکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتح قریب بخشی۔''

## بیعت علی الموت

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا جس کے سایہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کر کے ایک عہد کرے...... اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں لیکن عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیے بغیر ہرگز یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ: ''اَنْ لَّا نَفِرَّ'' یعنی ہم یہاں سے پیٹھ نہیں موڑیں گے اور راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ بہر حال اس بیعت کا مقصد یہ سامنے آتا ہے کہ کسی حالت میں پیٹھ نہیں دکھانی اور میدانِ جنگ سے جان بچا کر نہیں جانا۔ اگرچہ جان بچانے کی چند صورتیں وہ ہیں جن کی سورۃ الانفال میں اجازت دی گئی ہے اور انہیں

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) فرمایا: ''مجھے یقین ہے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ عرصۂ دراز تک بھی مکہ میں رہ جائیں تب بھی وہ اس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کر لوں''۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

جائز ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً یہ کہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کسی جنگی حکمت عملی (Strategy) کا تقاضا ہو کہ پیچھے ہٹ جایا جائے، مگر یہاں اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ کسی صورت میں بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ اب یہاں سے کسی جنگی حکمت کے تحت پسپائی ( Strategic Retreat) کا امکان بھی باقی نہیں رہا۔ رہا جان بچا کر فرار ہونے کا معاملہ تو یہ عمل گناہِ کبیرہ میں شامل ہے ہی۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا' صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

## حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصی فضیلت

ترجمانِ وحی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل ومناقب مروی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت عثمانیؓ کے متعدد واقعات آنجناب کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصی فضیلت یہ ہے کہ دو مواقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا ان کو موجود قرار دیا۔ پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔ آنجناب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کافی علیل تھیں' اس لیے ان کی تیمارداری کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آنجناب رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انہیں اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اولاً تو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے کے لیے نکلا تھا لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدر کے مالِ غنیمت میں سے وہی حصہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ اس میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح کا دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔ حضرت عثمانؓ چونکہ وہاں موجود نہیں تھے لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنا ایک دست مبارک دوسرے دست مبارک کے اوپر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور یہ عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت ہے''۔ یہ درحقیقت حضرت عثمانؓ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز ان کو حاصل ہوئی۔ پھر یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خونِ عثمانؓ کے قصاص کے لیے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرامؓ سے جو بیعت لی یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل

Salman Saleem 03067163117

ہوا۔ یہ وہ بیعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس طرح بیعت رضوان کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ ہمیش کے لیے محفوظ فرما دیا ہے۔

## اس بیعت کی ضرورت کیا تھی؟

انتہائی غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بیعت لینے کی ضرورت کیا تھی! حضور ﷺ کے ساتھ جو چودہ یا پندرہ سو افراد آئے تھے ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں پیچھے نہیں رہا۔ صرف ایک شخص جد بن قیس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ اس نے بیعت نہیں کی۔ اس کے سوا بقیہ تمام لوگوں نے بیعت کی۔ یہ شخص درحقیقت منافق تھا اور اس کا ذکر سفر تبوک کے ضمن میں آتا ہے کہ اس موقع پر اس کا نفاق بالکل کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ حضور ﷺ کے ساتھ جو اشخاص آئے تھے ان میں جد بن قیس جیسا کوئی دوسرا شخص شاید ہی ہو۔ اگر حضور ﷺ جنگ کا فیصلہ فرما دیتے تو یقیناً ان مومنین صادقین میں سے کوئی شخص بھی کسی صورت میں پیٹھ دکھانے والا نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ بیعت لے رہے ہیں تو اس میں کیا حکمت تھی؟ درحقیقت یہ اس لیے لی گئی کہ بیعت کا یہ اصول اور یہ عمل آنے والوں کی رہنمائی کے لیے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بحیثیت سنت ہمیشہ ہمیش کے لیے ثبت ہو جائے۔ بیعت رضوان اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کسی موقع پر یا کسی اعلیٰ مقصد کے لیے، جیسے ہجرت و جہاد' بیعت لینا سنت ثابتہ ہے۔ ورنہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیعت لیے بغیر خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے جنگ کا حکم دیتے تو اس سے اعراض کرتا۔ پھر یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر انہی مخلص و صادق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف امور کے لیے حضور ﷺ کا بیعت لینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہی احادیث سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دین، اظہار دین الحق علی الدین کلہ اور تکبیر رب یعنی انقلاب محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی جدوجہد کے لیے جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئے وہ بیعت ہی کے اصول پر قائم ہو، یہی سنت کا تقاضا ہے۔

Salman Saleem 03067163117

## قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادگی

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں' دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ لہٰذا آخر کار انہوں نے مصالحانہ گفتگو کے لیے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا' جن کا شمار ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل بن عمرو(۱) گفتگو کے لیے آئے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

## صلح نامہ کی تحریر، شرائط اور چند اہم واقعات

قریش کو بیعت رضوان کی خبر پہنچ چکی تھی جس پر ان میں کافی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لیے انہوں نے سہیل بن عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کر لیں جو قریش کے لیے آبرومندانہ ہوں' سبکی کا باعث نہ ہوں۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا۔ گفت وشنید کے بعد جب طے ہوا کہ صلح نامہ تحریر کر لیا جائے تو نبی اکرم ﷺ نے صلح نامہ تحریر (Dictate) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں! ہم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے واقف نہیں ہیں' ہم تو ہمیشہ سے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" استعمال کرتے رہے ہیں، لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے' ہم آپ کے الفاظ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں......

حضور ﷺ نے فرمایا "ٹھیک ہے لکھ دو بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ کوئی فرق واقع نہیں ہوتا"۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لکھو کہ "یہ وہ صلح ہے جو محمد رسول

---

(۱) فتح مکہ کے بعد یہ سہیل بن عمرو بھی ایمان لے آئے اور حضور ﷺ کے صحابی ہونے کے شرف سے مشرف ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ارتداد کا جو فتنہ اٹھا اس کے اثرات مکہ تک بھی پہنچے لیکن سہیل بن عمروؓ نہ صرف خود ثابت قدم اور اسلام پر قائم رہے بلکہ آپ چونکہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Salman Saleem 03067163117

اللہ (ﷺ) اور قریش کے مابین منعقد ہوئی۔'' سہیل بن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ نہیں لکھے جا سکتے، اس لیے کہ اسی بنا پر تو ہمارا سارا تنازعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے تو یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی اور اس میں اگر آپ کا نام رسول اللہ لکھا ہوا ہے تو گویا ہم نے آپ کو رسول اللہ مان لیا۔ پھر تو ہمارے اور آپ کے مابین کوئی جھگڑا اور کوئی تنازعہ باقی نہ رہا۔ پھر صلح کا کیا سوال! پس آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ نہیں لکھا جائے گا۔'' سہیل بن عمرو کا یہ اعتراض قانونی اعتبار سے درست (Valid) تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے وہ کتنے ذہین اور مدبر شخص تھے...... نبی اکرم ﷺ نے اس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو میں اللہ کا رسول ہوں۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''علی! محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھ دو'' (ﷺ)۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ ''حضور! یہ کام میں نہیں کر سکتا۔'' کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کر رہے ہیں کہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نہیں مٹا سکتا۔ مگر ایسا ہرگز نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو حضورؐ کا نام لکھنے کے بعد اسے مٹانا سوءِ ادب خیال کرتے تھے۔

بہرحال حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کیونکہ آپ ﷺ تو اُمی تھے' دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپ نے نہیں سیکھا تھا۔ حضرت علیؓ نے وہ مقام بتایا اور حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا۔

## معاہدہ کی شرائط

اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے لیے بظاہر نہایت سبکی کا

---

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) نہایت شعلہ بیان خطیب بھی تھے لہٰذا انہوں نے اپنے مؤثر و مدلل خطبات کے ذریعہ مکہ والوں کو اس فتنۂ ارتداد سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

Salman Saleem 03067163117

باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ پورے عالم عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمد (ﷺ) کی بات پوری ہوگئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اس سال تو آپ کو یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ البتہ اگلے سال آپ واپس تشریف لے آئیے' ہم تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے۔ ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور مکہ آپ کی Disposal پر ہوگا۔ آپ وہاں رہئے اور عمرہ کیجئے۔ مکہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں، تا کہ کوئی شخص جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ کر بیٹھے۔ اس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے۔ تھیلے احرام کی حالت میں ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپ کے مابین بالکل امن رہے گا' کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن وامان سے رہیں گے اور ان کے مابین بھی جنگ و جدال بالکل نہیں ہوگی...... بنوخزاعہ کے سردار بدیل بن ورقہ نے وہیں پر اعلان کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرا قبیلہ بنوبکر' جس کو بنوخزاعہ سے پرانی دشمنی تھی۔ اس نے فوراً دوسرا رخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رُو سے قریش کے حلیف ہیں...... معاہدہ کی چوتھی شرط مسلمانوں کے لیے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلمانوں کو اسے واپس لوٹانا ہوگا' لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکہ آ جائے گا تو اسے ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ بڑی غیر منصفانہ (Un-equal) شرط تھی جس پر سہیل بن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرامؓ اس پر بڑے جز بز ہوئے اور ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں؟ ہم دب کر اور گر کر کیوں صلح کریں؟ ہم اس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہیں اور ہمیں تو شہادت کی موت مطلوب ہے' ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب

Salman Saleem 03067163117

کلمۂ حق کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب ہیں۔ لہٰذا ہم ان شرائط پر صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا چاہتے ہیں؟ یہ بظاہرِ احوال گر کر اور دب کر صلح کرنے کے مترادف تھا...... صحابہ کرامؓ کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہر بلب تھے۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے جذبات کا کیا عالم ہوگا! یہ وہ وقت ہے کہ دینی حمیت وغیرت کے باعث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اضطراب اتنا بڑھا کہ ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر حضورؐ سے وہ مکالمہ کیا جو سیرت کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی اس کیفیت میں کافی اعتدال آ گیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہی سبب تھا کہ انہوں نے ذرا تیکھے انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر گفتگو کی، جس کا ان رضی اللہ عنہ کو ساری عمر تاسف رہا ہے اور انہوں نے اپنے اس اندازِ گفتگو کے کفارہ کے طور پر نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا: ''یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔'' پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم! پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس اندازِ تخاطب سے آپ قطعاً ناراض نہیں ہوئے تھے۔

## صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور سے تو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن طبیعت میں جو ایک تلاطم، ایک طوفان اور ایک ہیجانی کیفیت تھی وہ برقرار رہی۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جو اس وقت

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ ان سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: ''کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اور کیا محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کہی جو حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ ''پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں؟'' اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ ''بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ وہی کرتے ہیں جس کا آپ کو حکم ہوتا ہے۔'' یہ ہے مقامِ صدیقیت......اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

## ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے اس رویہ پر، جو بظاہر گستاخانہ معلوم ہوتا ہے، ساری عمر پشیمانی اور تاسف رہا اور آپ رضی اللہ عنہ کفارہ کے طور پر ساری عمر متعدد نفلی عبادات کا اہتمام کرتے رہے۔ لیکن ایک خاص گروہ اس واقعہ کو لے اڑا ہے اور اس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متہم کرتا اور سب وشتم کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) بڑے گستاخ تھے۔ اس خاص گروہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لیے اس واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر خوب اچھالا جاتا ہے، مگر وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر اس معنی و مفہوم میں یہ بات لی جائے گی تو گویا بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ اس کی زد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی بھی آ جائے گی کہ انہوں نے بھی اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے حکم سے سرتابی کی۔ حالانکہ دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ''الامر فوق الادب'' یعنی حکم ادب سے بالاتر ہے۔ جب حکم دیا جا رہا ہو تو ادب و تعظیم کا معاملہ پیچھے رہ جائے گا، حکم پر بہرصورت عمل کیا جائے گا......لیکن معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی خلل تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیت میں کوئی فتور۔ ان دونوں جلیل القدر اصحاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے دلوں میں نہ بغاوت و سرتابی کے جراثیم تھے اور نہ ہی گستاخی کا کوئی ارادہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ حمیت حق تھی جس کی وجہ سے حضور ﷺ کے اس فرمان پر کہ ''رسول اللہ'' کا لفظ صلح نامہ سے مٹا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ ''میں تو یہ کام کرنے والا نہیں ہوں'' اور اسی حمیت حق کے سبب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا اندازِ گفتگو اختیار کیا۔ ان دونوں حضرات

کرامؓ کے اس طرزِ عمل پر نبی اکرم ﷺ نے نہ کوئی سرزنش فرمائی نہ ہی اظہارِ ناراضگی و ناپسندیدگی فرمایا، بلکہ حضرت علیؓ سے فرمایا کہ مجھے بتاؤ کہ ''رسول اللہ'' کے الفاظ کہاں مرقوم ہیں اور پھر اپنے دست مبارک سے انہیں مٹا دیا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ حضرت عمرؓ کے تیکھے انداز میں کیے گئے تمام سوالات کے جوابات نبی اکرم ﷺ نے تبسم کے ساتھ ارشاد فرمائے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی علامت ہیں کہ نبی ﷺ ان حضراتِ گرامی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جذبات کی صحیح نوعیت سے بخوبی آگاہ تھے۔

### ابو جندل رضی اللہ عنہ کی آمد

ادھر جذبات کا یہ عالم تھا، ادھر ان سلگتے ہوئے جذبات پر اس واقعہ نے تیل کا کام کیا کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابو جندل رضی اللہ عنہ مکہ میں ایمان لا چکے تھے اور سہیل نے ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ سہیل اور قریش کے دوسرے لوگ ان کو بہت مارا کرتے تھے تاکہ وہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے آبائی بت پرستی کے دین کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ نبی اکرم ﷺ حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہیں جو مکہ سے چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں تڑوائیں اور چھپتے چھپاتے حدیبیہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اس موقع پر ابو جندلؓ وہاں اس حالت میں پہنچے کہ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ وہ آئے اور نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں لیٹ گئے۔ سہیل بن عمرو نے فوراً کہا: یہ ہے پہلا معاملہ صلح کی جو شرائط ہمارے مابین طے ہو چکی ہیں ان کے مطابق آپ ابو جندل کو میرے حوالے کر دیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''شرائط ضرور طے ہو گئی ہیں لیکن تم ان کو تو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو''۔ سہیل نے کہا: ''قطعاً نہیں، اسے آپ کو بہر صورت واپس کرنا ہوگا۔'' حضور ﷺ نے پھر فرمایا ''سہیل تم اس کو یہیں رہنے دو۔'' اس نے فوراً کہا کہ ''پھر ہمیں کوئی صلح نہیں چاہیے، صلح کی شرائط کالعدم سمجھئے اب تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اچھا تم نہیں مانتے تو ٹھیک ہے، صلح کی شرائط باقی رہیں گی، جنگ سے صلح بہتر ہے۔'' ادھر ابو جندلؓ چیخ رہے ہیں اور اب انہوں

Salman Saleem 03067163117

نے خیمہ میں موجود مسلمانوں سے استغاثہ کیا کہ ''مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو؟'' ......اندازہ کیجئے اس وقت جذبات کا کیا عالم ہوگا! سب کے دل مجروح تھے لیکن جوش سے لبریز تھے۔ سینوں میں دل بے تاب تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو تلواریں نیام سے نکل آئیں...... واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کا بڑا کڑا، بڑا شدید اور بڑا نازک امتحان تھا جس سے اللہ تعالیٰ ان کو گزار رہا تھا۔

## نبی اکرم ﷺ کی حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو نصیحت

سہیل بن عمرو کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ابوجندل رضی اللہ عنہ کو سہیل کے حوالہ کر دیا جائے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ابوجندل! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے جو ان حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا' ہم صلح کی شرائط طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں''۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا غیر معمولی طرز عمل

اب جبکہ صلح ہو گئی' اس پر دستخط ہو گئے اور سہیل واپس چلے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''اب اٹھو' قربانی کے لیے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو۔'' اس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا...... ہوا یہ کہ ان میں سے ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب واعضا بالکل شل ہو گئے اور ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی' ان کے دل اس درجہ بجھے ہوئے تھے۔ ان کا جوش وخروش تو یہ تھا کہ وہ جاں نثاری اور سرفروشی دکھائیں اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں وارد ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ○ (الاحزاب: ۲۳)

''اہل ایمان میں کتنے جواں مرد ہیں کہ جنہوں نے جو عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ پس ان میں وہ بھی ہیں جو اپنا ہدیہ جان پیش کر چکے

Salman Saleem 03067163117

(اپنی نذر اللہ کے حضور میں گزار چکے) اور کتنے ہیں جو منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں) اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جو جذباتی کیفیت صادر ہوئی وہ صرف ان دونوں کی نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی تھی۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ یہ منظر ناقابل تصور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے رہے ہیں کہ ''اٹھو! قربانیاں دے کر احرام کھول دو''......اور کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھ رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ حکم دیا کہ ''اٹھو' یہیں قربانیاں کرو اور احرام کھول دو'' مگر پھر بھی کوئی نہیں اٹھا۔ صحابہؓ کے ذہن میں تو یہ تھا کہ ہم مکہ جائیں گے، کعبہ کا طواف اور سعی کریں گے اور پھر قربان گاہ میں قربانیاں کریں گے۔..... جو جانور ساتھ ہیں وہ تو ہدی ہے کعبہ کی...... اب یہاں پر ہم قربانیاں کیسے کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا ''اٹھو' قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو'' مگر کسی نے جنبش نہیں کی۔ یہ اس لیے ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس صورتِ حال کے لیے ذہناً تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی جانیں دینے اور گردنیں کٹوانے کے لیے تو تیار تھے' لیکن جن شرائط پر صلح ہوئی تھی اسے ان کے اعصاب اور مزاج قبول نہیں کر رہے تھے۔

## ام المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کا مدبرانہ مشورہ

روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ اس مرتبہ کون ساتھ جائے گا۔ اس سفر میں ام المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ میں تشریف لے گئے اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے ذکر کیا کہ میں نے مسلمانوں سے تین مرتبہ کہا کہ ''اٹھو قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو'' لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا...... اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ زبان سے کچھ نہ فرمایئے' آپ خیمہ سے باہر تشریف لے جایئے' قربانی دیجیے اور حلق کرا کے احرام کھول دیجیے..... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ پر عمل کیا' باہر تشریف لائے' قربانی دی' سر کے بال منڈوائے اور بعدہ' احرام کھول دیا۔

Salman Saleem 03067163117

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ردِ عمل اور اس کی تاویل

صحابہ کرامؓ نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے، جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

اس صورتِ حال کی تاویل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ پر ابھی تک ایک حالت منتظرہ طاری تھی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شاید صورتِ حال بدل جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آ جائے!!...... جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم ﷺ نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اس وقت تک ان کے ذہنوں میں صورتِ حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے۔ لیکن جب نبی ﷺ نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرامؓ جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے۔ چنانچہ حالت منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے احرام کھول دیئے۔ عمرہ کی جو نیت کی ہوئی تھی اسے اگلے سال کے لیے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور تمام صحابہ کرامؓ نے حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

## یہ صلح کن اعتبارات سے فتح مبین تھی!

اس اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۝ (الفتح:۱) ”بے شک ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کے لیے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرمایا۔“ صلح حدیبیہ کو رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت اس صلح اور معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو ایک ”طاقت“ کی حیثیت سے تسلیم (Recognize) کر لیا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں دراصل یہی بات فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اگر کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے، کیونکہ اس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں، لہٰذا قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور ایک باضابطہ تحریری شکل میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ محمد (ﷺ) عرب کی ایک سیاسی اور عسکری

Salman Saleem 03067163117

طاقت ہیں جن سے انہوں نے صلح کا معاہدہ کیا ہے۔ یعنی قریش کو تسلیم کرنا پڑا کہ محمد (ﷺ) اب ایک ایسی طاقت ہیں جنہیں تسلیم کیے بغیر اب کوئی چارہ کار نہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورۃ الفتح کی درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ط يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ج
(الفتح:۱۰)

"بیشک جو لوگ (اے محمد ﷺ) آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (درحقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر......"

اور

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:۱۸)

"(اے نبیؐ) تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے آپ سے درخت کے نیچے......"

اور (احتیاط)

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ج لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ط
(الفتح:۲۷)

"بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے' بے کھٹکے۔"

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہل ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہل ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے' اللہ تعالیٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل مسرت و شادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے پہلے خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کو بتایا کہ یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے پہلے تو کچھ تعجب کا اظہار کیا لیکن جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا ہے تو ان کے دل بے قرار کو بھی قرار آ گیا اور وہ بھی

Salman Saleem 03067163117

شاداں وفرحاں ہو گئے۔

## حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا دوسرا اقدام

نبی اکرم ﷺ نے معاہدہ کی شرط کے مطابق اور سہیل بن عمرو کے اصرار پر ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کفار کے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی قید سے دوبارہ نکلے۔ مدینہ منورہ تو اس لیے نہیں گئے کہ انہوں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ تو معاہدہ کی وجہ سے پابند ہیں لہٰذا آپ تو مجھے دوبارہ واپس بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بحیرۂ احمر کا رخ کیا اور ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اس کے بعد ایک اور صحابی عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ' جو اپنی کنیت ابو بصیر کے حوالے سے زیادہ مشہور ہیں' وہ بھی مکہ والوں کی قید سے چھٹکارا پا کر مدینہ پہنچے۔ ان کے مدینہ پہنچتے ہی مکہ سے دو اشخاص ان کے پیچھے پہنچے اور حضور سے مطالبہ کیا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو اپنے معاہدے کی رو سے ہمارے حوالے کیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو واپس جانے کا حکم دیا اور انہیں ان دونوں ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ ابھی یہ تینوں ذوالحلیفہ ہی پہنچے تھے کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے موقع پا کر انہی دو میں سے ایک کی تلوار پر قبضہ کر کے اس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا مدینہ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ والا حضور ﷺ سے فریاد کر رہا تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کیا: حضور آپ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، میں نے تو اب ایک کو قتل کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پھر کہیں جنگ کی آگ نہ بھڑکا دے' کوئی ہے جو اس کو قابو میں کرے! یہ سننا تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ وہاں سے بھاگے اور مدینہ سے نکل کر بحر احمر کے ساحلی جنگل میں جا کر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ اس کے بعد جب مکہ کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جان بچانے کا ایک دوسرا ٹھکانہ بن گیا ہے تو چوری چھپے مکہ سے فرار ہو کر مدینہ کا رخ کرنے کے بجائے یہاں پناہ کے لیے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش کے ان تجارتی قافلوں پر جو شام کے لیے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے حملے شروع کر دیئے اور قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ مدینہ میں تو تھے نہیں لہٰذا حضور ﷺ کی صلح کی شرائط کے پابند نہیں تھے۔ تجارتی قافلوں

Salman Saleem 03067163117

کے یہ راستے قریش کی معیشت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے حملوں اور لوٹ مار کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریش کا ایک وفد ان کی طرف سے تحریر لے کر مدینہ آیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں۔ اب مکہ سے جو بھی آپ کے پاس مدینہ آ کر آباد ہونا چاہے وہ آ سکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپ ابو جندل' ابو بصیر اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیجئے.... حضور ﷺ نے ان کو فرمان بھیجا اور وہ سب کے سب مدینہ آ کر آباد ہو گئے اور قریش کے قافلوں کا راستہ بدستور محفوظ و مامون ہو گیا۔

الغرض کہ صلح کی اس شق سے جو اہل ایمان کو سب سے زیادہ شاق گزری تھی، خود قریش کو تائب ہونا پڑا۔ گویا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (الفتح:1) کا ایک نظارہ بہت ہی جلد مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا...... اور نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو واپس کرتے ہوئے جو الفاظ مبارکہ فرمائے تھے کہ {یا اباجندل اصبر واحتسب فان الله جاعل لك ولمن معك من المستضعفين فرجا ومخرجا} "اے ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو' اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ دوسرے ضعیفوں اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکال دے گا" تو نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ایک حقیقی واقعہ کی شکل میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

## صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس صلح کے بعد نبی اکرم ﷺ کو یکسو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحابِ صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی حضور ﷺ نے ان کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید برآں اب تک مسلمانوں اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اٹھ گئی تو آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات اور روابط کی وجہ سے کفارِ مکہ مدینہ منورہ آتے، وہاں طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ اس طرح مسلمانوں سے میل جول رہتا اور باتوں باتوں میں اسلام کی دعوت توحید اور دیگر عقائد و مسائل کا تذکرہ اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسن عمل کا پیکر' نیکوکاری' حسن معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے' ان کی صورتیں' ان کے اعمال' ان

کے اخلاق اوران کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے مشرکین مکہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

## خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے ''فتح مبین'' قرار دیا ہے لیکن یہ اجسام کی نہیں قلوب کی فتح و تسخیر کا معاملہ تھا۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی فتح ہے۔ صلح حدیبیہ سے قبل قریش اور اہل ایمان کے مابین ہونے والے معرکوں میں قریش کی صفوں میں ایک جنگجو اور باصلاحیت شہسوار کی حیثیت سے خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنگ کے دوران گھڑسوار دستوں کی قیادت انہی کے سپرد رہتی تھی۔ غزوۂ احد کے موقع پر ان ہی کی تدبیر سے قریش کی شکست فتح میں بدل گئی تھی اور مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش نے گھڑسواروں کا ایک دستہ ان کی زیر کمان نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ آپ ﷺ کو اطلاع مل گئی اور آپ نے راستہ بدل دیا' ورنہ خالد بن ولید تو حضور کا راستہ روکنے کے لیے رابغ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا۔ صحابہ کرامؓ نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈال رکھے تھے۔ خالد بن ولید کو جب پتہ چلا تو وہ بھی اپنے گھڑسواروں کے دستہ کے ساتھ پلٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر خالد بن ولید کی طرف سے ایک انوکھے طرزِ عمل کا مظاہرہ ہوا۔ یہ ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں صحابہ کرامؓ میں سے دو اڑھائی سو کی نفری فروکش تھی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح یہ اہل ایمان مشتعل ہو جائیں اور کسی مسلمان کا ایک مرتبہ ذرا ہاتھ اٹھ جائے۔ قریش کی کچھ روایات تھیں جن سے انحراف خالد کے لیے ممکن نہ تھا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ احرام کی حالت میں تھے اور ان کی قدیم روایات چلی آ رہی تھیں کہ محرم پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے' اس لیے خالد بن ولید جنگ کی پہل نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے اشتعال انگیزی کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ اپنے گھوڑے لے کر بار بار

Salman Saleem 03067163117

صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس جماعت پر ایسے چڑھ چڑھ کر آئے جیسے ان کو گھوڑوں کے سموں سے کچل دیں گے۔ انہوں نے کئی بار اس عمل کو دہرایا لیکن جو حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرامؓ اس پر کاربند رہے۔ نہ کوئی ہراساں ہوا' نہ کوئی بھاگا اور نہ ہی کسی نے مدافعت کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ نظم وضبط کے اس مشاہدہ کا خالد بن ولید پر اتنا گہرا اثر ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے اور ان کا گھائل دل بالآخر مسخر ہوا' جس کا ظہور صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور وہ مشرف بہ ایمان ہونے کے لیے عازمِ مدینہ ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد یہی خالد بن ولید "سیف من سیوف اللہ" قرار پائے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ جب سوئے مدینہ چلے تو راستہ میں حضرت عمرو بن العاص مل گئے جو قریش کے ایک اعلیٰ مدبر' شجاع و دلیر اور فنونِ حرب کے بہت ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ یہی وہ صاحب تھے جن کو ۵ نبوی میں حبشہ ہجرت کر جانے والے مہاجرین کی بازیابی کے لیے قریش نے سفیر بنا کر جنابِ نجاشیؒ کے دربار میں حبشہ بھیجا تھا۔ حضرت خالدؓ نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے؟ بولے: اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ جا رہا ہوں۔ میرے دل نے تسلیم کر لیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے آخری رسول برحق ہیں اور اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ حضرت خالدؓ نے کہا: اپنا بھی یہی حال ہے...... چنانچہ قریش کے یہ دونوں مایہ ناز اور جلیل القدر فرزند بارگاہِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے، اور اس طرح وہ جوہر جو اس وقت تک اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا' اب اسلام کی محبت اور اس کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے دورِ نبوت اور بعد ازاں دورِ خلافتِ صدیقی و فاروقی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک بھلائے نہیں جا سکتے۔ اول الذکر کا دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ صدیقی میں فتنہ ارتداد کی سرکوبی میں انہوں نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح کسریٰ پر ابتدائی کاری ضرب انہی کے ہاتھوں لگی اور انہی کے ہاتھوں قیصر کی سلطنت میں سے شام کا ملک اسلامی قلمرو میں شامل ہوا اور آخر الذکر مصر کے فاتح ہوئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دو عظیم انسانوں کا قبولِ اسلام دراصل صلح حدیبیہ ہی کے ثمرات کا مظہر تھا۔

اس صلح حدیبیہ کے ثمرات و فوائد بہت سے ہیں' مختصراً یہ کہ درحقیقت یہ صلح حدیبیہ ہی

فتح مکہ کی تمہید بنی۔ نبی اکرم ﷺ کو ۶ھ سے ۸ھ تک امن وسکون کے جو دو سال ملے اس میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہوگئی۔

## بیرونِ عرب دعوتی خطوط کی ترسیل

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے آپ نے بیرونِ عرب نہ کوئی نامہ مبارک لکھا اور نہ ہی کوئی ایلچی بھیجا۔ ۷ھ تک حضورؐ کی تمام دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ میں حضور ﷺ نے دعوتی سرگرمیاں عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائیں اور آپ نے مختلف صحابہ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف وجوانب میں تمام سربراہانِ سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

صلح حدیبیہ کے بعد اب حضور ﷺ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں۔ ایک اندرونِ ملک عرب اور دوسری بیرونِ ملک عرب۔

## ادائے عمرہ

اگلے سال ذیقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے عمرۂ قضا ادا فرمایا۔ آپ نے اعلان کرا دیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، سب کے سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے آپ کی پکار پر لبیک کہا اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرط کے مطابق نبی اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ کے جلو میں حالت احرام میں مکہ تشریف لائے۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باآواز بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ نبی اکرم ﷺ کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ ان اشعار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے:

خلوا بني الكفار عن سبيله　　اليوم نضربكم على تنزيله
ضرباً يزيل الهام عن مقيله　　ويذهل الخليل عن خليله

Salman Saleem 03067163117

''کافرو! آج سامنے سے ہٹ جاؤ۔ آج تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہِ سر سے الگ کر دے اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شاد کام ہو رہے تھے اور عمرہ ادا کرنے کی تمنا و آرزو کو پورے جوش و خروش اور چشم تر سے بجا لا رہے تھے۔ شرط کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم تین دن تک مکہ میں مقیم رہے۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکہ سے نکل گئے کہ نہ ہم اہل ایمان کو دیکھیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو۔ لہٰذا وہ سب کے سب پہاڑوں پر چلے گئے۔

## قریش کی شکست خوردگی

حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید نقصان پہنچا تھا، کیونکہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی، مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش کے ہاتھ میں تھی۔ گویا باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہرِ احوال درحقیقت (de facto) قریش کو پورے عرب پر ایک نوع کی حکمرانی حاصل تھی۔ اگرچہ کوئی باضابطہ اعلان شدہ (Declared) حکومت نہیں تھی اور کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین موجود نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہاں قبائلی نظام تھا، لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے مطابق معاملہ چل رہا تھا۔ جیسا کہ آج تک برطانیہ کا کوئی تحریری دستور (Written Constitution) موجود نہیں ہے بلکہ روایات کی بنیاد پر ان کا معاملہ چل رہا ہے، کم و بیش یہی معاملہ اہل عرب کا تھا، جس کی رو سے گویا قریش عرب کے حکمران تھے...... کعبۃ اللہ کے باعث مذہبی سیادت ان کے پاس تھی۔ معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال تھے۔ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ ہر قبیلہ کا ''خدا'' بت کی شکل میں بطور یرغمال قریش کے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قریش کو پورے عرب پر جو سیادت و قیادت حاصل تھی وہی اسلامی انقلاب کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا یہ وجہ تھی کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ ان ہی کے خلاف اقدامات فرمائے۔

(بحوالہ ''منہج انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'')

Salman Saleem 03067163117

# سرزمین عرب سے یہود کا انخلاء

## یہودیوں کے تین قبیلے

نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت وہاں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ۔ حضور ﷺ نے مدینہ تشریف لاتے ہی انہیں ایک معاہدہ میں جکڑ لیا تھا[1]۔ اس معاہدے کی وجہ سے یہ قبیلے کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے، لیکن وہ پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ مدینہ میں فروغِ اسلام اور انصار کے دونوں قبیلوں اور مہاجرین کو باہم شیر وشکر دیکھ کر صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنا شروع ہوا۔ پھر شعبان ۲ھ میں تحویل قبلہ کے واقعہ نے ان یہودیوں کو سخت برہم کر دیا اور ان کی ناراضگی کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ چنانچہ اب وہ کھلم کھلا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرنے اور انصار کو دین اسلام سے بدگمان اور برگشتہ کرنے کی مہم زور شور سے چلانے لگے۔ اس سے قبل یہ کام وہ دھیمی رفتار سے کرتے رہتے تھے۔

---

(۱) "ابن ہشام" نے یہ پورا معاہدہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا (۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی معاملات سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ (۳) یہود اور مسلمان دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ (۴) یہود یا مسلمانوں کو کسی بیرونی فریق سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔ (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔ (۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق ایک دوسرے کے شریک ہو کر جنگ کریں گے (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی اس صلح میں شریک ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

## بنو قینقاع کا معاملہ

غزوۂ بدر کے متصلاً بعد شوال ۲ ھ میں بنو قینقاع کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یہ پیشے کے اعتبار سے زرگر تھے اور ان کے پاس جنگی اسلحہ بہت تھا۔ دوسرے یہودی قبیلوں کے مقابلہ میں یہ جری، بہادر اور شجاع بھی تھے۔ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکے۔ غزوۂ بدر کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اقدام کیا اور اعلانِ جنگ کی جرأت کی۔ ہوا یہ کہ ایک انصاری ؓ کی نقاب پوش بیوی بنو قینقاع کے ایک یہودی کی دکان پر آئیں تو یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو آپ ﷺ بنفسِ نفیس ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح تم بھی عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ۔'' جواب میں یہودیوں نے کہا کہ ''ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی کس شے کا نام ہے اور ایسا ہی ہے تو ہم اعلانِ جنگ کرتے ہیں، دنیا دیکھ لے گی کہ بہادر کون ہے!'' اس طرح ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہو گیا۔ مجبور ہو کر نبی کریم ﷺ نے ان پر چڑھائی کی۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ بھی کریں گے انہیں قبول ہو گا۔ حضور ﷺ نے نرمی اور رافت سے کام لیا اور فیصلہ فرمادیا کہ وہ اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں، وہ اب مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ مال واسباب لے کر جلا وطن ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے جو مدینہ سے دو سو میل شمال کی طرف یہودیوں کا ایک بہت مضبوط گڑھ تھا۔ یہ بڑا سرسبز اور زرخیز علاقہ تھا۔

## بنو نضیر کا معاملہ

غزوۂ احد کے بعد اسی نوع کا معاملہ ربیع الاول ۴ ھ میں یہود کے دوسرے قبیلے

بنو نضیر کے ساتھ ہو گیا۔ یہ قبیلہ عرب کے ایک مضبوط قبیلہ ''طے'' کا حلیف تھا۔ قبیلہ طے کے اشرف نے اس یہودی قبیلہ کے سردار ابو رافع کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ابو رافع کا لقب تاجر الحجاز تھا، کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔ کعب اسی اشرف کا بیٹا اور ابو رافع کا نواسہ تھا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی وجہ سے اس کا یہود اور عرب سے برابر کا تعلق تھا۔ یہ بڑا قادر الکلام شاعر تھا، جس کی وجہ سے اس کا اثر گہرا تھا۔ کعب بن اشرف کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ بدر میں قریش کے سرداروں کے قتل ہونے کا اسے نہایت صدمہ تھا۔ چنانچہ یہ مکہ گیا اور مقتولین بدر کے پُر درد مرثیے پڑھے جن میں انتقام کی ترغیب تھی۔ وہ یہ مرثیے بہت سوز کے ساتھ پڑھتا، خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔ الغرض قریش کو مدینہ پر انتقامی طور پر چڑھائی کرنے کی ترغیب میں اس نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ پھر جب وہ مدینہ واپس آیا تو نبی کریم ﷺ کی ہجو کہنے لگا اور یہودیوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی دولت مندی کے بل پر منافقین کو اپنا ہم خیال بنانے لگا اور ضعیف الایمان لوگوں پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سازش تیار کی کہ چپکے سے نبی اکرم ﷺ کو قتل کرا دے۔ چنانچہ اس نے ایک روز آپ ﷺ کو دعوت میں بلایا اور اپنے چند لوگوں کو مقرر کر دیا کہ وہ یک بارگی حملہ کر کے حضور ﷺ کو شہید کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے نبی ﷺ کو اس سازش سے مطلع فرما دیا۔ اس کی فتنہ انگیزی کو دیکھ کر حضرت محمد بن مسلمہؓ نے اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے بنو نضیر میں غیظ و غضب کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔

مزیں برآں وادیٔ نخلہ میں قبیلہ بنو عامر کے جو دو اشخاص قتل ہوئے تھے ان کا خون بہا ابھی تک واجب الادا تھا۔ اس کا ایک حصہ معاہدے کی رو سے یہود کے قبیلے بنی نضیر پر باقی تھا۔ اس کے مطالبہ کے لیے نبی اکرم ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد بظاہر حضور ﷺ کی بات تسلیم کر لی۔ لیکن انہوں نے در پردہ ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا کہ وہ چپکے سے حضور ﷺ پر بالا خانہ سے پتھر گرا دے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ بالا خانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے گفتگو فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ کو

Salman Saleem 03067163117

اس سازش کا علم ہو گیا اور آپ ﷺ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔

ادھر قریش کی جانب سے بنونضیر کے پاس پیغام پر پیغام آ رہے تھے کہ تم محمد (ﷺ) کو قتل کر دو، ورنہ ہمیں جب بھی موقع ملا، جو ضرور مل کر رہے گا، تو ہم تمہارے قبیلہ کو تہ تیغ کر دیں گے۔ یہود خود بھی نبی اکرم ﷺ کی دعوتِ توحید کا فروغ دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے ایک سازش کے تحت نبی اکرم ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ اپنے تیس اصحاب کو ساتھ لے کر آئیں، ہم بھی اپنے علماء و احبار کو جمع کر رکھیں گے۔ آپ ﷺ کی دعوت اور آپ ﷺ پر نازل شدہ کلامِ الٰہی سن کر اگر ہمارے علماء تصدیق کر دیں گے تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک نیا معاہدہ لکھ کر نہ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن بنونضیر اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ بنوقریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی فرمائش کی۔ انہوں نے تعمیل کر دی۔ اب بنونضیر کے سامنے گویا ایک نظیر موجود تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح دوبارہ معاہدہ کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر کار انہوں نے پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی اپنے تین عالم لے کر آتے ہیں اور کسی درمیانی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپ ﷺ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ اس کے لیے تیار ہو گئے، لیکن راستے ہی میں آپ ﷺ کو باوثوق ذریعہ سے اطلاع مل گئی کہ بنونضیر نے خفیہ طور پر انتظام کر رکھا ہے کہ آپ ﷺ جب مقررہ مقام پر پہنچیں تو یکبارگی اور اچانک حملہ کر کے آپ ﷺ کو شہید کر دیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے کے بعد حضور ﷺ راستہ ہی سے واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ نے پھر ان کو پیغام بھیجا کہ یا تو تجدید معاہدہ کر لو یا اپنے سرکردہ علماء کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ لیکن بنونضیر نے صاف انکار کر دیا۔

بنونضیر کی اس سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ دو مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جہاں اجناس، پانی اور اسلحہ کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ عبداللہ ابن اُبی نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ ہم (یعنی منافقین) اور بنوقریظہ تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے، لہٰذا تم

اطاعت نہ کرنا۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے ان کو زیادہ مہلت دینی مناسب نہیں سمجھی اور ان کے قلعوں پر چڑھائی کر دی۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ بنو نضیر اس انتظار میں رہے کہ عبداللہ ابن اُبی اور بنو قریظہ اپنا وعدہ وفا کریں گے، لیکن دونوں دم سادھے تماشا دیکھتے رہے۔ بالآخر بنو نضیر نے یہ پیش کش کی کہ ہمارے ساتھ بھی بنو قینقاع والا معاملہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی رافت و رحمت نے یہ پیش کش منظور فرمالی۔ بنو نضیر اپنی گڑھیوں سے اس شان سے نکلے کہ جشن کا گمان ہوتا تھا۔ عورتیں دف بجاتی اور گاتی جاتی تھیں۔ الغرض ان کے قبیلہ کے اکثر لوگ بھی خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ خیبر والوں نے ان کے دو معزز سرداروں کا اتنا احترام کیا کہ انہیں خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ درحقیقت غزوۂ خیبر کا دیباچہ ہے۔

## بنو قریظہ کا معاملہ

اب مدینہ میں یہود کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ باقی رہ گیا تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر، جو ذوالقعدہ ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا، اس قبیلے نے غداری کی۔ بنو نضیر کے سرداروں نے خیبر میں بیٹھ کر قریش اور مدینہ کے اطراف کے غیر مسلم قبائل سے ساز باز کی اور ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا جس کے نتیجہ میں بارہ ہزار کا لشکر جرار تین اطراف سے مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھ دوڑا۔ اس سے بڑا لشکر عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی ترتیب پایا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے جبلِ اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھُدوا کر مدافعانہ جنگ کے انتظامات فرما لیے تھے۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ صرف انہی اطراف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں شدید جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرہ پر مجبور ہونا پڑا۔ اب ان کے لیے ایک چارۂ کار باقی رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کو مدینہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ پر آمادہ کر لیں۔ چنانچہ بنو نضیر کے سرداروں نے بنو قریظہ کو نقضِ عہد پر آمادہ کر لیا اور وہ پشت سے حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔

Salman Saleem 03067163117

نبی اکرم ﷺ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ ادھر منافقین کا گروہ بھی مسلمانوں میں خوف وہراس پیدا کرنے کے لیے یہ افواہیں پھیلا رہا تھا کہ بنوقریظہ کی طرف سے حملہ ہوا ہی چاہتا ہے جس کی زد میں پہلے ہماری عورتیں اور بچے آئیں گے جو شہر میں بنوقریظہ کی گڑھیوں کے قریب ہی پناہ گزین تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے دو انصاری صحابہؓ کو بنوقریظہ کے عزائم معلوم کرنے اور ان کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ بنوقریظہ نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "لا عقد بیننا و بین محمد" یعنی ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین جو معاہدہ تھا وہ ختم ہوا۔ مزید یہ کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی شان میں بڑے گستاخانہ کلمات کہے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کے ایک صاحب نعیم بن مسعودؓ جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور وہ غطفان کی طرف سے ان کے لشکر میں شریک تھے، انہوں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ بنوقریظہ اور قریش کے درمیان ایک نوع کی بدگمانی پیدا ہوگئی، جس کی وجہ سے بنوقریظہ غداری کے لیے اپنی تمام تیاریوں کے باوجود تذبذب میں رہے اور کوئی اقدام نہ کرسکے۔ اس دوران ایک رات اللہ کی مدد زوردار آندھی کی صورت میں نازل ہوئی جس نے قریش اور ان کے حلیفوں کے خیموں اور سازوسامان کو تہس نہس کرڈالا۔ نتیجتاً صبح ہوتے ہی تمام لشکر منتشر ہوگیا اور تمام قبائل بے نیلِ مرام واپس چلے گئے۔

لشکروں کی واپسی کے بعد نبی اکرم ﷺ ابھی ہتھیار کھول ہی رہے تھے کہ حضرت جبریلؑ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ ﷺ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ ﷺ فوراً تشریف لے جاکر بنوقریظہ کے معاملے کو نمٹائیے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ بنوقریظہ کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے، لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اسی وقت حکم دیا کہ کوئی بھی مسلمان ہتھیار نہ کھولے، سب کے سب جلد از جلد بنوقریظہ کی بستی میں پہنچیں اور کوئی بھی عصر کی نماز وہاں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

Salman Saleem 03067163117

### بنوقریظہ کا انجام

بنوقریظہ کے قلعے بڑے مضبوط تھے، جن میں وہ محصور ہو گئے۔ قریباً ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر تنگ آ کر انہوں نے ازخود اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہری کی کہ ان کے معاملے میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم مقرر کیا جائے، وہ جو بھی فیصلہ کریں گے تسلیم کر لیا جائے گا۔ قبیلہ اوس ان کا حلیف رہا تھا اور ان کے مابین مدتوں سے خوشگوار تعلقات چلے آ رہے تھے، لہٰذا ان کو توقع تھی کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کا لحاظ کریں گے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ احزاب میں ایک تیر لگنے کی وجہ سے شدید زخمی تھے اور حضور اکرم ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا اور ان کے زخم کو خود اپنے دستِ مبارک سے داغا تھا، انہیں ایک ڈولی میں بنوقریظہ کی بستی میں لایا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تورات کی رُو سے یہود کی شریعت کے عین مطابق یہ فیصلہ کیا کہ بنوقریظہ کے لڑائی کے قابل تمام مرد قتل کیے جائیں، عورتوں، بچوں اور دیگر مردوں کو غلام بنایا جائے اور ان کے مال واسباب کو مالِ غنیمت قرار دیا جائے [1]۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ان کے کئی سو جوان قتل کیے گئے اور عورتوں بچوں اور دیگر عمر رسیدہ مردوں کو غلام بنا لیا گیا، جبکہ ان کا مال واسباب مالِ غنیمت قرار دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ بنوقریظہ اگر رسول اللہ ﷺ کو حکم تسلیم کر لیتے اور اپنا معاملہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں دے دیتے تو یقیناً آپ ﷺ اپنی رأفت ورحمت کی وجہ سے وہی فیصلہ فرماتے جو

---

(۱) تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

"جب کسی شہر پر حملہ کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں، سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لیے مالِ غنیمت ہوں گے۔" (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

بنوقینقاع اور بنونضیر کے حق میں فرمایا تھا، لیکن مشیت الٰہی یہی تھی، لہٰذا ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ جیسے رؤف و رحیم رسول پر عدم اعتماد کیا۔ چنانچہ حُییَ بن اخطب جو ان تمام فتنوں کا باعث تھا، کے جو آخری الفاظ کتبِ سیرتِ مطہرہ میں ملتے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ "لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ایک حکم الٰہی تھا جو لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھ دی تھی۔" نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہے، جو بنوقریظہ کے ساتھ پیش آیا۔

## فتح خیبر

خیبر پہلے سے ہی عرب میں یہود کا مضبوط ترین گڑھ تھا۔ بنوقینقاع اور بنونضیر کے بہت سے لوگ بھی وہیں جا مقیم ہوئے۔ اس طرح یہود کی قوت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر قریش اور دوسرے عرب قبائل کا مدینہ پر اتنی بڑی تعداد میں لشکرکشی کرنے میں خیبر کے یہودی سرداروں کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا۔ بارہ ہزار کے لشکر میں کم و بیش دو ہزار یہودی بھی شامل تھے۔ پھر بنوقریظہ کو نقضِ عہد اور پشت سے مسلمانوں کو پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لیے آمادہ کرنے میں بھی انہی یہودی سرداروں کی کوششوں کا فیصلہ کن دخل تھا۔ الغرض عرب کے قبائل خصوصاً قریش کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے میں خیبر کے سردارانِ یہود ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

ذوالقعدہ ۶ھ میں جب قریش سے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کے لیے صلح ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو ۶ھ کے اواخر میں آپؐ نے جزیرہ نمائے عرب میں یہود کی اس طاقت کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا جو خیبر کے مقام پر مجتمع ہوگئی تھی۔ قبیلہ غطفان جس کا شمار بھی عرب کے مضبوط قبائل میں ہوتا تھا، کی آبادی خیبر سے متصل واقع تھی اور یہ کافی عرصہ سے خیبر کے یہود کے حلیف تھے۔ خیبر کے رئیس ابورافع سلام نے جو بنونضیر سے تعلق رکھتا تھا، لیکن بہت بڑا تاجر اور صاحبِ ثروت ہونے کے باعث خیبر کی سرداری پر فائز تھا، ۶ھ میں خود جا کر قبیلہ غطفان اور آس پاس کے قبائل کو متحد

Salman Saleem 03067163117

ہوکر اسلام کے خلاف اقدام کے لیے تیار کرلیا تھا اور ایک عظیم لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرلی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ رمضان ۶ ھ میں ابورافع سلام ایک خزرجی انصاریؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد خیبر کا اُسیر نامی ایک یہودی مسند سرداری پر فائز ہوا۔ اس نے بھی ابورافع سلام کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے پوری تیاری کرلی۔ پھر مدینہ کے منافقین بھی یہودِ خیبر کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے کہ مسلمان تمہاری فوجوں کے آگے نہیں ٹھہر سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے کوشش فرمائی کہ یہودِ خیبر سے کوئی معاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ نے صلح حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں کئی سفارتی وفود خیبر کے یہود کے پاس بھیجے لیکن وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مدینہ کے باہر متفرق چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر تاخت کرتے اور غارت گری کے بعد بھاگ جاتے۔ بالآخر نبی اکرم ﷺ نے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے مقصد کے پیش نظر ذوالحجہ ۶ ھ میں مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن خیبر کا معرکہ ۷ ھ کے اوائل میں پیش آیا، کیونکہ اس غزوہ نے کافی طول کھینچا۔ خیبر میں یہود کی بڑی قوت مجتمع تھی، جہاں یکے بعد دیگرے ان کے بڑے مضبوط قلعے تھے۔ چنانچہ ہر قلعہ پر زبردست جنگ ہوئی۔ آخری مضبوط ترین قلعہ (قموص) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ یہود کے بڑے بڑے سردار ان معرکوں میں مارے جا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کامل شکست تسلیم کرلی۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب سے یہود کی عسکری قوت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

فتح کے بعد مفتوحہ علاقہ پر قبضہ کرلیا گیا، لیکن یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضہ میں اس شرط کے ساتھ رہنے دی گئی کہ وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ جب بٹائی کا وقت آتا نبی اکرم ﷺ اپنے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو بھیجتے، جو آکر غلہ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرکے یہود سے کہا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق تمہیں حاصل ہے، جو حصہ چاہو تم لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہوکر کہتے تھے کہ ”زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔“

Salman Saleem 03067163117

غزوۂ خیبر پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلموں کو رعایا بنایا گیا۔ گویا صلح حدیبیہ اور یہود کا رعیت کی حیثیت قبول کرنا اس بات کی علامات میں شامل ہیں کہ اسلامی طرزِ حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو گئی اور اس کا عملی ظہور بھی شروع ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں وصیت فرما گئے تھے کہ یہود جزیرہ نمائے عرب میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مدعیانِ نبوت، مانعینِ زکوٰۃ اور فتنہ ارتداد سے کامل طور پر نمٹنے میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس معاملہ کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ خلافتِ صدیقی کے دَور ہی میں یہ تمام فتنے ختم ہو چکے تھے، لیکن ساتھ ہی توحید کی اس انقلابی دعوت کی توسیع کے عمل کا بیرونِ ملک عرب آغاز ہو چکا تھا اور قیصر و کسریٰ سے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جزیرہ نمائے عرب سے یہود کے مکمل اخراج کا معاملہ دورِ خلافت صدیقی کے بجائے دورِ خلافت فاروقی کے آغاز میں شروع ہوا اور ایک قلیل عرصہ میں تمام یہود جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی اور ان کو کامل آزادی دی گئی کہ وہ اپنا جملہ منقولہ ساز و سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب یہود جیسی سازشی قوم کے وجود سے پاک ہو گیا۔

صلح حدیبیہ کی بدولت قریباً دو سال تک قریش اور اہل ایمان کے مابین امن رہا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے شہروں میں آتے جاتے رہے اور ان کے مابین روابط قائم ہوئے۔ کفار و مشرکین اہل ایمان کی پاکیزہ سیرت و کردار سے متاثر ہوتے رہے۔ اس دوران اسلام کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے مردانِ شجاعت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

Salman Saleem 03067163117

# صلح حدیبیہ کا خاتمہ اور فتح مکہ

## بنوخزاعہ پر بنوبکر کی تاخت

صلح حدیبیہ کے موقع پر ہی بنوخزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے حریف بنوبکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں مدت سے عداوت چلی آ رہی تھی اور ان کے مابین لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں۔ صلح حدیبیہ کے باعث قریش اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہو گیا تو بنوبکر نے سوچا کہ اب بنوخزاعہ سے انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنوخزاعہ پر رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کر دیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قریش کے چند بڑے بڑے سرداروں نے بھی بھیس بدل کر بنوبکر کا ساتھ دیا اور اس طرح اس حملے کے نتیجے میں بنوخزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن بنوبکر کے رئیس نوفل کے اکسانے پر وہاں بھی انہیں نہیں چھوڑا گیا اور عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

## صلح حدیبیہ کا خاتمہ

نبی اکرم ﷺ مسجد نبویؐ میں رونق افروز تھے کہ بنوخزاعہ کے چالیس افراد فریاد کرتے اور دہائی دیتے ہوئے وہاں پہنچے کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے، اب صلح حدیبیہ کی رُو سے اے محمد (ﷺ) آپؐ اس کے پابند ہیں کہ ہمارا بدلہ بنوبکر اور قریش سے لیں (۱) نبی

---

(۱) طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس وفد کے قائد کا نام عمرو بن سالم تھا اور اس نے ان الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں فریاد پیش کی تھی۔

| | |
|---|---|
| لاھم انی ناشد محمدا<br>حلف ابینا وابیہ الاتلدا<br>فانصر رسول اللہ نصرا عتدا<br>وادع عباد اللہ یاتوا مددا | اے اللہ! میں محمد (ﷺ) کو وہ وعدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ ہماری اعانت کیجئے اور اللہ کے بندوں کو پکاریئے، سب مدد کے لیے حاضر ہوں گے۔ (مرتب) |

Salman Saleem 03067163117

اکرم ﷺ کو یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ تاہم حضور ﷺ نے قریش پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کر دو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ تا کہ ہم بنوخزاعہ کے ساتھ مل کر بنو بکر سے بدلہ لے لیں۔ تیسری یہ ہے کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو اعلان کر دو کہ صلح حدیبیہ ختم ہو گئی۔

قریش کے جو مشتعل مزاج اور جنگ پسند لوگ (Hawks) تھے، انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے قاصد کی زبانی آپ ﷺ کی شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بس آج سے صلح حدیبیہ ختم!! حضور ﷺ کے ایلچی یہ جواب سن کر مدینہ واپس چلے گئے۔

## تجدید صلح کے لیے ابوسفیان کی کوششیں

قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کے مدبر اور صلح پسند لوگوں (Doves) کو غلطی کا احساس ہوا۔ ان کو خوب اندازہ تھا کہ اب محمد ﷺ کی طاقت کتنی ہے اور قریش کا حال کیا ہے! ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ قریش کسی صورت میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ کر سکیں۔ اُس وقت ابوسفیان کو قریش کے سردار کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ بہت حقیقت پسند انسان تھے، جذباتی اور مشتعل مزاج نہیں تھے، بلکہ ایک ایسے مدبر انسان تھے جو حقیقی صورتِ حال کا اندازہ کر کے اس کے مالہٗ وما علیہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چند جوشیلے لوگوں نے جذبات میں آ کر بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے، اگر ہم نے صلح حدیبیہ کی تجدید نہ کرائی تو پھر قریش کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی۔ چنانچہ وہ خود چل کر تجدید صلح کی غرض سے مدینہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں تجدید صلح کی درخواست کی، لیکن بارگاہِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان کو کوئی ایسی سفارش درکار تھی جو تجدید صلح کی کوشش میں ان کی معاون ہو۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن دونوں نے

Salman Saleem 03067163117

کانوں پر ہاتھ رکھا۔ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک فرمایا: "بھلا میں تم لوگوں کے لیے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کروں گا؟ خدا کی قسم اگر مجھے لکڑی کے ٹکڑے کے سوا کچھ دستیاب نہ ہوتو میں اسی کے ذریعے تم لوگوں سے جہاد کروں گا۔" پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے حضرت فاطمہؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بچہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا، اور اس بچہ کے یہ کہہ دینے سے نہ معلوم کتنی جانیں بچ جائیں گی۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا: بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟

بالآخر ابوسفیان ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے۔ حضرت اُم حبیبہؓ سابقون الاولون میں سے تھیں اور مہاجرین حبشہ میں سے تھیں، جہاں وہؓ اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھیں جو ایمان لا چکے تھے۔ وہ شراب کے بہت رسیا تھے۔ حبشہ جا کر وہ مرتد ہو گئے اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا اُم حبیبہؓ ان کے عقد نکاح سے آزاد ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور نجاشیؒ نے حضور ﷺ کے وکیل کی حیثیت سے نکاح پڑھایا تھا اور ان کا مہر ادا کیا تھا۔ بعدہ وہ اُم المومنینؓ کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لے آئی تھیں۔ اب ابوسفیان کی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ رسول اللہ ﷺ کے حرم میں تھیں۔ ابوسفیان ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے پاس پہنچے تا کہ بیٹی سے سفارش کرائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ ان کے حجرے میں داخل ہوئے تو وہاں نبی اکرم ﷺ کا بستر بچھا ہوا تھا، وہ اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا کہ ابا جان ذرا ٹھہریئے۔ پھر بستر تہہ کر کے کہا کہ اب تشریف رکھئے۔ ابوسفیان نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! کیا تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟ انہوں نے جواب دیا: ابا جان آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں، یہ بستر محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے اور آپ مشرک ہیں، نجس ہیں، آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس بات سے ابوسفیان جتنے خفیف اور خجل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے کتنی سبکی

Salman Saleem 03067163117

محسوس کی ہوگی اس کا ہر شخص اپنے طور پر کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔ اب انہیں سفارش کا حوصلہ کہاں ہو سکتا تھا، چنانچہ مزید کچھ کہے سنے بغیر مایوس ہو کر واپس ہوئے۔

اب دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور سخت گھبراہٹ اور مایوسی و ناامیدی کی حالت میں کہا: ابوالحسن! مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن میں تمہیں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ مسجد نبویؐ میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے قریش کے سردار کی حیثیت سے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ چنانچہ ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء پر ایسا ہی کیا اور مسجد نبویؐ میں جا کر تجدید صلح کا یک طرفہ اعلان کر دیا کہ میں قریش کا سردار ابوسفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا، لیکن یہ اعلان کر کے وہ فوراً اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس مکہ روانہ ہو گئے۔

مکہ پہنچنے پر لوگوں نے پوچھا کہ کیا کر کے آئے ہو؟ انہوں نے تفصیل بتائی۔ لوگوں نے کہا: تو کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے نافذ قرار دیا؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں۔ لوگوں نے کہا: ہم نہ اسے تجدیدِ صلح سمجھ سکتے ہیں کہ آرام سے سوئیں، نہ جنگ سمجھ سکتے ہیں کہ تیاری کریں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

(بحوالہ "منہجِ انقلابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم")

Salman Saleem 03067163117

# فتح مکہ

Salman Saleem 03067163117

ادھر مکہ والے شش و پنج میں تھے کہ ابوسفیان جو کچھ کر کے آئے ہیں اسے کیا سمجھا جائے! اِدھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے حلیف قبائل کے پاس قاصد بھیج دیئے کہ تیار ہو کر مدینہ آجائیں۔ لیکن یہ احتیاط کی گئی کہ یہ اعلان نہیں فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ آپؐ نے یہ بات بالکل مخفی رکھی کہ کدھر جانا ہے! لیکن ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ سے اُس وقت ایک خطا ہو گئی۔ ان کے اہل و عیال اس وقت تک مکہ میں تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ حضور ﷺ کا ارادہ مکہ پر چڑھائی کا ہے۔ انہیں خوف لاحق ہوا کہ اب مکہ میں جو خون ریزی ہو گی تو وہاں میرے اہل و عیال کو بچانے والا کوئی نہیں ہے، اللہ جانے ان کا کیا حال ہو گا۔ اس لیے کہ قریش سب سے پہلے تو مکہ میں موجود مسلمانوں یا ہجرت کرنے والوں کے اہل و عیال ہی کو ختم کریں گے۔ ان اندیشوں کے پیش نظر انہوں نے قریش پر احسان دھرنے کے لیے مخفی طور پر ایک خط لکھا، جس میں یہ خبر تھی کہ رسول اللہ ﷺ مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور آپؐ جلد ہی مکہ کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ خط ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ خفیہ طور پر مکہ جا کر یہ خط سردارانِ قریش کو پہنچا دے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی خبر دے دی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت علی اور ان کے ساتھ تین صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جاؤ فلاں مقام پر تمہیں ایک ہودج نشین عورت ملے گی، جس کے پاس ایک رقعہ ہے؛ اسے لے کر آجاؤ۔ یہ حضرات گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے وہاں پہنچے۔ وہ عورت سمجھ گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہارے پاس کوئی خط نہ ہو، اگر تم نہیں دو گی تو ہم تمہیں برہنہ کر کے تلاشی لیں گے۔ یہ دھمکی سن کر اس نے بالوں کی چٹیا سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ یہ خط لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خط سن کر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم

کو حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی جانب سے افشائے راز پر حیرت بھی ہوئی، رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ حضرت عمرؓ جلال میں آ کر بیتاب ہو گئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑادوں، اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرؓ! جانتے نہیں ہو کہ یہ بدری ہیں اور اللہ تعالیٰ اہلِ بدر کو مخاطب کر کے فرما چکا ہے کہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کر چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطبؓ سے باز پرس فرمائی تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے اس اندیشہ کے سبب سے یہ خطا ہو گئی ہے، جس پر میں نادم بھی ہوں اور توبہ بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ ان کو معاف کر دیا گیا۔

## مکہ کی طرف کوچ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر حضورؐ کے ہمرکاب تھا۔ یہ رمضان ۸ ھ ہے۔ واقعہ ہجرت کو دس برس اور مسلح تصادم (Armed conflict) کے مرحلے کو شروع ہوئے صرف چھ سال بیتے ہیں۔ سیرتِ مطہرہ میں بہت سے غزوات اور سرایا کا ذکر ملتا ہے لیکن ان تمام جنگوں میں جانی نقصان مجموعی طور پر چند سو سے زیادہ نہیں ہوا۔ کفار کی طرف سے جو لوگ قتل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے جو شہید ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اگرچہ کئی بار خوں ریزی ہوئی، لیکن اموات (Casualties) کی گنتی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک غیر خونیں (Bloodless) انقلاب تھا۔ سب سے زیادہ خون ریزی اگر ہو سکتی تو فتح مکہ کے وقت ہوتی۔ اس لیے کہ جو خون کے پیاسے تھے، جو جانی دشمن تھے، وہ سب کے سب مکہ میں موجود تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس کے دھوکہ سے پھینکے ہوئے برچھے سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے، یعنی وحشی۔ ان میں وہ خاتون بھی تھی یعنی ہندہ بنتِ عتبہ، زوجہ ابو سفیان کہ جس نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مُثلہ بھی کرایا تھا اور آپ کا کلیجہ چبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ اس وقت مکہ والوں کو یہ اندیشے لاحق تھے کہ اب کیا ہو گا، ان پر شدید خوف اور اضطراب طاری تھا۔

## اسلامی لشکر مکہ کی راہ میں

اثنائے راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ملے، جو

مسلمان ہوکر اپنے اہل وعیال سمیت مکہ سے ہجرت کر کے آ رہے تھے۔ مزید آگے گئے تو آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی ابو سفیان بن حارث اور پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن امیہ ملے۔ یہ دونوں مکہ میں آپ ﷺ کو سخت اذیت پہنچایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ لیکن جب دونوں بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوکر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں معاف فرما دیا۔

## ابوسفیان کا قبولِ اسلام

دس ہزار قدسیوں اور جان نثاروں کے جلو میں جب کوکبِ نبویؐ نہایت عظمت وشان کے ساتھ مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا تو تحقیق کے لیے قریش کی طرف سے ابوسفیان، حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) اور بُدَیل بن ورقہ چھپ چھپا کر اہل ایمان کے لشکر تک پہنچے۔ ابوسفیان کو مسلمانوں نے پہچان لیا اور گرفتار کر کے دربارِ رسالت میں پیش کیا۔ حضرت عمرؓ نے خیمہ میں آ کر عرض کیا کہ حضور! اللہ اور اس کے رسول کے اس دشمن کے قتل کا حکم دیجئے تاکہ کفر کے بالکلیہ استیصال کا آغاز ہو جائے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے جان بخشی کی درخواست کی...... ابوسفیان کا سابقہ کردار اور ان کی اسلام دشمنی سب کے سامنے عیاں تھی۔ ان کا ایک ایک فعل انہیں قتل کا مستوجب ثابت کرتا تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز تھی اور وہ تھی حضور ﷺ کی رافت، رحمت اور عفو کا جوہر جو ابوسفیان کو دل ہی دل میں اطمینان دلا رہا تھا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ حسنہ سے دل پہلے سے گھائل تھا۔ حق کا بول بالا اور اسلام کی فتح و سربلندی نگاہوں کے سامنے تھی۔ حضرت عباسؓ جگری دوست تھے، ان کی ترغیب اور ان تمام چیزوں نے اس آہنی چٹان کو پگھلا دیا اور وہ بالآخر دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور مؤمن صادق ثابت ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ...... غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی جو عہد خلافت راشدہ میں جنگ یرموک (شام) کے موقع پر بالکل جاتی رہی۔

## یوم المرحمۃ

علی الصبح جب لشکر اسلام مکہ کی طرف بڑھا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو تاکہ وہ افواجِ الٰہی کا جلال اپنی

Salman Saleem 03067163117

آنکھوں سے دیکھیں۔ نیز مکہ میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا یا حرمِ کعبہ میں داخل ہو جائے گا تو اس کو امن دیا جائے گا۔

اہل ایمان کی فوجیں الگ الگ پرچموں تلے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور حضرت ابوسفیانؓ ان کو دیکھ دیکھ کر متحیر ہو رہے تھے۔ جب انصار کے قبیلہ خزرج کا لشکر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گزرا جن کے ہاتھ میں علم تھا اور انہوں نے ابوسفیان کو دیکھا تو بے اختیار پکار اُٹھے:

اليومَ يومُ المَلحمة　　　اليومَ تستحلّ الكعبة

"آج خون بہانے کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔"

مختلف لشکروں کے پیچھے کوکب نبوی نمودار ہوا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ حضرت ابوسفیانؓ کی نظر جب جمالِ مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ سعد یہ کہتے ہوئے گزرے ہیں کہ "اليوم يوم الملحمة۔ اليوم تستحلّ الكعبة"۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، سعد نے صحیح نہیں کہا بلکہ

اليومَ يومُ المَرحمة　　　واليوم يوم تعظم فيه الكعبة

"آج کا دن رحمت کا دن ہے اور آج کا دن وہ دن ہے جس میں کعبہ کی تعظیم کی جائے گی۔"

ملحم بنا ہے لحم سے۔ ملحم جانوروں کے ذبح خانہ اور اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ذبیحہ کے پارچے یا قیمہ بنایا جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وزن پر رحم اور رحمت کے لفظ سے اس دن کو "یوم المرحمۃ" قرار دیا۔ یعنی رحم، رحمت اور شفقت کا دن...... ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس رضی اللہ عنہ کو دے دیا جائے۔

## ایک معمولی جھڑپ

اہلِ اسلام کے تمام لشکر پُرامن طور پر مکہ میں داخل ہو گئے۔ یہ تمام لشکر مکہ کے بالائی حصہ سے داخل ہوئے تھے۔ جب کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جو لشکر تھا وہ مکہ معظمہ کے زیریں حصہ سے شہر میں داخل ہونے کے لیے آیا۔ قریش کے ایک گروہ نے اس لشکر پر تیر برسائے۔ چنانچہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر اس گروہ پر حملہ کیا اور یہ لوگ تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب

Salman Saleem 03067163117

تلواروں کی چمک دیکھی اور جھنکار سنی تو تحقیق حال فرمائی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین کی جانب سے ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی۔"

## فتح مبین کا اتمام

اللہ کی شان دیکھیے، جس مکہ میں آٹھ سال قبل حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تھا اور جہاں سے نبی اکرم ﷺ نے راتوں رات چھپ کر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی، پھر غارِ ثور میں تین دن پناہ لینی پڑی تھی جس کے دہانے تک کھوجی کفارِ مکہ کو لے آئے تھے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حضور ﷺ کو بچایا تھا جب آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اضطراب دیکھ کر ان سے وہ جملہ فرمایا تھا جو توکل علی اللہ کا شاہکار ہے کہ: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ اس مکہ میں آٹھ سال بعد رمضان المبارک ۸ھ میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیت فاتح داخل ہو رہے ہیں۔ فرطِ تواضع اور عجز و انکساری کا یہ عالم ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کی پیشانی مبارک گھوڑے کے ایال کو مس کر رہی تھی۔ زبانِ مبارک پر ترانۂ حمد جاری تھا۔ دنیا نے اس سے قبل ایسا کوئی فاتح نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔

## بیت اللہ کی بتوں سے تطہیر

رسول اللہ ﷺ انصار و مہاجرین کے جلو میں مسجدِ حرام کے اندر تشریف لائے، اُس وقت آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک کمان تھی۔ وہ حرمِ محترم جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بت شکن نے اللہ واحد کی پرستش کے لیے تعمیر فرمایا تھا، اس کے آغوش میں تین سو ساٹھ بُت موجود تھے۔ لیکن اب رسول اللہ ﷺ کے لیے موقع تھا کہ اپنے جدِ امجد کی سُنت کی تجدید فرمائیں۔ چنانچہ حضور ﷺ ایک ایک بُت کو اپنی کمان سے ٹھوکے دے کر گراتے جاتے اور زبان مبارک سے پڑھتے جاتے تھے:

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل:۸۱)

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی"(۱)

---

(۱) صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: جاء الحق و ما یبدئ الباطل و ما یعید (سبا:۴۹) "حق آ گیا اور باطل کی چلت پھرت ختم ہو گئی"۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

عین خانہ کعبہ کے اندر بہت سے بت رکھے تھے اور اندر دیواروں پر تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب بت نکلوائے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جتنی تصویریں تھیں مٹا دیں اور حضرت بلالؓ نے تمام بت اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک دیئے۔

چند دنوں بعد ان تمام بتوں کو بھی پاش پاش کرا دیا گیا جن کے استھان اطرافِ مکہ میں مختلف مقامات پر قائم تھے۔ اس طرح عرب میں اسلام کی انقلابی دعوتِ توحید کی تکمیل ہوگئی۔ شرک اور بت پرستی کا طلسم ختم ہوا اور شرک کی بنیاد پر جو استحصالی نظام قائم تھا اس کا استیصال ہوگیا۔

## رسول اللہ ﷺ کا قریش سے خطاب

کعبہ مشرفہ کی بتوں سے تطہیر کے بعد آپ ﷺ نے اس کے اندر نماز ادا کی، پھر دروازہ کھول کر کھڑے ہوگئے اور مسجد حرام میں کھچا کھچ بھرے ہوئے قریش سے خطاب فرمایا۔ مکہ میں داخلہ کے بعد عرب کے بے تاج بادشاہ، سرورِ عالم رحمۃ للعالمین ﷺ نے خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد جو پہلا خطاب فرمایا اس کے مخاطب درحقیقت صرف اہلِ مکہ ہی نہیں بلکہ سارا عالم تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اَلَا كُلُّ مَاثَرَةٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ يُدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سِدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ...))

”ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تنہا تمام جتھوں کو توڑ دیا۔ آگاہ ہو جاؤ! (اب) تمام مفاخر، تمام انتقامات، خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرمِ کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔“

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ، اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

Salman Saleem 03067163117

''اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی یہ آیت پڑھی:

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○ (الحجرات: ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تا کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ (اللہ کا) تقویٰ رکھتا ہو۔ (یعنی اس کے فرامین کی خلاف ورزی سے سب سے زیادہ بچتا ہو۔) بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے۔''

## خطبہ مبارک کے بنیادی مطالب و مفاہیم

اس مختصر سے خطبہ میں اسلام کے انقلابی دعوت و پیغام کے چند اہم اصول بیان ہو گئے۔ دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی حاکم نہیں، کوئی مقنن نہیں، کوئی دستگیر نہیں، کوئی خالق و مالک نہیں...... لفظ اللہ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ ساتھ ہی شرک جیسے اکبر الکبائر کی تردید بھی آ گئی۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا بیان بھی آ گیا۔ پرانی عداوتوں اور انتقام کی پرزور مذمت بھی آ گئی۔ مفاخر قومی و نسبی کی بیخ کنی بھی ہو گئی۔ اور آپؐ نے جاہلیت کی ان تمام جہالتوں کے متعلق فرمادیا کہ ''میں نے ان تمام چیزوں کو پاؤں تلے کچل دیا۔''

ظہور اسلام سے پہلے عرب ہی نہیں تمام دنیا میں نسل، قوم اور خاندان کی تمیز کی بنا پر فرق و تفاوت اور امتیازات و مراتب قائم تھے۔ جیسے ہندو دھرم میں چار مستقل ذاتیں تا حال قائم ہیں، ان میں سے کوئی ذات کسی دوسری ذات میں ضم نہیں ہو سکتی۔ یہ مستقل اور دائمی ہیں۔ ان میں شودر کو اچھوت کا درجہ دیا گیا ہے جو غلیظ اور ناپاک جانوروں سے بھی کم تر ہے۔ پوری دنیا پر اسلام کا یہ احسان ہے کہ اس نے دنیا کو کامل انسانی مساوات کے اصول سے روشناس کرایا اور نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدینؓ نے اس اصول پر اسلامی حکومت کو

Salman Saleem 03067163117

عملاً چلا کر دنیا کے سامنے حجت پیش کر دی کہ نسل، رنگ، زبان، وطن، پیشے اور جنس کی بنیاد پر کوئی اونچا ہے نہ نیچا ہے، سب برابر ہیں، سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

## حضور ﷺ کا حلم اور عفو

خطبہ کے بعد فاتح مکہ ﷺ نے مجمع کی طرف دیکھا۔ جبارانِ قریش سامنے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ لوگ اگرچہ شقی، بے رحم اور ظالم تھے، لیکن مزاج شناس بھی تھے۔ لہٰذا بے اختیار پکار اٹھے: اخٌ کریمٌ و ابنُ اخٍ کریمٍ "آپ شریف اور با مروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروت بھائی کے بیٹے ہیں۔" رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ط "آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے۔" اور اذھبوا فانتم الطلقاء "جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کی انقلابی دعوت کے دلی دشمن اور اس کے مٹانے کے درپے تھے۔ وہ بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ پر طنز و تعریض کیا کرتے اور حضورؐ پر تضحیک و تمسخر اور استہزا کے تیر برسایا کرتے تھے، حتیٰ کہ دشنام طرازی تک کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں اور اہل ایمان کو شہید کیا تھا۔ وہ بھی تھے جو پیکر قدسی ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ وہ بھی تھے جو تلاوتِ آیاتِ الٰہی اور وعظ و دعوت کے موقع پر شور و غل اور مذاق و ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو دہکتی آگ، تپتی چٹانوں اور جلتی ریت پر لٹا کر ان کی پیٹھوں اور سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینۃ النبیؐ کے چھوٹے سے شہر کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا...... لیکن رحمتِ عالم ﷺ کے حلم، رأفت و رحمت اور عفو کا یہ کرشمہ ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں: لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ط آج کے دن تم پر کوئی الزام ہے اور نہ ہی کوئی ملامت ہے۔ میں آج تمہیں زبانی بھی کوئی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا کہ پچھلی کوئی بات یاد دلا کر تمہیں شرمندہ و شرمسار کروں...... کون نہیں جانتا کہ بسا اوقات

Salman Saleem 03067163117

جسمانی ایذا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ زبانی ایذا ہو جاتی ہے۔ اجرائے وحی کے ابتدائی تین سال تک رسول اللہ ﷺ زبانی ایذاء کا ہدف بنے رہے تھے، جس پر قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کی دلجوئی کے لیے آیات نازل ہوا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ چاہے کوئی جسمانی ایذا نہ پہنچاتے لیکن اس موقع پر چند جملے ایسے ارشاد فرما سکتے تھے جو قریش کی ذہنی ایذاء کا سبب بن سکتے تھے۔ لیکن رؤف ورحیم اور کریم رسول اللہ ﷺ کی شرافت ومروت نے یہ بھی گوارا نہیں کیا اور قریش کے اس سہمے ہوئے اور خوف زدہ مجمع سے فرمایا تو یہ فرمایا: "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ"

## اشتہاری مجرم

سیرت کی کتابوں میں بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ اہل مکہ کو امن عطا فرما دیا تھا لیکن چند لوگ ایسے بھی تھے جن کے متعلق یہ حکم تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں۔ مختلف روایات میں ان کی مختلف تعداد آتی ہے، البتہ اکثر روایات میں دس لوگوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چھ خلوص دل سے ایمان لے آئے اور انہیں معافی مل گئی۔ ان ایمان لانے والوں میں وحشی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے۔ بعد میں ان ہی کے ہاتھوں مسیلمہ کذاب واصل جہنم ہوا جو جھوٹے مدعیانِ نبوت کا سرخیل تھا۔ صرف چار شخص قتل ہوئے، تین مرد اور ایک عورت۔ مردوں میں سے ایک نے منافقانہ طور پر ایمان لا کر جنگ میں کہیں چھپ کر ایک انصاری کو قتل کیا تھا۔ ایک وہ تھا جس نے نبی اکرم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ شرارت کی تھی جب کہ وہ ہجرت کر رہی تھیں۔ ان کو اونٹوں سے گرا دیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ ایک لونڈی تھی جو فاحشہ بھی تھی اور مغنیہ بھی، جو نبی اکرم ﷺ کی ہجو میں نہایت شرمناک گیت گایا کرتی تھی۔

## نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط کا کامل ظہور

فتح مکہ کی صورت میں اندرونِ ملک عرب انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی اور سورۃ الصّف میں جو غزوۂ احزاب اور سورۃ الاحزاب سے متصلاً بعد نازل ہوئی، ان الفاظ مبارکہ میں جو بشارت دی گئی تھی وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ

Salman Saleem 03067163117

وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○ (الصف: ۱۳) وہ بشارت پوری ہوگئی۔

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر پختہ ایمان رکھنے والوں اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں اور اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر اس طرح قتال کرنے والوں کو جیسے سیسہ پلائی دیوار ہوں، آخرت میں لغزشوں اور خطاؤں کی مغفرت، دخولِ جنت اور جنّاتِ عدن کے پاکیزہ گھروں میں خلود و سکونت کے وعدوں کے ساتھ ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل کامیابی ہے {ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ط} اس دنیا میں بھی نصرتِ الٰہی اور فتح قریب کی نوید جاں فزا سنائی گئی تھی جو فطری اعتبار سے انسان کو بڑی محبوب ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کی صورت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں کے سامنے اس بشارت کا ظہور ہوگیا۔ گویا اس طرح اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ط کا اکمال و اتمام ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہِ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہوگئی۔

## چند اہم ترین موڑ

انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی جدوجہد کے دوران یکے بعد دیگرے جو حالات و واقعات پیش آئے ان میں سے بعض کو اہم ترین موڑ (Turning point) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''النبی الخاتم ﷺ'' میں سفرِ طائف کو Turning Point قرار دیا ہے...... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے سے اسلامی تقویم کا ''واقعہ ہجرت'' سے آغاز فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنجنابؓ کے نزدیک ''ہجرت'' کو بھی سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل تھی، کیونکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ایک Base عطا فرمائی تھی، جو تمکن فی الارض کے لیے ایک بنیاد بنی۔ اس کی طرف اشارہ ہے سورۃ الحج کی اس آیت مبارکہ میں کہ: اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِؕ جس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت اور اس سے ماقبل والی آیت دورانِ سفرِ ہجرت نازل ہوئیں۔ پھر غزوۂ احزاب کے وقت عرب میں ایک طرف نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ تھے اور دوسری طرف تمام مشرکین عرب بالخصوص قریش مکہ اور یہود تھے۔ حق و باطل کے مابین جو طویل کشاکش جاری تھی اس میں غزوۂ احزاب کو اس

Salman Saleem 03067163117

اعتبار سے Turning Point کی حیثیت حاصل ہے کہ اس غزوہ کے بعد نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ ((لَنْ تَغْزُوْ کُمْ قُرَیْشٌ بَعْدَ عَامِکُمْ ھٰذَا وَلٰکِنَّکُمْ تَغْزُوْنَہُمْ))... چنانچہ اس کے نتیجہ میں حضور ﷺ نے اگلے سال عمرہ کی نیت سے وہ سفر کیا جو صلح حدیبیہ پر منتج ہوا، جو درحقیقت فتح مکہ کی تمہید بنی۔ اس صلح اور فتح مکہ کے مابین نبی اکرم ﷺ کو قریباً دو سال کا جو پُرامن عرصہ ملا تو حضورؐ نے اس دوران اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اندرونِ عرب تیز تر کر دیا اور آپؐ نے اسی مرحلہ پر اپنی حیاتِ طیبہ میں پہلی مرتبہ بیرونِ ملک عرب بھی دعوتی سرگرمی کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے متعدد سلاطین اور رؤساء کو نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔

یہ بات اس سے قبل بیان کی جا چکی ہے کہ ۸ ھ میں قریش کے حلیف قبیلہ بنو بکر کی طرف سے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ پر اچانک یلغار کے بعد جب نبی اکرم ﷺ نے تین شرائط کے ساتھ اپنا سفیر مکہ بھیجا تو قریش کے جوشیلے قسم کے لوگوں (Hawks) نے پہلی دو شرائط ردّ کرتے ہوئے صلح حدیبیہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن قریش کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ بات ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ ابوسفیان صلح کی تجدید کے لیے مدینہ آئے اور اس کے لیے بھرپور کوشش کی، لیکن اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اس عزم (Determination) کا اظہار کیا کہ اب صلح کی تجدید نہیں کرنی ہے۔ اگر صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر ایک بہت بڑا تضاد (Contrast) سامنے آتا ہے کہ دو سال پہلے جناب محمد ﷺ ایسی شرائط پر صلح فرما رہے ہیں کہ جن کے متعلق تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محسوس کر رہے ہیں کہ یہ توہین آمیز ہیں۔ اس کا جو ردِ عمل حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ پر ہوا وہ اوپر بیان ہو چکا۔ پھر یہ کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ردِ عمل بھی بیان ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ اُٹھو، احرام کھول دو اور ساتھ لائے ہوئے جانوروں کی قربانیاں دے دو، لیکن ایک شخص بھی نہیں اٹھتا۔ تو دو سال پہلے بظاہر اس درجہ گر کر صلح کی گئی کہ جس سے تمام صحابہ کرامؓ کے دل مجروح ہوئے تھے...... اور اب قریش کا رئیس اعظم مکہ سے چل کر مدینہ آتا ہے اور سر توڑ کوششیں کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے لیکن نبی اکرم ﷺ متوجہ ہی نہیں ہو رہے اور صلح نہیں فرما رہے...... تو یہ یقیناً ظاہری اعتبار سے ایک بہت بڑا تضاد (Contrast) ہے، جسے

Salman Saleem 03067163117

مستشرقین نے منفی رنگ میں پیش کیا ہے۔

## مستشرقین کی کوتاہ نظری

اصل میں مستشرقین نے سیرتِ مطہرہ کے ایسے ہی معاملات کے اوپر ڈیرے جمائے ہیں اور نقب زنی کی کوشش کی ہیں۔ مثلاً ٹائن بی نے، جسے فلسفہ تاریخ کا بہت بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے، اپنے ایک جملے میں اس تضاد کو اپنی دانست میں sum up کیا ہے، اور وہ جملہ یہ ہے کہ (نقل کفر کفر نباشد)

"Mohammad failed as a Prophet but succeeded as a statesman."

''محمد (ﷺ) ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے ناکام رہے لیکن ایک سیاست دان اور مدبر کی حیثیت سے کامیاب رہے۔''

اس کے نزدیک مکہ میں حضور ﷺ کا جو بھی رویہ اور کردار سامنے آتا ہے وہ تو یقیناً انبیاءؑ والا ہے، لیکن مدینہ میں آپ ﷺ کا جو کردار ہے، وہ تو ایک مدبر، ایک سیاست دان، ایک statesman اور ایک فوجی جرنیل کا کیریکٹر ہے، اور اس کی رائے ہے کہ کامیابی مؤخر الذکر کو ہوئی ہے، مقدم الذکر کو نہیں ہوئی۔

اسی طرح مسٹر منٹگمری واٹ نے، جسے ایک مرتبہ ضیاء الحق کی حکومت نے بھی پاکستان بلایا تاکہ قومی سیرت کانفرنس میں وہ ہمیں سیرت سمجھائیں، دو جلدوں (Volumes) میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ لکھی ہے۔ لیکن اس نے دونوں جلدوں کے عنوانات علیحدہ علیحدہ رکھے ہیں۔ گویا اس طرح اس نے اپنے باطل نظریہ کے مطابق آنحضور ﷺ کی شخصیت کے تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ پہلی جلد کا عنوان "Muhammad At Mecca" اور دوسری جلد کا عنوان "Muhammad at Medina" ہے۔ گویا اس کے نزدیک دو محمد ہیں (ﷺ) ایک مکہ والے اور دوسرے مدینہ والے۔ العیاذ باللہ!

## تضادِ ظاہری کی حقیقت

یہ جو بظاہر تضاد (Contrast) نظر آتا ہے، جس پر مستشرقین نے ڈیرے جمائے ہیں، یہ دراصل ''انقلاب'' کے مراحل و لوازم کے تقاضوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیثیت صرف دیگر انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام والی نہیں ہے۔ آپؐ خاتم

Salman Saleem 03067163117

الانبیاء اور آخر المرسلین ہیں۔ آپؐ پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ لہٰذا آپؐ کے سپرد یہ اضافی مشن بھی کیا گیا کہ آپؐ دین حق کو بالفعل قائم، غالب اور نافذ فرمائیں۔ قرآن حکیم میں آپ ﷺ کی یہ خصوصی و امتیازی شان قرار دی گئی ہے اور آپ ﷺ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ:

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن مجید) اور دین حق (کامل شریعت) کے ساتھ تا کہ وہ اس کو تمام نظام ہائے زندگی و اطاعت پر غالب کر دے۔''

جب کہ عام نبوت کا غالب فرضِ منصبی دعوت، تبلیغ، تذکیر اور انذار و تبشیر ہے۔ چنانچہ منصبِ نبوت کی اس بنیادی ذمہ داری کے ضمن میں قرآن مجید میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں کہ ہمارے نبی اور رسول کے ذمہ سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے...... لیکن نبی اکرم ﷺ پر بحیثیت خاتم الانبیاء و آخر المرسلین اس اساسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک اضافی اور خصوصی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپؐ دینِ حق کو عملاً غالب اور قائم کر کے دنیا کے سامنے اس کی ایک نظیر و مثال پیش فرما دیں تا کہ نوعِ انسانی پر ابدالآباد تک کے لیے حجت قائم ہو جائے۔

## خصوصی منصب کے خصوصی تقاضے

اقامتِ دین کا کام درحقیقت ایک انقلابی جدوجہد (Revolutionary Struggle) کا متقاضی ہے۔ ایک قائم شدہ نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک صالح نظام کو قائم کرنے کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت سے نہیں آتا۔ اگرچہ اس میں بھی آغاز دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت ہی سے ہوگا اور اس میں تذکیر بھی ہوگی، تبشیر بھی اور انذار بھی ہوگا۔ لیکن اس کا ہدف یہ ہوگا کہ ان تمام کاموں کے نتیجہ میں ایک انقلابی جمعیت فراہم کرنا جو کسی انقلاب کے لیے لازم اور ناگزیر ہیں...... اور جب اس جمعیت میں مطلوبہ نظم اور ڈسپلن پیدا ہو جائے تو پھر اسے نظامِ باطل سے ٹکرا دینا۔ بقول علامہ اقبال:

بانشہ درویشی در ساز و دمادم زن! چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

Salman Saleem 03067163117

## صلح حدیبیہ کی مصلحتیں

چونکہ نبی اکرم ﷺ کے پیشِ نظر انقلاب کا یہ نقشہ تھا اور آپ ﷺ کا دستِ مبارک ہر وقت حالات کی نبض پر رہتا تھا لہٰذا آپؐ نے جس وقت اور جس موقع پر جو بھی قدم اُٹھایا وہ درحقیقت اسی مقصد کے پیشِ نظر اُٹھایا۔ جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ ابھی مہلت درکار ہے (جسے ہم کہتے ہیں to buy time) تو آپؐ نے اسی کے مطابق عمل فرمایا۔ حدیبیہ کے مقام پر بظاہر گر کر اور دب کر صلح کرنے میں یہی مصلحت تھی کہ ابھی وقت اور مہلت درکار تھی۔ قرآن مجید میں اس کی ایک اور مصلحت بھی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت جبکہ حضور ﷺ ۶ھ میں حدیبیہ تک پہنچ گئے تھے، قریش سے مسلح ٹکراؤ ہو جاتا تو نہ صرف یہ کہ خونریزی بہت ہوتی بلکہ اندیشہ یہ تھا کہ بہت سے وہ مسلمان جو مکہ میں موجود تھے لیکن اپنی بعض مجبوریوں کے باعث ہجرت نہ کر پائے تھے، مکہ میں قریش کے ہاتھوں قتل کر دیئے جاتے۔ اس لیے کہ اکثر جنگ کے دوران اخلاقی اقدار اور قبائل کی روایات کا لحاظ نہیں رہتا، جذبات کے عالم میں یہ سب پامال ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ جنگ کے ہنگامی حالات اور طوفانی کیفیات میں وہ خود حملہ آور مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے جاتے، جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۲۵ میں بایں الفاظ کیا گیا کہ:

وَلَوۡلَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ وَنِسَآءٌ مُّؤۡمِنٰتٌ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡهُمۡ اَنۡ تَطَـُٔوۡهُمۡ فَتُصِيۡبَكُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۚ (الفتح: ۲۵)

''اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم نادانستگی میں انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی)۔''

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلح تصادم ٹال دیا اور فریقین کے ہاتھ روک دیئے۔ چنانچہ اس کا ذکر ہے سورۃ الفتح کی آیت ۲۴ کے اس حصہ میں وَهُوَ الَّذِىۡ كَفَّ اَيۡدِيَهُمۡ عَنۡكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ عَنۡهُمۡ بِبَطۡنِ مَكَّةَ ''وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے۔'' تو یہ وہ مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر بظاہر توہین آمیز شرائط پر بھی صلح کر لی۔

Salman Saleem 03067163117

## دو سال بعد کی صورت حال

لیکن دو سال کے بعد حالات کافی بدل گئے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کی کامیابی کے لیے فضا تیار ہو چکی تھی۔ حضور ﷺ کا دستِ مبارک حالات کی نبض پر مستقل طور پر رہا ہے۔ آپ ﷺ کو اب بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت مکہ والوں میں کوئی دم خم موجود نہیں اور اب کسی خونریز مقابلہ کا سرے سے امکان ہی نہیں ہے۔ اب قریش میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ مقابلہ میں آسکیں۔

اس کے برعکس ان دو برسوں کے اندر دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اب مسلمانوں کی قوت اس قابل ہو گئی تھی کہ فیصلہ کن اقدام کیا جا سکتا تھا۔ پھر صلح ختم کرنے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری مسلمانوں پر کسی طرح بھی عائد نہیں ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرما دیئے تھے کہ قریش کے ایک حلیف قبیلہ نے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ پر حملہ کیا اور ان کو قتل کیا، حتیٰ کہ حرمِ محترم میں بھی ان کو اماں نہیں ملی، وہاں بھی ان کا خون بہایا گیا...... اور اس خونریز معرکہ میں قریش نے بھی بھیس بدل کر اپنے حلیف قبیلہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط کی اس خلاف ورزی کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے نہایت منصفانہ اور عادلانہ شرائط پیش فرمائیں کہ بنوخزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے اور ان کے مالی نقصان کی تلافی کی جائے...... یا یہ کہ قریش بنوبکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں تاکہ بنوخزاعہ اور مسلمان بنوبکر قبیلہ سے خود ہی نمٹ لیں۔ ان دونوں شرائط میں سے کوئی بھی منظور نہ ہو تو اعلان کر دیا جائے کہ آج سے صلح حدیبیہ ختم۔ قریش کے جوشیلے لوگوں نے جواب میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہمیں تیسری بات منظور ہے۔ یعنی آج سے صلح حدیبیہ ختم۔ اس موقع پر ابوسفیان بھی خاموش رہے اور قریش کے دوسرے جہاں دیدہ اور زیرک سردار بھی...... یہ تو ابوسفیان کا بعد کے غور و فکر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر کے ہم سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے۔ اسی لیے وہ دوڑے دوڑے مدینہ پہنچے اور انہوں نے تجدید صلح کی کوششیں کیں جن میں ان کو ناکامی ہوئی۔ اس موقع پر اگر نبی اکرم ﷺ ابوسفیان کی پیشکش پر صلح کی تجدید فرما لیتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ کفر اور شرک کو بلا ضرورت اور خواہ مخواہ عرب کے مرکز مکہ مکرمہ اور حرم محترم پر قابض

Salman Saleem 03067163117

رہنے کے لیے مزید مہلت دی جاتی، جسے آج کل کی اصطلاح میں Fresh Lease of Existance کہا جاتا ہے......اب اس کی قطعی ضرورت تھی نہ حاجت۔ مشیت الٰہی نے قریش کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے اور انہوں نے خود ہی صلح حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کردیا تھا۔ اس طرح اس بشارت کے عملی ظہور کا وقت آ گیا تھا جو ہجرت سے متصلاً قبل سورۂ بنی اسراءیل میں اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ مبارکہ دی تھی:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا○ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ (بنی اسراءیل: ۸۰-۸۱)

''اور (اے نبیؐ) کہہ دیجئے: اے رب میرے! (جہاں بھی تو مجھے داخل کرے تو) مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور (جہاں سے بھی تو مجھے نکالے تو) نکال مجھ کو سچا نکالنا اور مجھ کو عطا کردے اپنے پاس سے حکومت کی مدد اور (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل نکل بھاگا۔ بے شک باطل ہے ہی بھاگ جانے اور مٹ جانے والا۔''

## صورتِ حال کے ادراک و شعور کی ضرورت

یہ ہے اصل صورت حال جس کا ادراک و شعور ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر حضور ﷺ کا خصوصی مشن اور آپ ﷺ کا امتیازی منصب یعنی دین حق کو بالفعل بنفسِ نفیس قائم کرنا نگاہوں کے سامنے نہ رکھا جائے تو کوتاہ نظری کے باعث یہ تضاد نمایاں نظر آئے گا کہ دو سال پہلے حضور ﷺ بظاہر اہانت آمیز شرائط پر صلح فرما رہے ہیں اور دو سال کے بعد مخالف فریق کا رئیس اعظم خود مدینہ آ کر خوشامدیں کر رہا ہے، سفارشیں پہنچانے کی کوششیں کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے، لیکن حضور ﷺ ہیں کہ اس کی بات پر توجہ ہی نہیں فرما رہے۔

درحقیقت سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا صحیح فہم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ بات پیش نظر نہ ہو کہ اصل میں نبی اکرم ﷺ کو کیا مشن تفویض کیا گیا تھا اور وہ کیا خصوصی ذمہ داری تھی جو حضورؐ کے سپرد کی گئی تھی! الفاظ قرآنی هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ

Salman Saleem 03067163117

رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۭ (الفتح:۲۸) ایک شوشہ کے تغیر کے بغیر سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں وارد ہوئے ہیں۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان الفاظ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے حضور ﷺ کو ایک صالح انقلاب عملاً برپا کرنے کا مشن سونپا گیا تھا۔ لہٰذا انقلاب کے جو مراحل ہیں ان میں سے ہر مرحلہ پر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، چاہے بظاہر اس میں تضاد نظر آ رہا ہو۔

## تضادات کے ضمن میں نہایت غور طلب بات

جہاں تک ظاہری تضادات کا تعلق ہے سب سے نمایاں تضاد تو یہ نظر آتا ہے کہ مکہ میں بارہ برس تک حکم یہ ہے کہ مقابلے میں ہاتھ مت اٹھاؤ، چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں، تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر تمہارے کباب بنانے کا سامان کیا جائے، تمہیں طرح طرح سے اذیتیں دی جائیں، تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جائیں، تمہاری نگاہوں کے سامنے تمہاری دینی بہن (حضرت سمیہؓ) کو انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کر دیا جائے اور ان کے شوہر (حضرت یاسرؓ) کے جسم کے وحشیانہ طریق سے چیتھڑے اڑا دیئے جائیں۔ یہ سب کچھ جھیلو، برداشت کرو، تمہیں جوابی کارروائی تو کجا اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن مدینہ آنے کے بعد انہی "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ" کا اب حال یہ ہے کہ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۣ "وہ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں، قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں"...... تو بظاہر اس میں بھی بڑا نمایاں تضاد ہے۔ مگر یہ سارے تضادات صرف اسی طور سے حل ہوتے ہیں کہ انقلاب کے فلسفہ کو سامنے رکھ کر اس کے مختلف مراحل اور ہر مرحلہ کے مختلف تقاضوں کو سمجھنے کی معروضی کوشش کی جائے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کو اسلامی انقلابی جدوجہد سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ تمام مراحل ایک ڈور میں پروئے ہوئے موتی نظر آئیں گے اور فکر و نظر گواہی دیں گے کہ ہر مرحلہ صحیح ہے اور ہر اقدام اس مرحلہ کی مناسبت سے بالکل درست اور مناسب ہے۔

(بحوالہ "منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ")

Salman Saleem 03067163117

# فتح مکہ کے بعد

فتح مکہ کے بعد قریش کے بہت سے لوگ ایمان لے آئے اور مکہ کے اردگرد کے بہت سے قبائل نے بھی از خود پیش قدمی کر کے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف کے قبائل پر اس کا الٹا اثر پڑا، جو طائف اور اس کے اردگرد کی سرسبز و شاداب وادیوں میں آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے بڑے جنگجو اور فنونِ حرب سے واقف تھے۔ طائف اور مکہ کو بعض اعتبارات سے جڑواں شہروں (Twin Cities) کا مقام حاصل تھا۔ طائف میں رؤسائے مکہ کے باغات بھی تھے اور جائیدادیں بھی۔ پھر ان قبائل کے مابین تجارت بھی تھی اور رشتہ داریاں بھی...... چنانچہ فتح مکہ کے بعد یہ قبائل بڑے مضطرب ہوئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ہماری باری ہے۔ لہٰذا دونوں قبیلوں کے سرداروں نے مشورہ کر کے طے کیا کہ اس وقت مسلمان مکہ میں جمع ہیں، ہم خود پیش قدمی کر کے پورے جوش و خروش اور زور و شور سے ان پر حملہ کر دیں۔

ان حالات کی نبی اکرم ﷺ کو مکہ میں خبر پہنچی تو آپؐ نے تحقیق و تصدیق کے بعد تیاریاں شروع کر دیں اور بارہ ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ حنین کی طرف پیش قدمی کی۔ ان میں دس ہزار تو وہ قدسی شامل تھے جو مدینہ سے آئے تھے، باقی دو ہزار میں فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے نو مسلم اور مشرکین بھی شریک تھے۔ یہ فوجیں حنین کی طرف بڑھیں۔ چنانچہ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ضمیمہ اور تکملہ کے طور پر اگلے ہی مہینہ شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین اور غزوۂ اوطاس ہوا اور حضور ﷺ نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک حضور ﷺ کے یہ آخری مسلح اقدامات تھے۔

## غزوۂ حنین

ہوازن اور ثقیف کے قبائل کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے تاکہ ان کی حفاظت کی غرض سے ان کی فوجیں بڑی پامردی سے لڑیں،

Salman Saleem 03067163117

جانیں دے دیں، لیکن کسی صورت میں بھی پسپائی اختیار نہ کریں۔ انہوں نے فوج کی ترتیب اس طرح کی کہ اپنے بہت سے تیرانداز دستوں کو پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر تعینات کیا اور بقیہ فوج نے دوبدو جنگ کے لیے پہلے سے پہنچ کر میدان میں موزوں اور مناسب مقامات پر صف آرائی کر لی۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ "آج مسلمانوں پر کون غالب آسکتا ہے!" جب مسلمان تین سو تیرہ تھے تو ایک ہزار کے لشکر پر غالب آ گئے تھے، اس موقع پر تو مسلمانوں کا بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گھمنڈ پسند نہ تھا۔ لہٰذا اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ پہلے ہلے ہی میں ہوازن اور ثقیف کے تیراندازوں نے مسلمانوں پر تیروں کی جو بوچھاڑ کی تو ایک عام بھگدڑ مچ گئی اور بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ تاہم اس صورت میں بھی وہ پیکر مقدس میدان میں اپنی سواری پر جما رہا جو تنہا ایک فوج تھا، ایک اقلیم تھا، مجموعہ کمالاتِ انسانیہ تھا۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم! بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ صرف چار سو جاں نثار موجود تھے...... بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف چار سو...... بہرحال اس موقع پر نبی اکرم ﷺ اپنی سواری سے اُترے، علم ہاتھ میں لیا اور پوری حیاتِ مطہرہ میں پہلی بار پورے جلالِ نبوت کے ساتھ رجز پڑھا۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے بلند آواز سے فرمایا:

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب! أَنَا ابْنُ عَبدِ الْمُطَّلِب!!

"میں اللہ کا نبی ہوں (اس میں ذرہ برابر) جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب (جیسے شجاع) کا بیٹا ہوں۔"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ قریب ہی تھے۔ وہ بلند آواز بھی تھے، لہٰذا آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ انصار و مہاجرین کو پکارو...... انہوں نے نعرہ لگایا:

یا معشر الانصار! یا اصحابَ الشَّجرة!

"اے گروہ انصار، اے اصحابِ شجرہ! (بیعت رضوان والو!)"

اِن پُرتاثیر الفاظ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ انصار و مہاجرین یہ کہتے ہوئے دفعتاً پلٹ پڑے کہ: لبّیك یا رسولَ الله و سَعدیك، نحن بین یدَیك... پھر جو مسلمانوں نے حملہ کیا تو اچانک جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ عارضی و وقتی شکست کامل فتح سے بدل گئی۔

Salman Saleem 03067163117

بہت سے کافر کھیت رہے، اکثریت فرار ہوگئی اور جو باقی رہ گئے وہ اسیر بنا لیے گئے، بے شمار مالِ غنیمت، مویشی اور سامانِ حرب ہاتھ آیا۔

مغالطہ کا ازالہ

دس ہزار کا جو لشکر نبی اکرم ﷺ کے جلو میں آیا تھا ممکن ہے کہ ان میں کچھ ضعیف الایمان اور کچھ منافقین بھی شامل ہوں۔ ایک بڑے مجمع میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس لشکر میں دو ہزار کے لگ بھگ وہ افراد بھی تھے جن میں سے اکثر ایک ماہ قبل ہی ایمان لائے تھے۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا ہے اور شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین ہوا ہے۔ گویا ایمان کی حالت میں ان پر ایک ماہ سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ پھر اس دو ہزار کی تعداد میں کچھ وہ لوگ بھی شامل تھے جو ابھی ایمان ہی نہیں لائے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قبیلہ کی عصبیت یا مالِ غنیمت کے حصول کے لیے اسلامی لشکر کے ساتھ ہو گئے ہوں۔

بہر حال تھوڑے یا زیادہ لوگ اپنی کثرت پر نازاں تھے کہ آج ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ چونکہ امت مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی کی رُشد و ہدایت، دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے برپا کیا جا رہا تھا لہٰذا غلطی پر تنبیہ اور سزا بھی ضروری تھی۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا تھا کہ پینتیس افراد کی طرف سے اپنے لوکل کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کی پاداش میں ابتدائی فتح شکست میں بدل گئی تھی اور ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید اور خود نبی اکرم ﷺ زخمی ہوئے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین میں بھی کثرت پر جو ناز ہوا تھا اس پر یہ سزا ملی کہ ابتدا میں ہوازن و ثقیف کے تیر اندازوں نے اسلامی لشکر کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طور پر یہ سبق دیا کہ حزب اللہ کا توکل اسباب پر نہ ہو بلکہ مسبب الاسباب پر ہو۔ حسب استطاعت مادی اسباب و وسائل ضرور فراہم کیے جائیں لیکن مومن کو تو ہر آن اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر نگاہ رکھنی چاہیے: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○ (التغابن: ۱۳) اللہ کے اِذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ کسی کام کے لیے کتنے ہی اسباب و وسائل جمع ہو جائیں، لازم نہیں ہے کہ وہ کام حسب منشاء تکمیل پا جائے اور کسی شے کے لیے کچھ بھی وسائل و اسباب موجود نہ ہوں پھر بھی اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ شے عدمِ محض سے آنِ واحد میں وجود میں آ جائے۔

Salman Saleem 03067163117

جب تک اللہ کی قدرت کاملہ پر اس نوع کا ایمان نہ ہو اور جب تک اُس (تعالیٰ) کی ذات پر کامل توکل نہ ہو جائے اس وقت تک درحقیقت وہ ابتدائی اوصاف (Pre-qualifications) اور وہ صلاحیتیں جو اسلام کو دنیا میں ایک کامل نظامِ زندگی کی حیثیت سے غالب، قائم اور نافذ کرنے کے لیے درکار ہیں، انہی کا فقدان ہے۔ اسلامی انقلاب جیسے عظیم ترین کام کے لیے تو وہ جماعت درکار ہے جس کے ہر ہر فرد میں یہ صفات پہلے وجود میں آ چکی ہوں کہ ان کا اللہ پر کامل ایمان و ایقان ہو اور ان کا کوئی تکیہ اور بھروسہ ظاہری اسباب و وسائل اور ذرائع پر نہ ہو، بلکہ توکل خالصتاً اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسی بات کو اذہان وقلوب میں راسخ کرنے کے لیے حنین میں وقتی و عارضی شکست کے ذریعے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا گیا۔

## اوطاس

کُفار کی شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ مکہ اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر رُک گیا اور ایک بڑا حصہ طائف جا کر پناہ گزین ہوا۔ ایک اور قبیلہ جشم کا سردار دُرَید بن الصمہ جو اپنی بہادری اور شاعری میں پورے عرب میں مشہور تھا، اس کی عمر اس وقت سو برس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، لیکن طائف کا سردار مالک بن عوف اس کو چارپائی پر ڈال کر حنین لے گیا تھا تاکہ اس کے سوسالہ تجربات سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ حنین کی شکست کے بعد دُرَید اپنے قبیلہ کی کئی ہزار جمعیت لے کر اوطاس آیا، طائف کے جو لوگ یہاں رُک گئے تھے وہ بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے ایک مختصر فوج ان کے استیصال کے لیے بھیج دی جس کے ہاتھوں اللہ نے فتح نصیب فرمائی۔ دُرَید قتل ہوا، جس کے بعد یہ جمعیت اپنے مقتولین کو چھوڑ کر منتشر ہو گئی۔ کچھ لوگ طائف چلے گئے اور کچھ اسیر بنا لیے گئے۔

## محاصرۂ طائف

حنین اور اوطاس کی شکست خوردہ فوجیں طائف میں پناہ گزین ہوئیں اور طائف والوں کی مدد سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا وہ قریش کا قریباً ہمسر تھا...... نہایت شجاع، دلیر اور فنونِ جنگ سے واقف۔ عروہ بن مسعود یہاں کا رئیس تھا۔ سورۃ الزخرف میں مشرکین کا جو یہ قول نقل ہوا ہے: وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ

Salman Saleem 03067163117

هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ○ (الزخرف: ۳۱) ”اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُترا یہ قرآن کسی بڑے شخص پر دو بستیوں میں سے“۔ قریتین سے ان کی مراد مکہ اور طائف کے شہر تھے اور طائف کے بڑے آدمی سے مراد یہی عروہ بن مسعود تھا۔ عروہ کا ذکر صلح حدیبیہ کے ضمن میں آ چکا ہے۔ وہ بعد میں ایمان لے آئے تھے، لہٰذا صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئے۔

شہرِ طائف کے گرد مضبوط فصیل تھی اور وہاں ایک مضبوط قلعہ بھی موجود تھا، جس میں طائف والوں نے سال بھر کا سامان خورد و نوش جمع کر لیا تھا۔ فصیل پر چاروں طرف منجنیق اور جا بجا تیر انداز معین کر دیئے گئے تھے۔ اسلامی فوجوں نے محاصرہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی فوج کی طرف سے فصیل شکن آلات کا استعمال ہوا۔ طائف کے لوگوں نے فصیل کے اوپر سے لوہے کی گرم سلاخیں اور آگ برسائی اور اتنی شدت سے تیر پھینکے کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ بیس دن محاصرہ جاری رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ نبی اکرم ﷺ نے مشاورت کے بعد محاصرہ اُٹھا لیا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اہل طائف کے لیے بددعا فرمائیں، لیکن نبی رحمت ﷺ نے بددعا کے بجائے یہ دعا فرمائی: ((اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَائْتِ بِھِمْ)) ”اے اللہ! ثقیف کو ہدایت بخش کہ وہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔“ رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور محاصرہ اُٹھا لینے کے چند دنوں بعد ہی عروہ بن مسعود اپنے چیدہ چیدہ ساتھیوں کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بعد ازاں انہی حضرات کی دعوت و تبلیغ سے ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کے تمام افراد ایمان لے آئے۔

## تکالیف صرف جسمانی نہیں ہوتیں

سیرت النبی ﷺ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سایہ دار ہموار شاہراہ پر چلنے (Smooth Sailing) والا معاملہ نہیں تھا کہ جس میں کوئی پیچیدگی نہ ہو، کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی نشیب و فراز نہ ہوں اور انقلاب کی تکمیل ہو جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کی راہ میں جتنی مشکلات اور رکاوٹیں آ سکتی ہیں وہ ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بتمام و کمال نظر آتی ہیں۔ نبوت و رسالت کے منصب

Salman Saleem 03067163117

جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد حضور ﷺ کی بائیس تیئس سالہ حیاتِ طیبہ نہایت شدید اور جاں گسل جدوجہد میں گزری ہے اور آپ ﷺ کو بے پناہ مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خود آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھ پر تنہا وہ سب تکلیفیں اور مشکلیں بیتی ہیں جو تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام پر بیتی تھیں...... اگرچہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اگر اس کی مشیت ہوتی تو وہ اپنے محبوب ﷺ اور اپنے حبیب ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا اور انقلابِ اسلامی کی تکمیل بھی ہو جاتی، لیکن بالفعل ایسا نہیں ہوا۔ حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو بے حد وحساب تکلیفیں جھیلنی پڑی ہیں، مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں، بارہا آپ ﷺ کو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ مشرکین وکفار کی طرف سے استہزاء، تمسخر اور طعن وتشنیع سے جو ذہنی اذیت و کوفت آپ ﷺ کو پہنچتی رہی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ لوگ جو حضور ﷺ کا کلمہ پڑھ رہے تھے ان کے ہاتھوں بھی نبی اکرم ﷺ کو شدید نوعیت کی قلبی و ذہنی کوفت اور اذیت اُٹھانا پڑی...... آخر عبداللہ بن اُبی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی بھی تو کلمہ گو تھے اور ان کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ یہی عبداللہ بن اُبی ہے جس نے کئی بار مہاجرین وانصار میں پھوٹ ڈالنے، انہیں باہم وگردست وگریباں کرانے اور مہاجرین کی توہین وتذلیل کی کوششیں کیں۔ اسی طرح ان منافقین نے غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق کے مواقع پر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے جو اوچھے ہتھکنڈے اختیار کیے وہ بھی آنحضور ﷺ اور صحابہؓ کے لیے انتہائی ذہنی اذیت کا باعث بنے۔

پھر یہی عبداللہ بن اُبی ہے جس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی، جس کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ کو انتہائی ذہنی وقلبی اذیت جھیلنی پڑی۔ پھر یہ کہ اس معاملے میں چند وہ لوگ بھی ملوث ہو گئے جو صادق الایمان تھے۔ اس لیے کہ انسان کی طبعی کمزوری کے پیش نظر اس میں ذہنی آمادگی رہتی ہے کہ کسی کے بارے میں بُری بات بیان ہو تو اسے وہ جلد قبول کر لیتا ہے، جبکہ اگر کسی کے بارے میں اچھی بات بیان ہو تو اسے آسانی سے قبول نہیں کیا جاتا۔ واقعہ افک کے بعد جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا متواتر ایک مہینہ نہایت سخت

Salman Saleem 03067163117

کرب کی حالت میں گزرا۔ اس لیے کہ قریباً سوا مہینہ کے بعد سورۂ نور نازل ہوئی جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر لگائی گئی تہمت کی تردید کی گئی اور آپ کی پاک دامنی کی شہادت دی گئی۔ اس واقعے کا بظاہر حیات النبی ﷺ کے انقلابی پہلو سے کوئی تعلق نہیں، تاہم یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ انقلابی جدوجہد کے شدائد کے ساتھ ساتھ آپ کو ذہنی کوفت کے بدترین تجربات بھی پیش آئے۔ مگر ذہن کو بری طرح متاثر کرنے والے یہ واقعات آپؐ کی انقلابی جدوجہد کو ذرا بھی متزلزل نہ کر سکے۔

## غنائم اور اسیرانِ جنگ

ہوازن اور ثقیف کے قبائل بہت طاقتور اور دولت مند تھے۔ چنانچہ ان معرکوں میں کثیر مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ معتبر روایات میں مذکور ہے کہ قریباً چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بھیڑ بکریاں مال غنیمت میں ملیں۔ عرب کا اصل مال اور سرمایہ یہی مویشی ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈھیروں مال واسباب کے ساتھ چار ہزار اوقیہ چاندی بھی تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ یہ قبائل اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے تاکہ ان کے لشکر اپنے اہل وعیال کے تحفظ کی خاطر بے جگری سے لڑیں اور میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ موڑیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد آگئی اور جب کافروں کو سزا دینے کا غیبی فیصلہ ہوگیا، گویا {وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا} والی صورت حال عملاً پیدا ہوگئی تو ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور جان بچانے کے لیے جس کا جدھر منہ اُٹھا فرار ہوگیا۔ مال مویشی ہی کیا وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ بھاگے۔ چنانچہ مال مویشی کے علاوہ قریباً چھ ہزار افراد جن میں عورتوں بچوں کی عظیم اکثریت تھی اسیر بنا لیے گئے۔ (۱)

---

(۱) ان اسیران میں شیما نامی ایک خاتون بھی تھیں جو حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی اور حضور ﷺ کی رضاعی بہن تھیں۔ گرفتاری کے موقع پر انہوں نے کہا کہ ''میں تمہارے نبی کی بہن ہوں''۔ لوگ تصدیق کے لیے فوراً ان کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لائے۔ حضرت شیما نے پہچان کے طور پر اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی، کیونکہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ بچپن میں پیٹھ پر دانتوں سے کاٹا تھا، اس کا نشان موجود تھا۔ حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ نے ان کے بیٹھنے کے لیے خود اپنی رداءِ مبارک بچھائی، دلجوئی کی باتیں کیں، چند اونٹ اور بکریاں مرحمت فرمائیں اور ارشاد فرمایا کہ جی چاہے تو میرے ساتھ چل کر رہو یا گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ پہلے تو وہ ایمان لائیں، پھر عرض کیا کہ مجھے میرے اہل خاندان تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو عزت واحترام کے ساتھ ان کے قبیلہ میں پہنچا دیا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

## تقسیمِ غنائم اور ایک پیچیدہ صورتِ حال

مختصراً یہ کہ اس غزوہ کی فتح کے نتیجے میں بے شمار مال و اسباب ہاتھ آیا۔۔۔ صدقات کی تقسیم کے لیے سورۂ توبہ میں جو مدات بیان ہوئی ہیں ان میں ایک مد "اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" بھی ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی ان صدقات کے مستحق ہیں جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے غنائم کی تقسیم میں قریش کے ان لوگوں کو زیادہ نوازا جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے ایمان لائے تھے۔ ان میں سے بھی خاص طور پر جو قریش کے مختلف گھرانوں کے سربراہان اور سردار تھے ان کو مالِ غنیمت میں سے نسبتاً زیادہ حصہ عطا فرمایا۔

اب اس تقسیم پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، کیونکہ اس عمل میں اتفاقی اور واقعاتی اعتبار سے یہ صورت حال موجود تھی کہ مکہ والے بہر حال نبی اکرم ﷺ کے قبیلہ کنبہ کے لوگ تھے، آپؐ کے رشتہ دار تھے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر مکہ کے لوگ آپؐ کے ہم قبیلہ اور رشتہ دار نہ ہوتے تب بھی حضورؐ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتے۔ اب صورتِ واقعہ یہ بنی کہ اگرچہ حضورؐ یہ معاملہ تالیفِ قلبی کی غرض سے فرما رہے تھے لیکن بالفعل تو معاملہ یہ ہو گیا کہ یہ تالیفِ قلب جن کی ہو رہی تھی وہ آپؐ کے رشتہ دار اور کنبے قبیلے والے لوگ تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لشکر میں جو تھوڑے بہت منافقین شامل تھے، اب ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے اس معاملے کو خوب اُچھالا...... اور یہ معاملہ چونکہ بہت نازک (Sensitive) تھا لہٰذا منافقین کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں بھی تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آخر وہ لوگ بھی انسان ہی تھے اور انسان کی جو طبعی و فطری کمزوریاں ہیں وہ تو موجود رہتی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے اسی حقیقت کو کہیں یوں بیان فرمایا ہے کہ: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا○ (النساء: ۲۸) کہیں اس طرح کہ: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ (الانبیاء: ۳۷) اور کہیں یوں کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا○ (المعارج: ۱۹) یعنی انسان میں خلقی طور پر کچھ کمزوریاں رکھی گئی ہیں، تب ہی تو وہ امتحان اور آزمائش کے اندر ڈالا گیا ہے۔ اگر وہ ہر اعتبار سے کامل (Perfect) ہوتا، اس کی خلقت میں کسی پہلو سے بھی کوئی نقص نہ ہوتا تو پھر وہ فرشتہ ہوتا، پھر اس کے امتحان کی کیا احتیاج تھی؟ چنانچہ یہی ہوا کہ اس واقعے سے

Salman Saleem 03067163117

مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور خاص طور پر انصار میں سے بہت سے مسلمانوں کی زبانوں پر، جن میں مومنین صادقین بھی شامل تھے، یہ بات آ گئی کہ:

''دیکھا! جب جان دینے کا وقت آتا ہے، قربانیوں کا موقع ہوتا ہے تو ہم (یعنی مدینہ والے انصار) یاد آتے ہیں اور جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مرحلہ آیا ہے تو مکہ والے، اپنے قبیلے والے، اپنے اعزّہ واقرباء یاد آ گئے۔''

یہ بات جنگ کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی اور چہ میگوئیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے گوشِ مبارک تک یہ تمام باتیں پہنچ رہی تھیں اور حضور ﷺ کے قلب پر جو کیفیات گزر رہی ہوں گی اس کا احساس ہر حساس شخص کر سکتا ہے۔

## خطابتِ نبوی ﷺ کا شاہکار

نبی اکرم ﷺ نے اس پیچیدہ صورتِ حال کو جس عمدگی سے حل فرمایا وہ درحقیقت حضور ﷺ کی فراست اور حسنِ تدبیر کا شاہکار ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر باتیں ہیں جن پر مستشرقین دنگ رہ جاتے ہیں، چاہے وہ منٹگمری واٹ ہو، چاہے ایچ جی ویلز ہو، چاہے کوئی اور نامی گرامی مستشرق، یہ کہ انسانی فطرت اور نفسیات سے واقفیت! یہ انسان شناسی!...... اور یہ صلاحیت کہ پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو خوب صورتی سے حل کر لینا، یہ تمام اوصاف اُس ذاتِ اقدس ﷺ میں بدرجہ کامل جمع تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تعریف وتوصیف کے کوئی الفاظ ایسے باقی نہیں رہ گئے جو مسٹر منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب "Muhammad at Medina" میں حضورؐ کے لیے استعمال نہ کر دیئے ہوں۔ اس نے لکھا ہے کہ: اعلیٰ ترین تدبر وتفہم، معاملہ فہمی، انسان شناسی، دُور اندیشی، ان تمام اعتبارات سے جو اوصاف کسی بلند پایہ مدبّر، کسی سیاست دان، کسی حکمران، کسی Statesman کے اندر ہونے چاہئیں وہ بتمام وکمال محمد (ﷺ) میں موجود تھے۔

اسی فراست اور حسن تدبیر کی ایک نمایاں مثال ہے جو اس واقعہ میں سامنے آتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ چہ میگوئیاں سننے کے بعد حضور ﷺ نے ایک بہت بڑا خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا۔ پھر آپؐ نے تمام انصار رضی اللہ عنہم کو وہاں جمع

Salman Saleem 03067163117

کرلیا۔ وہاں آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ فصاحت و بلاغت کی معراج کے علاوہ فراست و ذکاوت اور تدبر نبویؐ کے ساتھ ساتھ علمِ نفسیاتِ انسانی کے ادراک میں آپ ﷺ کی مہارت کا بھی شاہکار ہے۔ حضورؐ نے انصار رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں ہدایت بخشی؟''

انصارؓ نے بیک زبان یہی جواب دیا: ''بَلٰی یَارَسُوْلَ اللہِ'' (کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!) پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

''یا معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر الفت و محبت اور اتفاق پیدا فرمایا؟''(۱)

پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

''یا معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں غنی کر دیا؟''

اس طرح آپؐ وہ احسانات و انعامات گنواتے چلے گئے جو حضور ﷺ کے ذریعے سے انصار پر بالخصوص اور نوعِ انسانی پر بالعموم ہوئے تھے۔ اور ہر ہر جملہ پر تمام انصارؓ بیک زبان عرض کرتے رہے کہ: ''بَلٰی یَارَسُوْلَ اللہِ'' (کیوں نہیں! اے اللہ کے رسول ﷺ، ہم تسلیم کرتے ہیں)

---

(۱) اشارہ ہے اس دشمنی کی طرف جو اوس و خزرج کے قبائل میں برسوں سے نسلاً بعد نسل چلی آرہی تھی جس کے باعث وقفہ وقفہ سے ان میں بار بار انتہائی خونریز اور خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور یہ دونوں قبیلے قریباً ختم ہوا چاہتے تھے اگر نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف نہ لا چکے ہوتے۔ اسی کا ذکر ہے سورۂ آل عمران میں بایں الفاظِ مبارکہ:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ (آیت: ۱۰۳)

Salman Saleem 03067163117

اس ارشاد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا:

"یا معشر الانصار! تم جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ: اے محمد! (ﷺ) جب آپؐ کی قوم نے آپؐ کو جھٹلایا، آپؐ کی تکذیب کی تو ہم آپؐ پر ایمان لائے اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی...... میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔"

پھر فرمایا:

"یا معشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب آپؐ کے دشمنوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو ہم نے آپؐ کو پناہ دی...... میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔"

پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

"یا معشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد (ﷺ) آپؐ کا کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا، ہم نے اپنی جانیں دی ہیں، ہم نے اپنا خون بہایا ہے جس کی بدولت آپ ﷺ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے......اور میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔"

نبی اکرم ﷺ کے اس پُرتاثیر خطبہ سے جب جذبات کی ایک خاص فضا پیدا ہوگئی تو آپؐ نے ایک بار پھر خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا:

"یا معشر الانصار! کیا تمہیں یہ پسند اور منظور نہیں ہے کہ لوگ اونٹ، بھیڑیں اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں...... اور تم محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھروں کو واپس لوٹو؟"

اس پر شدتِ جذبات سے تمام انصار رضی اللہ عنہم کی چیخیں نکل گئیں اور وہ سب بیک زبان پکار اُٹھے:

"رضینا، رضینا، رضینا"... ہم بالکل راضی ہیں (ہمیں نہ اونٹ چاہئیں نہ بھیڑیں اور بکریاں۔ ہمیں تو صرف اللہ کے رسول محمد ﷺ درکار ہیں۔)

مجمع میں اکثر کا یہ عالم تھا کہ روتے روتے بے حال ہو گئے۔ آنسوؤں سے ڈاڑھیاں تر ہو گئیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے انصارؓ کے سامنے یہ حکمت بیان فرمائی کہ مکہ کے

Salman Saleem 03067163117

لوگ تازہ تازہ ایمان لائے ہیں، ان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی ناحق جانبداری کی بنا پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ تالیف قلب کے لیے دیا گیا ہے۔

اس انتہائی نازک اور پیچیدہ صورت حال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالکل اتفاقیہ امر تھا کہ واقعتاً جن کی تالیفِ قلب کی گئی وہ نبی اکرم ﷺ کے قبیلہ والے تھے، بہت سے حضورؐ کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا...... لیکن فراستِ نبویؐ اور آپؐ کے حسنِ تدبیر نے کس خوبی سے اسے حل کیا! الغرض کسی بھی دوسرے انقلاب کے جو بھی اساسی تقاضے (Pre-requisites) ہوتے ہیں وہ سب کے سب آپ ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں پورے کیے گئے تب وہ انقلاب برپا ہوا جو بلاشبہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔

## اسیرانِ جنگ کی رہائی

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد اسیرانِ جنگ کی باقاعدہ تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ یہ تمام افراد اس وقت تک جعرانہ میں محفوظ تھے۔ اصول کے مطابق ان کو لشکر میں شریک لوگوں میں تقسیم کرنا باقی تھا کہ ہوازن وثقیف کی جانب سے ایک معزز سفارت نبی اکرم ﷺ کے خیمہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسیرانِ جنگ کی رہائی کی درخواست پیش کی۔ رئیس سفارت نے کھڑے ہو کر حضور ﷺ کو مخاطب کر کے کہا کہ ''اے محمد (ﷺ) جو عورتیں محبوس اور اسیر ہیں ان میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ آپ نے ہمارے قبیلہ کی ایک خاتون کا دودھ پیا ہے۔ (مراد ہیں حضرت حلیمہؓ) لہٰذا ہم سب آپ کے قرابت دار ہیں۔ خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بھی کچھ امیدیں وابستہ ہوتیں اور آپ سے تو کہیں زیادہ توقعات ہیں''...... نبی اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہوگا وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے اجتماع میں یہ درخواست پیش کرو۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد رئیس سفارت نے یہ درخواست مجمع میں پیش کی۔ حضورؐ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے

Salman Saleem 03067163117

جس کا حصہ میں چھوڑتا ہوں، اور تمام مسلمانوں سے بھی اسیران کی رہائی کی سفارش کرتا ہوں۔'' مہاجرین وانصار اور دوسرے لوگ پکار اُٹھے: ''ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔'' چنانچہ اس طرح دفعتاً چھ ہزار اسیران آزاد ہو گئے۔

## فتح مکہ کے بعد پہلا حج (۸ھ)

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا تدبر ملاحظہ کیجیے۔ اگرچہ آپ کو یہ پہلے سے اندازہ تھا کہ قریش میں بالکل دم خم نہیں ہے کہ وہ اسلامی فوج کا مقابلہ کر سکیں، ان کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، اسی وجہ سے آپؐ نے صلح کی تجدید سے اعراض فرمایا تھا...... لیکن فتح مکہ کے بعد آپؐ نے ایسا نہیں کیا کہ وہاں کے پورے نظام کو یکسر بدل دیا ہو۔ اس کے بالکل برعکس آپؐ نے ان مختلف ذمہ داریوں کو جو قریش کے مختلف خاندانوں کے سربراہوں کی تحویل میں تھیں انہی کے سپرد رہنے دیا، قطع نظر اس سے کہ وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں۔ آپؐ نے وہاں کے انتظامی معاملات کو قطعاً نہیں چھیڑا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اپنا کوئی امیر حج تک مقرر نہیں کیا کہ اب اس کی سرکردگی میں حج ہوگا، حالانکہ دو ماہ بعد حج ہونے والا تھا۔ بلکہ آپؐ نے نہایت نرم روش اختیار کی اور فتح مکہ کے بعد ذوالحجہ ۸ھ میں جو پہلا حج آیا وہ حسب سابق مشرکین ہی کے زیر انتظام و انصرام ہوا...... صرف اس فرق کے ساتھ کہ مشرکین اپنے طریقے سے حج کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے اُمتی موحدین اسلامی طریق پر حج کر رہے تھے۔

## دوسرا حج (۹ھ)

فتح مکہ کے دوسرے سال ۹ھ میں جب حج کا موقع آیا تو اس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی شرکت کی اجازت تو برقرار رکھی کہ وہ بھی حج کریں اور مسلمان بھی حج کریں، لیکن حج کے جملہ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ حضور ﷺ حج کے لیے خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر ان کے ہمراہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک قافلہ حج کے لیے بھیج دیا۔

(بحوالہ ''منہج انقلاب نبوی ﷺ'')

Salman Saleem 03067163117

# مشرکین عرب کو آخری تنبیہ

حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد ہی سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں، جو دراصل اندرونِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کے اعلان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ درحقیقت جزیرہ نمائے عرب میں شرک کے قطعی اور مکمل قلع قمع کا آخری اقدام یہی ہے جو ان آیات میں بیان ہوا۔

## سورۂ توبہ کے ساتھ بسم اللہ کا نہ ہونا

یہ بات تو ہر وہ شخص جانتا ہے جو قرآن مجید سے ادنیٰ شغف اور تعلق بھی رکھتا ہو کہ سورۃ التوبہ سے پہلے آیہ بسم اللہ لکھی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے یہ واحد سورۃ ہے کہ جس کے آغاز میں بسم اللہ نہ لکھی جاتی ہے نہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟...... مختلف لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں...... اصل وجہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس سورۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی۔ اس کے سوا کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ دلیل تو صرف حضور ﷺ کا فرمان ہے۔ لیکن اس دلیل کی حکمت معلوم کرنے کے لیے، اس کی توجیہہ میں مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ تلوار ہاتھ میں لے کر نازل ہوئی ہے، یہ **مُخْزِیَة** ہے، یہ **مُشَرِّدَة** ہے، یہ **مُفْضِحَة** ہے۔ یہ تو مشرکین کو فضیحت کرنے والی ہے، یہ ان کے لیے دنیا و آخرت کی رسوائی کا اعلان کرنے والی ہے، یہ ان کے آخری استیصال اور بیخ کنی کا فرمان (Extermination Proclamation) لے کر آئی ہے۔ لہٰذا اس کے آغاز میں بسم اللہ کیسے لکھی جائے، جس میں اللہ تعالیٰ کے دو عظیم ترین اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے دو اَرفع صفات یعنی رحمانیت اور

رحیمیت کا ذکر ہے۔ آیت بسم اللہ تو رحمتِ الٰہی کا بہت عظیم خزانہ ہے جبکہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ کا غیظ وغضب اور انتقامی شان ظاہر ہو رہی ہے... لہٰذا یہ واحد سورۂ مبارکہ ہے، جس کے آغاز میں آیت بسم اللہ نہیں ہے۔

## سورۂ توبہ کی ابتدائی چھ آیات کے مطالب ومفاہیم

سورۃ التوبہ کی پہلی آیت ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

"اعلانِ براءت ہے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے ان سب مشرکین کے لیے جن سے (اے مسلمانو!) تم نے معاہدے کیے تھے۔"

اس کی شرح بعد میں آئی ہے کہ جن مشرکین نے معاہدہ کی شرائط اپنی طرف سے پوری کی ہیں تم بھی اپنی طرف سے ان شرائط کو پورا کرو، لیکن اس مدت تک جس کے لیے معاہدہ ہوا ہے...... اب کسی مشرک قبیلہ کے ساتھ معاہدہ کی تجدید (Renewal) نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اب انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کا مرحلہ آ گیا ہے۔

آگے فرمایا:

{فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ○}

"پس (اے مشرکو!) تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے مزید چل پھر لو، اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رُسوا کرنے والا ہے۔"

چونکہ یہ اشہر حرم ہیں، ان میں خونریزی ممنوع ہے لہٰذا تمہیں چار مہینوں کی مہلت ہے، لیکن یہ جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور تم وہ صورت دیکھ چکے ہو کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○ کے مصداق باطل تو اب زائل ہو چکا ہے، اس کے لیے اب زوال مقدر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو

Salman Saleem 03067163117

رُسوا اور ذلیل وخوار کر کے چھوڑے گا۔ اور تکمیل کا اعلان تیسری آیت میں ہے: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ "یہ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کی طرف حج اکبر کے دن......"

## "حج اکبر" کی صحیح نوعیت

"حجِ اکبر" کے متعلق ہمارے یہاں ایک غلط تصور ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے کہ حج اگر جمعہ کے روز ہو تو وہ "حج اکبر" ہوتا ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد اور غلط تصور ہے۔ حج اکبر درحقیقت حج ہی کو کہتے ہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے عمرہ کو "حج اصغر" کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں قیامِ منیٰ، وقوفِ عرفات، رمی، جمرات اور قربانی کو چھوڑ کر دوسرے مناسک کو جو خالصتاً بیت اللہ سے متعلق ہیں، جیسے احرام، طوافِ قدوم، سعی بین الصفا والمروۃ اور طوافِ وداع شامل ہیں۔ چنانچہ عمرہ حج اصغر ہے اور ۹ ذی الحجہ کو وقوفِ عرفات حج اکبر ہے۔ وقوفِ عرفہ کا جمعہ کے دن آجانا کوئی خصوصی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن غلط العام کے طور پر یہ بات پھیل گئی ہے کہ وقوفِ عرفہ کا جمعہ کے دن آنا حج اکبر ہے۔

## براءت کا اعلانِ عام

فرمایا:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔـا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(التوبہ: ۳-۴)

"اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے لوگوں کے لیے

Salman Saleem 03067163117

حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم توبہ کرو (یعنی اسلام قبول کرلو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور (اے مشرکو!) اب بھی اگر تم نے روگردانی کی تو اچھی طرح جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (اے نبیؐ) ان کافروں کو آپ دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ سوائے ان مشرکین کے جن سے تمہارے معاہدے ہیں، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا، تو ایسے لوگوں کے ساتھ جو تمہارا معاہدہ ہے تم اسے مدتِ معاہدہ تک وفا کرو۔ بے شک اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔“

## عذابِ استیصال والی آیت

اب پانچویں آیت وہ ہے جو مشرکین عرب کے لیے عذابِ استیصال کا اعلان کرنے والی سخت ترین آیت ہے۔ اس سے زیادہ سخت کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے...... اور اس سورۂ مبارکہ کی یہی آیت ہے جس میں تلوار ہاتھ میں لے کر اترنے والی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ فرمایا:

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (التوبہ:۵)

”پس جب حرمت والے یہ مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ اور ان کو پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کی خوب خبر لینے کے لیے ہر گھات بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی ایمان لائیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے۔“

یہ آیت عام نہیں ہے۔ یعنی یہ دنیا کے تمام مشرکوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ یہ صرف

Salman Saleem 03067163117

جزیرہ نمائے عرب کے ان مشرکین کے لیے ہے جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں وہاں آباد تھے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے، ان کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اور ان پر آخری درجہ میں اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ اب بھی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ بالکل وہی قانون ہے کہ جس قانون کے تحت قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ اور قوم لوطؑ کو ہلاک کردیا گیا۔ یعنی جس قوم کی طرف تعین کے ساتھ رسول کو بھیج دیا جائے اور رسول دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے اپنی قوم پر اتمامِ حجت کردے لیکن قوم اس کی بات کو نہ مانے تو وہ قوم کسی رعایت کی مستحق نہیں رہتی اور اسے اس دنیا میں نیست و نابود کردیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کسی عام داعی کی بات نہیں ہے، یہ رسول کی بات ہے۔ رسول تو اللہ تعالیٰ کی برہان بن کر مبعوث ہوتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے بینات لے کر آتا ہے، اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے، اس پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے کہ جس سے بڑی کوئی برہان اور کوئی بینہ ممکن نہیں ہے۔ اب ان تمام باتوں کے بعد بھی لوگ ایمان نہ لائیں تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس قوم کو ہلاک کردیا جاتا ہے، اور یہ اللہ کا وہ غیر مبدل قانون ہے جس کے تحت پوری کی پوری قومیں ہلاک کردی گئیں اور نقشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ یعنی قوم ختم ہوگئی، مسکن رہ گئے، کھنڈرات رہ گئے۔ مکان نظر آرہے ہیں، مکین نظر نہیں آرہے۔ مختلف قوموں پر عذابِ استیصال مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ ایک عالمگیر نوعیت کا سیلاب لاکر پوری کی پوری قوم کو غرق کردیا گیا، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا۔ کہیں ایسا ہوا کہ قوم کے چیدہ چیدہ لوگوں کو نکال کر سمندر میں غرق کردیا گیا، جیسے آلِ فرعون کے ساتھ ہوا۔ کہیں ایسا ہوا کہ منکرین کی بستیوں ہی میں عذاب آیا۔ کہیں زلزلہ آگیا، کہیں پتھراؤ کیا گیا، کہیں طوفانِ بادوباراں آگیا، کہیں بستیوں کو اٹھا کر پلٹ دیا گیا۔ کہیں ایسی چنگھاڑ اور گرج بھیج دی گئی کہ جسے سن کر پوری کی پوری بستی ختم ہوگئی...... تو عذابِ استیصال کی یہ مختلف صورتیں رہی ہیں۔

Salman Saleem 03067163117

## حضور ﷺ کی دو بعثتیں

درحقیقت حضور ﷺ کی بعثتیں دو ہیں۔ ایک بعثتِ خصوصی، اہل عرب یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف ہے، جن میں سے نبی اکرم ﷺ خود تھے۔ جن کی زبان میں حضورؐ پر اللہ کا کلام نازل ہوا۔ دوسری بعثتِ عمومی ہے "اِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً"۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ یہ اس وقت موضوعِ بحث نہیں...... البتہ جن کی طرف رسول اللہ ﷺ کی بعثت خصوصی تھی تو ان پر دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، انذار و تبشیر، تذکیر و موعظت کے ذریعہ سے حضور ﷺ رسالت کی تمام ذمہ داریاں بنفس نفیس ادا فرما چکے تھے۔ اس طرح ان پر اتمامِ حُجت کیا جا چکا تھا، لہٰذا ان کے لیے اب رعایت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ان پر اللہ کا جو عذاب آیا اس کی پہلی قسط غزوۂ بدر کی صورت میں ظاہر ہوئی، جہاں ان کے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ انہی میں ابوجہل تھا، عتبہ بن ابی معیط تھا، انہی میں عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بھائی اور بیٹا بھی تھے۔ الغرض ان کے اکثر نامی گرامی سردار اس غزوہ میں کھیت رہے تھے۔ انہی میں نضر بن حارث بھی تھا جو پکڑا گیا تھا اور بعد میں حضور ﷺ نے اسے قتل کرایا تھا۔ پھر مختلف غزوات میں بہت سے صنادید مشرکین بتدریج اس دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہو کر واصلِ جہنم ہوتے رہے۔

## مکمل قلع قمع کا مرحلہ

سورۃ التوبہ کی ابتدائی چھ آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل خاتمہ اور قلع قمع (Mopping up Operation) کا اعلانِ عام ہے کہ اب اہلِ عرب میں سے مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے، اب ان سے کوئی نئی صلح نہیں ہوگی۔ صلح کے جو معاہدے پہلے ہو چکے ہیں، ان میں سے کسی کی بھی مدت ختم ہو جانے کے بعد آئندہ تجدید نہیں ہوگی۔ کسی نے صلح توڑ دی، معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو وہ اسی وقت ختم اور کالعدم ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ چار مہینے گزرنے کے بعد پورے عرب میں مشرکین کا قتل عام شروع ہو جائے گا، کسی کی کوئی رُو رعایت نہیں کی جائے گی، کسی کی جان بخشی نہیں کی جائے گی۔

Salman Saleem 03067163117

سوائے اس کے جو ایمان لے آئے۔ دل کا حال اللہ جانتا ہے، اس کا حساب وہ عزوجل خود لے گا...... یہاں اسے اپنے ایمان کا اقرار و اعلان کرنا ہوگا، کلمہ شہادت ادا کرنا ہوگا، نماز قائم کرنی ہوگی، زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ جو بھی ان شرائط کو پورا کردے گا اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے گا۔ یعنی جو لوگ نظامِ اسلام کو قبول کرلیں اور مسلم ہو جائیں، ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ رہا یہ معاملہ کہ ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا یا نہیں، اس کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ کیونکہ دلوں کا حال اسی عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ کو معلوم ہے۔ چنانچہ اسی مضمون پر مشتمل رسول اللہ ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوةَ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ، اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ، وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))

''مجھے (اللہ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لا الٰہ اِلا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ (کام) کریں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی اسلام کے قانون کی زد میں آجائے (باقی رہا) ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔''

معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ کی جان بخشی کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ وہ کلمہ شہادت ادا کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

## قتل عام کی نوبت نہیں آئی

ان چار مہینوں کے اختتام پر مشرکین عرب میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو۔ گنتی کے چند افراد کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ آخر وقت تک کفر پر قائم

Salman Saleem 03067163117

رہے، لیکن ایسے لوگ معین وقت ختم ہونے سے پہلے ہی سرزمین عرب کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ چنانچہ کوئی حبشہ چلا گیا اور کسی نے شام یا مصر میں پناہ لی...... بہر حال خونریزی کا مرحلہ نہیں آیا۔ لیکن اصل میں اس اعلان کی حیثیت جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کے استیصال (Mopping up operation) کی ہے کہ اگر اہلِ عرب بنی اسمٰعیل میں سے کوئی بھی انکار کرتا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جاتی۔ البتہ دوسرے غیر عرب کفار کا معاملہ دوسرا ہے۔

## نظم کی اہمیت کا ایک اہم واقعہ

سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے نازل ہونے سے پہلے حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج مقرر فرمایا تھا۔ اب ان آیات کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ روانہ فرمایا اور آنجناب رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سپرد کی کہ حج کے موقع پر جبکہ میدانِ عرفات میں پورے عرب کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ جمع ہوں گے جن میں مشرکین بھی ہوں گے تو اس مجمع میں یہ آیات میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے کھڑے ہو کر سنا دینا تا کہ تمام اہل عرب کو معلوم ہو جائے کہ اشہرِ حرم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکین عرب سے کیا معاملہ ہوگا!

یہ چھ آیات اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داری لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے اور راستہ ہی میں قافلہ حج کو جا لیا۔ جب وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلام و دعا کے بعد دریافت فرمایا: "اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟" یعنی یہ بات واضح کر دیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو امیر بنا کر بھیجا ہے یا مامور بنا کر؟...... کسی اسلامی جماعت میں کسی بھی فرد کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو وہ خود صاحب امر یعنی امیر ہوگا، بصورت دیگر کسی امیر کے تابع یعنی مامور ہوگا...... چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے سوال کیا کہ اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟... یعنی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو امیر بنا دیا ہو، تو آیئے چارج سنبھالیے، اپنی پوزیشن میں آیئے، تا کہ مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب مامور ہوں اور میں آپ کا حکم سنوں اور مانوں۔ اور

اگر دوسری صورت ہے کہ میں ہی امیر حج ہوں اور آپ مامور ہیں تو یہ پوزیشن بھی واضح ہو جانی چاہئے۔ حضرت علیؓ نے جواب میں فوراً کہا: مَامُوْرٌ... یعنی میں امیر بن کر نہیں آیا میں مامور ہی ہوں، اس قافلہ حج کے امیر آپ ہی ہیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے میرے ذمہ یہ کام سپرد کیا ہے کہ آپ ؓ کی روانگی کے بعد جو چھ آیات نازل ہوئی ہیں ان کا اعلانِ عام حج کے مجمع میں رسول اللہ ﷺ کے نمائندہ کی حیثیت سے کر دوں۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ ہی بحیثیتِ امیر قافلہ حضور ﷺ کی جانب سے اعلان فرما سکتے تھے تو یہ ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ حضرت علی ؓ کے سپرد کیوں کی گئی؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ کوئی اہم اور خاص اعلان کسی قبیلہ کے سردار کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی قریب ترین عزیز ہی کیا کرتا تھا جو اسی قبیلہ سے تعلق بھی رکھتا ہو۔ ایسی صورت میں اس اعلان کی اہمیت مسلّم ہوتی تھی۔ اگرچہ رشتہ داری کے اعتبار سے حضرت ابوبکر ؓ حضور ﷺ کے خسر تھے، لیکن آپؓ بنو ہاشم میں سے نہیں تھے جبکہ ابھی تک قبائلی نظام بڑی حد تک باقی (intact) تھا۔ چنانچہ حضرت علی ؓ چونکہ آپ ﷺ کے قریب ترین عزیز بھی تھے اور قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا یہ ذمہ داری حضرت علیؓ کے سپرد کی گئی۔

## ایک رعایت

اس کے بعد چھٹی آیت میں مشرکین کے لیے ایک رعایت کا ذکر ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (التوبہ:٦)

”اور (اے نبی ﷺ) اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تا کہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اُسے اس کے مامَن یعنی مستقل قیام گاہ تک پہنچا دیجئے۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔“ یعنی ان کو اسلام کے پیغام کی پوری واقفیت نہیں ہے۔

Salman Saleem 03067163117

آیت مبارکہ کے ترجمہ ہی سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ تاہم مفہوم یہ ہے کہ مہلت کے چار مہینوں کے اندر کوئی مشرک دین کو جاننے اور سمجھنے کے لیے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دی جائے، اسے دین سمجھایا جائے۔ اگر اس کام میں چار ماہ کی مدت ختم ہو جائے اور وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے اس کی قیام گاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر وہ جو فیصلہ کرے اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ ایمان لے آئے تو چھوڑ دیا جائے گا، ترکِ وطن کرنا چاہے تو راستہ نہیں روکا جائے گا۔ دونوں اختیارات میں سے کوئی بھی اس کے لیے قابل قبول نہ ہو تو اب وہ واجب القتل ہوگا۔

## مشرکین کے لیے بیت اللہ میں داخلہ کی ممانعت

مشرکین کے لیے آئندہ حج کرنے اور بیت الحرام میں داخل ہونے میں ممانعت کا حکم پہلے نازل ہو چکا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ (التوبہ: ۲۸)

''اے اہل ایمان، مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں......''

بیت اللہ کی تطہیر اب مکمل ہوگئی۔ لہٰذا آئندہ مشرکین کو نہ حج کی اجازت ہوگی نہ وہ حرم شریف میں داخل ہو سکیں گے۔

میں انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے اس مرحلے کو Mopping up Operation سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب ہر نوع کی مزاحمت و رکاوٹ (Resistance) ختم کر کے اور آخری وارننگ دے کر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی گئی۔ اس بات کا اشارہ سورۃ المائدہ میں بھی ملتا ہے، جہاں فرمایا گیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ (المائدہ: ۳)

Salman Saleem 03067163117

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

یہ وہ آیتِ مبارکہ ہے جس کے متعلق یہودی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اگر اس مفہوم کی کوئی آیت ہمیں عطا ہو جاتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید کے طور پر مناتے۔

سورۃ المائدہ کی یہ آیت نہایت اہم، عظیم اور مہتم بالشان مطالب و مفاہیم کی حامل ہے، کیونکہ اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کو ایک ایسا مستقل اور بھرپور نظامِ زندگی عطا کر دیا گیا ہے کہ جس میں قیامت تک کے لیے بنی نوعِ انسان کے جملہ انفرادی و اجتماعی مسائل کا نہایت معتدل تفصیلی یا اصولی حل موجود ہے۔ پھر اسی آیت میں اتمامِ نعمت کا اعلان بھی ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دین مکمل ہو گیا بلکہ نعمت کی تکمیل بھی ہو گئی اور نعمت سے یہاں مراد ہے سلسلہ وحی اور نبوت و رسالت۔ نبوت و رسالت کا بنیادی مقصد لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانا اور اپنے قول و فعل سے لوگوں پر حجت قائم کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس یہ کام کر کے دکھایا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین کو بالفعل غالب فرما کر گویا اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا اور اس طرح سلسلہ نبوت و رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اب چونکہ اللہ کا آخری اور مکمل پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچ گیا تھا اور اس آخری وحی کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ نے لے لیا تھا اور دوسری جانب حضور ﷺ کی ذات میں سلسلہ رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا اور اس میں مزید کسی اضافے (improvement) کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا سلسلہ وحی اور نبوت و رسالت کو اب ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا گیا...... اس پہلو سے یہ آیت اتمام و اختتامِ نبوت و رسالت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

## انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

فتح مکہ اور معرکہ حنین و اوطاس نیز محاصرۂ طائف کے بعد اہل طائف خود ہی مطیع ہو کر

Salman Saleem 03067163117

مشرف باسلام ہو گئے تھے...... اسلامی انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی اور نقشہ یہ بن گیا تھا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین دوسرے تمام باطل نظام ہائے حیات پر غالب و حکمران ہو گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ عرب کے جن قبائل نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا ان میں مشاورتیں منعقد ہوئیں اور مدینہ میں ان کے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز کسی نہ کسی قبیلہ کا وفد آ کر سرِ اطاعت خم کرتا تھا اور اسلام قبول کر لیتا تھا۔ گویا کہ اسلام کے خلاف مزاحم قوتوں کا بڑی تیزی سے خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسلام کا اصل مفہوم ہی فرمانبرداری اور اطاعت قبول کرنا ہے۔ فارسی میں اس مفہوم کو ''گردن نہادن'' اور انگریزی میں to give up resistance اور To surrender کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کو سورۃ النصر میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝١ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝٢

''جب پہنچ چکی اللہ کی مدد اور (حاصل ہو گئی) فتح تو تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل ہوتے فوج در فوج۔''

اس طرح جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والے تمام عرب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ انقلاب کے ان چھ کے چھ مراحل سے گزرنے کے بعد انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی۔

## دوسرے منکرین و کفار کا معاملہ

اندرونِ جزیرہ نمائے عرب جو غیر اسماعیلی آباد تھے، یہ یہود اور نصاریٰ تھے۔ یہ بنی اسماعیل میں سے نہیں تھے۔ اس طرح حضور ﷺ کے ہم نسل نہیں تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے چھوٹے بھائی حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ سے، جن کا لقب اسرائیل تھا، جو نسل چلی وہ اسرائیلی یا بنی اسرائیل کہلائی۔ یہود و نصاریٰ اسی نسل سے تھے۔ اگرچہ حضرت

Salman Saleem 03067163117

ابراہیم پر جا کر یہ دونوں نسلیں مل جاتی ہیں، لیکن چونکہ اسی وقت سے حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی رہائش گاہوں میں اتنا بُعد مکانی تھا کہ جس کے باعث حضرت ابراہیم کی ذرّیت دو علیحدہ نسلوں کی حیثیت سے پھیلی۔ لہٰذا اُسی دور سے یہ جدا جدا نسلیں شمار ہوتی چلی آ رہی ہیں...... پھر بنی اسرائیل کے پاس پہلے آسمانی کتابیں اور صحیفے موجود تھے۔ یہود کے پاس شریعت کا ایک ڈھانچہ بھی موجود تھا۔ چاہے ان چیزوں میں تحریف ہو چکی تھی لیکن بہرحال وہ اہل کتاب تھے اور قرآن مجید نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ان کی کیٹگری کو علیحدہ رکھا گیا اور ان کے متعلق سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ میں احکامات آ گئے۔ فرمایا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبہ:۲۹)

”(اے مسلمانو!) قتال کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں (جیسا کہ اس کے ماننے کا حق ہے) اور نہ روزِ آخرت کو اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اور نہ دین حق (اسلام) کو قبول کرتے ہیں (ان سے جنگ کرو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔“

بنی اسمٰعیل کے لیے تو دو اختیارات میں سے ایک قبول کرنا تھا کہ یا ایمان لائیں یا قتل ہونے کے لیے تیار رہیں...... اس کے نتیجہ میں تیسرا اختیار (Option) از خود بن گیا تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں...... عرب میں رہتے ہوئے کوئی تیسرا option ان کے لیے نہیں تھا۔ عرب میں کسی نوع کی غیر اللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی، چاہے وہ اصنام پرستی ہو، چاہے مظاہرِ قدرت کی پرستش۔ لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ معاملہ مختلف رکھا گیا۔ انہیں رعایت دی گئی اور ان کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں۔ پہلی یہی کہ ایمان لے آؤ تو ہمارے برابر کے بھائی ہو، کوئی مغائرت باقی نہیں رہے گی، حقوق و فرائض میں سب مکمل طور پر مساوی ہوں گے...... یہ منظور نہیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ چھوٹے بن کر رہو۔ دین

Salman Saleem 03067163117

حق کے غلبہ کو تسلیم کرو، نظامِ اجتماعی (Law of the land) اللہ کے دین کے مطابق نافذ و رائج ہوگا اور تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہوگی اور اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ دین اللہ کے تحت تم یہودی یا عیسائی ہو کر رہ سکتے ہو۔ تمہارے احوالِ شخصیہ (Personal Law) میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس کی اجازت ہے۔ لیکن تم چھوٹے بن کر اور جزیہ ادا کر کے اسلامی حکومت کے تحت رہ سکتے ہو...... اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر تیسری صورت قتال کی ہے۔ اس کے سوا چوتھی شکل کوئی اور نہیں۔ اس میں از خود یہ بات بھی مضمر ہے کہ اسلامی حکومت کے دائرہ اختیار سے نکل کر کسی اور جگہ جا کر آباد ہو سکتے ہو۔

سورۃ التوبہ کی یہی وہ آیت ہے جو اسلامی انقلاب کے بین الاقوامی مرحلہ میں بنیاد بنی ہے کہ بعد میں خلافت راشدہ کے دوران جب صحابہ کرامؓ کی فوجیں اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دین حق کے لیے نکلتیں تو وہ ہمیشہ یہی تین شرائط (Options) پیش کرتے تھے۔ (i) ایمان لے آؤ، تم ہمارے برابر کے بھائی ہو گے۔ تمہاری تمام املاک جوں کی توں تمہاری ملکیت میں رہیں گی، ہم کسی کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ ہمارا تمہارا معاملہ ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے بالکل مساوی ہو جائے گا (ii) اگر یہ منظور نہیں کرتے تو تمہیں چھوٹے بن کر رہنا پڑے گا۔ غالب دین اللہ کا ہوگا، حکومت اللہ کی ہوگی، تم ماتحت بن کر اور جزیہ دے کر خواہ عیسائی بن کر رہو، یہودی رہو، مجوسی رہو، ہندو رہو، سکھ رہو، جو چاہو رہو اس کی اجازت ہوگی۔ تمہارے احوالِ شخصیہ میں اسلامی حکومت قطعاً کوئی مداخلت نہیں کرے گی، لیکن تمہیں چھوٹے ہو کر اور اللہ کے دین کو بحیثیت نظامِ اجتماعی ذہناً قبول کر کے اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ لاء آف دی لینڈ اسلام ہی ہوگا...... (iii) اگر یہ دونوں باتیں تمہارے لیے قابل قبول نہیں ہیں تو قتال کے لیے میدان میں آؤ۔ تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کر دے گی۔ چوتھی کوئی شکل نہیں ہے...... تو یہ تین شرائط درحقیقت مذکورہ بالا آیت مبارکہ پر مبنی ہیں۔

(بحوالہ "منہجِ انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم")

Salman Saleem 03067163117

# بیرونِ عرب اسلام کا پھیلاؤ

## دعوت وتبلیغ کے ضمن میں ایک اصولی بات

یہ بات واضح ہونے کے بعد کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت آفاقی و عالمی ہے اور تا قیامِ قیامت حضورؐ ہی کا دورِ رسالت جاری رہے گا، ہمیں سیرتِ مطہرہ کے حوالے سے اور تاریخی اعتبار سے یہ اصولی بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کے مرکز مکہ مکرمہ سے اس وقت تک قدم باہر نہیں رکھا جب تک آپ اہل مکہ سے قطعی طور پر مایوس نہیں ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء عیسوی میں ہوا۔ اس کے بعد سے لے کر مسلسل اٹھارہ انیس برس تک حضور ﷺ کی دعوت وتبلیغ کا دائرہ صرف عرب تک محدود رہا۔ ان میں بھی ابتدائی دس برس تو وہ ہیں کہ آپؐ دعوت وتبلیغ کا کام مکہ ہی میں انجام دیتے رہے۔ اس میں اگر کوئی استثناء ہے تو صرف یہ کہ مکہ کے آس پاس جو میلے لگتے تھے ان میں دعوت وتبلیغ کے لیے آپ ﷺ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان میں عُکاظ کا میلہ یا بازار بہت مشہور ہے۔ یہ ان میلوں میں سب سے بڑا تھا اور اس میں عرب کے کونے کونے سے شعراء اور خطباء آ کر جمع ہوتے تھے، وہاں مجلسیں اور محفلیں جمتی تھیں اور شعراء کے مابین مقابلے ہوا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کا دعوت وتبلیغ کے لیے ان میلوں میں تشریف لے جانا تاریخی طور پر ثابت ہے۔ یا پھر آپؐ اسی مقصد کے لیے ان قافلوں کی طرف تشریف لے جاتے تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف ضروریات کے لیے مکہ آتے تھے اور مکہ سے باہر پڑاؤ ڈالتے تھے، مکہ سے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں لیتے اور پھر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان مستثنیات کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے دعوت وتبلیغ کے لیے کامل دس برس تک مکہ سے باہر قدم نہیں نکالا اور حضور ﷺ کی ساری دعوت وتبلیغ مکہ تک محدود رہی۔

۱۰ نبوی میں دارالندوۃ میں مشورہ کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا گیا۔ چنانچہ اہل مکہ سے نا اُمید ہو کر رسول اللہ ﷺ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا، لیکن اہل طائف کی طرف سے ایک ہی روز میں جس توہین وتذلیل اور جسمانی اذیت سے سابقہ پیش

Salman Saleem 03067163117

آیا اس کی دس سالہ مکی دور میں نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو ایک مشرک مطعم بن عدی کی پناہ لے کر واپس مکہ آنا پڑا۔

جب بظاہر احوال ہر طرف سے راستہ بند نظر آیا تو اللہ تعالیٰ نے یثرب کی طرف ہجرت کا راستہ کھول دیا۔ ہجرت کے بعد چھ برس کے دوران دعوتِ توحید کا دائرہ بتدریج جزیرہ نمائے عرب میں پھیلنے لگا۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ان چھ برسوں کے دوران رسول اللہ ﷺ نے نہ اپنا کوئی داعی یا مبلغ عرب کی حدود سے باہر بھیجا اور نہ ہی اپنے کسی جان نثار کو اپنا نامہ مبارک دے کر یا کوئی پیغام دے کر بیرونِ عرب بھیجا۔ البتہ ۶ ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوگئی، جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا، تب حضور ﷺ کی دعوتی سرگرمیاں جہاں اندرونِ عرب عروج پر پہنچیں، وہاں حضورؐ نے بیرونِ عرب بھی دعوت وتبلیغ کا آغاز فرمایا۔

## دعوت وتبلیغ کے بین الاقوامی مرحلہ کا آغاز

فتح خیبر کے بعد ۷ ھ کے اوائل ہی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے دعوتی وتبلیغی نامہ ہائے مبارک دے کر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیصر روم، کسریٰ ایران، عزیزِ مصر، شاہِ حبشہ اور ان رؤسائے عرب کی طرف بھیجا جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اور جنہوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بعض قبائل قیصر روم کے اور بعض کسریٰ ایران کے باج گزار تھے۔ سیرت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامہ ہائے مبارک کی ترسیل سے قبل مسجد نبویؐ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں حضور ﷺ نے اسی حقیقت کو بیان کیا کہ میری بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام جہان والوں کے لیے رحمت اور رسول بنا کر بھیجا ہے، بفحوائے آیت قرآنی وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۝ میں نے اب تک دعوت تمہیں پیش کی ہے۔ اب اے مسلمانو! تمہارے ذمہ ہے کہ تم اس دعوت اور پیغام کو لے کر تمام اطراف واکناف عالم میں پھیل جاؤ اور اللہ کی توحید کو عام کرو۔ گویا نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلہ کا افتتاح اس خطبہ کے ذریعہ سے فرمایا۔

خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ملوک وسلاطین کو اسلام کی دعوت

Salman Saleem 03067163117

دینے کے لیے خطوط تحریر کرائے اور اپنے مختلف اصحاب کے ہاتھ آس پاس کے علاقوں کے حکمرانوں اور سرداروں کو اپنے نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس ضمن میں "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کا لحاظ ضروری تھا۔ یوں تو ہندوستان بھی تھا، چین بھی تھا، ایشیا اور یورپ کے نہ معلوم کتنے ممالک تھے، لیکن پہلا دائرہ تو قریب کے علاقوں کا ہی ہوسکتا تھا جو جزیرہ نمائے عرب کے چاروں طرف تھا۔

قیصر روم کے دربار میں حضرت دحیہ کلبیؓ نامہ مبارک دے کر بھیجے گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ شکل وصورت میں نبی اکرم ﷺ سے بہت مشابہ تھے اور نہایت حسین تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں تشریف لاتے تھے تو حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن حذیفہ سہمی رضی اللہ عنہ کو خسرو پرویز کسریٰ ایران کی طرف بھیجا گیا۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ عزیزِ مصر کی طرف بھیجے گئے۔ مصر اس وقت ایک نیم آزاد ملک تھا جو سلطنت روما کا باج گزار تھا۔ عزیزِ مصر خود بھی عیسائی تھا اور سلطنت روما کے ماتحت تھا۔ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو شاہِ حبش نجاشی کی طرف بھیجا گیا۔ حبشہ بھی مصر کی طرح سلطنت روما کا باج گزار تھا اور وہاں کا بادشاہ بھی مذہباً عیسائی تھا۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ وہ نجاشیؒ جو آنحضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا ایمان اس اعتبار سے بالکل انفرادی نوعیت کا تھا کہ اس موقع پر کوئی "Mass Conversion" نہیں ہوئی تھی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کے تمام درباری اور پوری رعایا نے اسلام قبول کرلیا ہو، بلکہ قبولیتِ اسلام کا معاملہ ان کی ذات تک محدود تھا۔ جب ان کے انتقال کی خبر بذریعہ وحی آنحضور ﷺ کو ملی تو آپؐ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کے بعد جو نجاشی تخت نشین ہوا وہ عیسائی تھا۔

حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمسؓ رؤسائے یمامہ کی طرف بھیجے گئے۔ یمامہ جزیرہ نمائے عرب ہی کا شمال مشرقی علاقہ ہے۔ آج کل یہ علاقہ نجد میں شامل ہے۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ حدودِ شام میں حارث غسانی کے پاس بھیجے گئے۔ شام بھی اس وقت سلطنت روما کے زیرِ حکومت تھا اور وہاں قیصر کی طرف سے غسانی خاندان حکمران تھا۔ گویا کہ

Salman Saleem 03067163117

شام کی وہی پوزیشن تھی جو انگریزی دورِ حکومت میں برصغیر کی بڑی ریاستوں کو حاصل تھی۔ ان کے علاوہ بعض دیگر رؤساء وسرداران کو بھی حضور ﷺ نے نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔

ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں سلاطین کی جانب سے مختلف ردِعمل سامنے آئے۔

ایک طرف ان بادشاہوں اور حکمرانوں کا ردِعمل ہے جو مذہباً عیسائی تھے۔ ان کے مقابلہ میں بالکل برعکس ردِعمل کسریٰ ایران کا ہے۔ وہ مجوسی تھا، مشرک تھا اور وحی ونبوت اور اُمورِ رسالت سے بالکل نابلد اور ناواقف تھا، جبکہ عیسائیوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اہل کتاب تھے، ان کے پاس تورات اور انجیل موجود تھی۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ناموں سے واقف تھے اور ان سب پر ایمان رکھتے تھے۔ قیصر روم کے بارے میں مستند تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بہت بڑا عالم تھا۔

## قیصرِ روم کے نام حضور ﷺ کا نامہ مبارک

حضرت دحیہ کلبیؓ جو قیصر روم کے نام حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر چلے تھے جب دمشق کے قریب بُصریٰ کے مقام پر پہنچے جو غسانیوں کا دارالحکومت تھا تو ان کو پتہ چلا کہ قیصر ان دنوں یروشلم میں ہے۔ اس وقت اس خاندان کا رئیس حارث غسانی تھا۔ حارث غسانی نے حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کو قیصر کے پاس بیت المقدس بھیج دیا۔ چنانچہ وہ حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر یروشلم پہنچ گئے۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک جب قیصر کو پہنچا تو چونکہ وہ خود توراۃ وانجیل کا عالم تھا لہٰذا خط پڑھتے ہی جان گیا کہ یہ وہی آخری رسول ہیں کہ جن کی بعثت کی ہمارے یہاں پیشین گوئیاں موجود ہیں...... آخر وہ بھی شام کا عیسائی راہب ہی تھا جس نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر دے کر مدینہ کی طرف بھیجا تھا کہ میرا علم بتاتا ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کے ظہور کا وقت آگیا ہے اور ان کی بعثت عرب کے ریگستان اور کھجوروں کے جھنڈ میں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بات عیسائیوں کے خدا ترس رہبان واحبار جانتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت اب قریب ہے...... قیصر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آخری نبی کا ظہور شام میں ہوگا، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بعثت عرب میں ہوگی۔

Salman Saleem 03067163117

نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر اور آپ ﷺ کو پہچان کر قیصر کا جو طرزِ عمل سامنے آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ اگر میری پوری مملکت ایمان لے آئے تو گویا ہم اجتماعی طور پر (En Bloc) مسلمان ہو جائیں گے، اور اس طرح میری مملکت بھی قائم رہے گی اور میری حکومت بھی برقرار رہے گی۔

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ غیر عرب غیر مسلموں کے لیے مسلمانوں کی تین شرطیں ہوتی تھیں۔ ایک یہ کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے، تمہاری تمام املاک، تمہاری عزت و آبرو، الغرض تمہاری ہر شے محفوظ اور برقرار (Intact) رہے گی۔ تمہیں وہ تمام حقوق مساوی طور پر حاصل ہوں گے جو بحیثیت مسلمان ہم کو حاصل ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ منظور نہیں اور تم ایمان نہیں لاتے تو چھوٹے یعنی ماتحت اور ذمی بن کر رہو اور جزیہ ادا کرو: يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبہ: ۲۹) ملکی قانون (Law of the land) بہر صورت اسلام کا ہوگا۔ ہاں کسی کو بزورِ شمشیر اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ تمام غیر مسلموں کو ان کے احوالِ شخصیہ (Personal Law) میں پوری آزادی ہوگی، حتیٰ کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ کا جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں اس میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی...... اور تیسرے یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر میدان میں آؤ، ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ان تین کے سوا چوتھی اور کوئی صورت نہیں ہے۔

قیصر کی اس خواہش اور کوشش کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے کہ اس کے عمائدین سلطنت اور اس کی رعیت مجموعی طور پر ایمان لے آئے اور اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جن لوگوں نے یورپ اور خاص طور پر عیسائیت کی تاریخ پڑھی ہے، ان کے علم میں ہوگا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے قریباً ساڑھے تین سو برس بعد رومۃ الکبریٰ (موجودہ اٹلی) کے شہنشاہ قسطنطین (Constantine) اور اس کی پوری رعایا نے مجموعی طور پر (En Bloc) عیسائیت قبول کر لی تھی۔ لہٰذا کسی نوع کا اعتقادی یا سیاسی مسئلہ اور تنازعہ کھڑا نہیں ہوا اور قسطنطین کی شہنشاہیت جوں کی توں برقرار رہی۔ اسی سبب سے ایک طرف یورپ میں عیسائیت نے فروغ پایا اور دوسری طرف شہنشاہِ روم نے

Salman Saleem 03067163117

اپنا پایۂ تخت روم کو چھوڑ کر استنبول کو قرار دیا۔ چنانچہ اس کے نام پر اس شہر کا نام قسطنطنیہ رکھا گیا۔ وہاں سے اس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ پر فوج کشی کی اور عیسائیت کو فروغ دینے کی مہمات شروع کیں جن میں اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی...... اس تاریخی تناظر میں دیکھئے تو قیصر کا طرزِ عمل سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ نامہ مبارک کے ذریعے حضور ﷺ کو پہچان لینے کے بعد اس نے چاہا کہ اس کی پوری مملکت اسی طرح اسلام کو قبول کرے جیسے قریباً ساڑھے تین سو سال قبل پوری سلطنت روم نے عیسائیت کو بطور مذہب اختیار کر لیا تھا تاکہ اس کی حکومت قائم و برقرار رہے۔

لیکن اس کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اس کے لیے تدبیر کیا ہو؟ اس کے دربار میں بڑے بڑے جغادری عیسائی علماء موجود تھے، قِسّیسین تھے، بِطریق تھے، تمام عمائد و اعیانِ حکومت تھے، پھر فوج تھی، اب ان سب کو کس طرح راضی کیا جائے؟ ان منصب داروں اور امراء (Lords) کے بل پر اس کی حکومت قائم تھی۔ لہٰذا جب تک یہ لوگ مطمئن ہو کر ایمان نہ لائیں اس کی حکومت کو خطرہ لاحق تھا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا، ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی، اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ ان دنوں عربوں کا کوئی تجارتی قافلہ تو یہاں نہیں آیا؟ بتایا گیا کہ عربوں کا ایک تجارتی قافلہ اس علاقے میں آیا ہوا ہے اور فی الوقت غزہ میں مقیم ہے۔ قیصر نے فوراً قاصد بھیج کر قافلے کے لوگوں کو یروشلم بلا لیا۔ اس قافلے کے رئیس ابوسفیان تھے جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔

ہرقل قیصر روم نے ایک عالی شان دربار منعقد کیا۔ اس موقع پر بیت المقدس میں اس کے جو اعیان و عمائد مملکت اور سپہ سالار موجود تھے، ان کو جمع کیا۔ پھر بطارقہ، قِسّیسین اور اَحبار و رُہبان کی صفیں لگائیں اور دربار میں ابوسفیان کو ان کے ہمراہیوں سمیت بلایا گیا۔ پہلے تو دربار میں نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر سنایا گیا۔ (اس نامہ گرامی کا متن ابن ہشام اور طبری نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور بحمد اللہ یہ نامہ مبارک اپنی اصل حالت میں اب بھی استنبول کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔)

نبی اکرم ﷺ کے نامہ مبارک کی عبارت یہ ہے:

((مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلٰی هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ، سَلَامٌ

Salman Saleem 03067163117

عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی، اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدِعَایَةِ الْاِسْلَامِ. اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْاَرِيْسِيِّيْنَ. وَيَا اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ))

''محمد (ﷺ) کی طرف سے، جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ہرقل کے نام جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ سلامتی ہے ہر اُس شخص کے لیے جس نے ہدایت (ربانی) کی پیروی کی۔ اس کے بعد (اے رئیس اعظم!) میں تجھے دعوتِ اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اسلام قبول کر لے تو تُو سلامت رہے گا۔ (بلکہ) اللہ تعالیٰ تجھے دہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر تُو نے (قبول کرنے سے) اعراض کیا (تو نہ صرف تو اکیلا مجرم ٹھہرے گا بلکہ) اہل ملک کا گناہ (بھی) تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف پیش قدمی کرو جو ہمارے اور تمہارے مابین مساوی ہے، (وہ) یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں اور نہ ہی ہم اس ہستی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو (اپنا) پروردگار تسلیم کرے۔ پس اگر وہ (اہل کتاب دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے) اعراض کریں تو (اے مسلمانو!) تم (انہیں) کہہ دو کہ (اے اہل کتاب! ہمارے معاملہ میں) تم گواہ رہو کہ ہم تو (ہر حال میں اس دعوت پر) سرِ تسلیم خم کر دینے والے ہیں۔''

## نامہ مبارک کے چند اہم نکات

نامہ مبارک میں حضور ﷺ نے جو یہ بات رقم کرائی کہ: ((يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ)) تو حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے جو مجھ پر ایمان لاتا ہے، اسے اللہ دوہرا اجر دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ پہلے نبیوں اور رسولوں کو ماننے والا بھی تھا اور اب وہ مجھ پر بھی ایمان لے آیا ہے۔ آگے جو حصہ ہے کہ: ((فَاِنْ

Salman Saleem 03067163117

تَوَلَّيۡتَ فَاِنَّ عَلَيۡكَ اِثۡمَ الۡاَرِيۡسِيّٖنَ)) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی حیثیت ایسی ہوتی ہے جیسے قیصرِ روم کی تھی کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو چاہے پوری رعیت ایمان نہ لاتی لیکن لاکھوں لوگ تو ایمان لے آتے، چنانچہ ان کا اجر بھی اس کے حصہ میں آتا۔ لیکن اس نے روگردانی کی، جس کے باعث رومی دولت ایمان سے محروم ہو گئے تو ان کا وبال بھی قیصر کے حصہ میں آئے گا۔ اس لیے کہ کسی ملک، کسی قوم، کسی قبیلہ کے سربراہ کفر پر اَڑے رہیں تو وہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ جو بھی نظامِ باطل کسی جگہ قائم ہوتا ہے تو وہ نظامِ حق کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اس بات کو ایک مختصر سے جملہ میں نہایت بلاغت وفصاحت کے ساتھ سمو دیا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۴ اپنے نامہ مبارک میں درج کرائی ہے۔ اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں اہل کتاب کو توحید کی دعوت اور اسلام کا پیغام دینے کے جتنے بھی اسالیب آئے ہیں ان میں اس آیت کا اسلوب نہایت بلیغ اور مؤثر ترین ہے۔ نجران سے جب عیسائی اَحبار ورہبان کا ایک وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اسلام کی دعوت سمجھنے کے لیے آیا تھا تو اس موقع پر حضور ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی تھی، اس میں یہ آیت مبارکہ بھی شامل ہے۔ اس سے اس کی عظمت، اس کے جلال، اس کی تاثیر اور اس کے محکم ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس آیت کا ایک ٹکڑا ہے: وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ ''ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا رب نہ بنا لے۔'' اللہ کے سوا جن ہستیوں کو رب بنایا جاتا ہے ان میں مذہبی رب بھی ہوتے ہیں، جیسے اصنام اور مظاہر قدرت کی پرستش، اوتار، حلول اور اسی نوع کے دوسرے عقائد...... اور سیاسی نوعیت کے رب بھی ہوتے ہیں۔ یعنی جسے بھی اللہ کے سوا مختار ومطاعِ مطلق تسلیم کر لیا جائے وہی تسلیم کرنے والوں کا رب ہے۔ درحقیقت فرعون ونمرود نے خدائی کا دعویٰ اسی اعتبار سے کیا تھا کہ وہ بادشاہ اور حاکمِ مطلق ہیں، چنانچہ وہ اپنی رعیت کے رب اور خدا ہیں۔ یہ دراصل سیاسی شرک ہے۔ آج جو لوگ عوام کی مطلق حاکمیت کے نظریہ کے حامی اور پرچارک ہیں وہ اسی سیاسی شرک میں مبتلا ہیں۔ لیکن عظیم اکثریت کو اس کا شعور حاصل نہیں ہے۔

Salman Saleem 03067163117

## قیصر اور ابوسفیان کا مکالمہ

اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے مابین جو مکالمہ ہوا اس پر غور کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے بالکل اسی انداز میں جرح کی جیسے وکلاء بحث و جرح کرتے ہوئے حقائق و دلائل کو واضح کرنے کے لیے Suggestive Questions کرتے ہیں۔ یعنی ایسے سوالات کہ جن کے جوابات کے ذریعے از خود جرح کرنے والے کے موقف کی تائید ہوتی چلی جائے اور بات اس انداز میں کھل کر سامنے آجائے کہ سامعین کے لیے حق کو پہچان لینا بالکل آسان ہو جائے۔ ابوسفیان سے ہرقل نے جس گہرائی کے ساتھ سوالات کیے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کا عالم تھا اور یہ کہ حضور ﷺ کو نبی آخر الزمان کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا ایک قول ملتا ہے، جو ایمان لانے کے بعد کا ہے کہ خدا کی قسم اس مکالمہ کے دوران کئی بار میرا جی چاہا کہ جھوٹ بول دوں، اس لیے کہ قیصر کے سوالات مجھے گھیرتے چلے جا رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی ہے...... لیکن میں نے سوچا کہ میرے ساتھی کیا کہیں گے کہ قریش کا اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے۔ چنانچہ میں جھوٹ نہیں بول سکا۔ اس بات سے عربوں کی یہ ایک مزاجی خصوصیت سامنے آتی ہے کہ دورِ جاہلیت میں بھی بے شمار برائیوں کے باوجود ان میں چند اعلیٰ انسانی اوصاف موجود تھے۔ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے۔

قیصر...... مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان...... شریف ہے۔

قیصر...... اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان...... نہیں۔

قیصر...... اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان...... نہیں۔

قیصر...... جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے، وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان...... کمزور لوگ ہیں۔

قیصر...... اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟

Salman Saleem 03067163117

ابوسفیان...... بڑھتے جا رہے ہیں۔

قیصر...... کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان...... نہیں۔

قیصر...... وہ کبھی عہد واقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان...... ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر...... تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان...... ہاں۔

قیصر...... نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان...... کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر...... وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان...... کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ اس مکالمے کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے یہ تبصرہ کیا:

''تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر اچھے خاندان میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے (تو) پیغمبر کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و

Salman Saleem 03067163117

عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھے یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میں وہاں جاسکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔''

یہ ہے ہرقل قیصر روم کا تبصرہ جو کتب سیر میں محفوظ ہے۔

## قیصر کی بدبختی

اب اصل امتحان آتا ہے جرأت کا، ہمت کا، قربانی کا، ایثار کا۔ اور اس بات کا کہ انسان حق کے لیے کیا کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس مکالمہ کے دوران قیصر نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھ رہی ہے اور درباریوں کو اندازہ ہوتا جارہا ہے کہ قیصر کا جھکاؤ اسلام کی جانب ہے اسی نسبت سے دربار میں موجود بطارقہ اور احبار و رہبان کے نتھنے اندرونی غیظ وغضب کے باعث پھول رہے ہیں، اور برہمی وغصہ سے ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی ہیں اور اسی طرح اس نے اپنے عمائد و اعیانِ حکومت اور اپنے سپہ سالاروں کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھے تو اسے اپنے اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے خوف زدہ ہوکر اس نے عربوں کو دربار سے اٹھا دیا اور رسول اللہ ﷺ کے سفیر حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو کسی جواب کے بغیر واپس جانے کا حکم سنا دیا۔ ورنہ قرائن بتاتے ہیں کہ اس کے دل میں نورِ ایمان کی کرن پہنچ چکی تھی لیکن تاج وتخت، اقتدار وحکومت اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئیں اور حق کی روشنی بجھ گئی۔ اقتدار، حکومت، غلبہ، قیادت وسیادت اور تکبر وہ چیزیں ہیں جو حق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں بن جایا کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں یہود کے علماء کے بارے میں فرمایا گیا: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:۱۴۶) کہ یہ محمد (ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن پہچاننا اور ہے، ماننا اور ہے۔ پھر محض زبانی ماننا اور ہے، دل سے یقین کرنا اور ہے۔ یہ تو کئی مراحل ہیں۔ ع زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است! راہِ حق میں تو بڑی بڑی رکاوٹیں، بڑے بڑے موانع اور بڑے بڑے امتحانات آتے ہیں۔ پس قیصر کی سلطنت وحکومت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی، وہ ایمان نہیں لایا اور محروم رہ گیا۔ بہر حال حضور ﷺ کے نامہ ہائے مبارک کے جواب میں عیسائی بادشاہوں کی جانب سے یہ ایک نمائندہ طرزِ عمل تھا۔

Salman Saleem 03067163117

## دیگر سلاطین کے نام حضور ﷺ کے نامہ ہائے مبارک

### عزیز مصر (مقُوقَس)

اس وقت مصر میں مقوقس نامی شخص کی حکومت تھی جو قیصر روم کے زیر اثر تھا۔ موجودہ اسکندریہ اس کا دارالحکومت تھا۔ قیصر کی طرح مقوقس بھی عیسائی تھا اور صاحب علم شخص تھا۔ وہ ایمان تو نہیں لایا لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا اعزاز و اکرام کیا اور حضور ﷺ کے نامہ مبارک کے جواب میں عربی میں یہ خط لکھا:

لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللهِ مِنَ الْمُقَوْقَسِ عَظِيْمِ الْقِبْطِ، سَلَامٌ عَلَيْكَ أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَرَأْتُ كِتَابَكَ وَفَهِمْتُ مَاذَكَرْتَ فِيْهِ وَمَا تَدْعُوْا إِلَيْهِ، وَقَدْ عَلِمْتُ أَنَّ نَبِيًّا بَقِيَ وَكُنْتُ أَظُنُّ أَنْ يَخْرُجَ مِنَ الشَّامِ، وَقَدْ أَكْرَمْتُ رَسُوْلَكَ وَبَعَثْتُ إِلَيْكَ بِجَارِيَتَيْنِ لَهُمَا مَكَانٌ مِنَ الْقِبْطِ عظيمٌ وَكِسْوَةً وَأَهْدَيْتُ إِلَيْكَ بَغْلَةً لِتَرْكَبَهَا، وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ

"محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے۔ سلام علیک کے بعد: میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا۔ مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی اور آپ کی طرف دو لڑکیاں بھیجتا ہوں، جن کی قبطیوں (مصر کی قوم) میں بہت عزت کی جاتی ہے۔ اور میں آپؐ کے لیے پوشاک اور سواری کے لیے ایک خچر (بطور ہدیہ) بھیج رہا ہوں۔ والسلام"

مقوقس نے جو دو لڑکیاں بھیجی تھیں، وہ کنیزیں یا لونڈیاں نہیں تھیں بلکہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ دونوں اثناءِ سفر میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی تبلیغ و تعلیم سے ایمان لے آئی تھیں۔ ان میں ایک حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے حرم میں شامل

Salman Saleem 03067163117

ہوئیں۔ دوسری جن کا نام سیرین تھا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے حبالہ عقد میں آئیں۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ خچر کا نام دُلدل تھا۔ جنگِ حنین میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر سوار تھے۔

## نجاشی شاہِ حبشہ

علامہ شبلیؒ نے اپنی تحقیق کے مطابق نجاشی کے متعلق جو لکھا ہے وہ درج ذیل ہے:

''نجاشی بادشاہ حبش کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں''۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرضِ نیاز کے لیے بھیجا، لیکن جہاز ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی۔''

علامہ شبلیؒ نے یہ روایت طبری کے حوالے سے لکھی ہے۔ آگے علامہؒ لکھتے ہیں:

''عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ ھ میں وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ اس کے جنازے کی نماز پڑھائی، لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا۔'' (واللہ اعلم)

ان تین عیسائی بادشاہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ انہوں نے نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نامہ گرامی کی کوئی توہین کی، بلکہ ہرقل قیصر روم کے رویہ سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کی پوری مملکت اجتماعی طور پر اسلام کی دعوت قبول کرے لیکن اس کوشش میں وہ ناکام ہوگیا اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔

## کسریٰ ایران

ایران میں اس وقت خسرو پرویز فرمانروائے سلطنت تھا اور پچھلے شہنشاہوں کی طرح

Salman Saleem 03067163117

''کسریٰ'' کے لقب سے ملقب تھا۔ اس کا طرزِ عمل عیسائی بادشاہوں کے بالکل برعکس تھا۔ وہ مجوسی یعنی آتش پرست تھا اور وحی، نبوت اور رسالت کے بارے میں قطعی لاعلم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک پڑھ کر وہ نہایت برہم ہو گیا اور اس نے نہایت تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔ اس کے نام حضور ﷺ کا نامہ مبارک جو علامہ شبلیؒ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، درج ذیل ہے:

((بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِس، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَاٰمَنَ بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا. اَسْلِمْ تَسْلَمْ فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ))

''خدائے رحمن و رحیم کے نام سے، محمد ﷺ پیغمبر خدا کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام، سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور یہ کہ اللہ نے مجھے تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تا کہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔ تو اسلام قبول کر لے تو سلامت رہے گا، ورنہ مجوسیوں (کے اسلام قبول نہ کرنے) کا وبال بھی تیری گردن پر ہو گا۔''

## خسرو پرویز کا غرور اور گستاخی

بادشاہت کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر ہر بادشاہ مغرور ہو ہی جاتا ہے، لیکن خسرو پرویز بہت زیادہ مغرور تھا۔ اس کے دور میں دربارِ شاہی کو جو عظمت و شوکت اور جلال حاصل ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس کے نام رسول اللہ ﷺ کا نامہ مبارک لے کر حضرت عبداللہ بن حذیفہ رضی اللہ عنہ گئے تھے۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں بادشاہ کا نام پہلے ہوتا تھا اور مکتوب نگار کا بعد میں۔ حضور ﷺ کے نامہ مبارک کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے بسم اللہ، پھر خود حضور ﷺ کا اسم گرامی تھا اور پھر کسریٰ کا نام تھا۔ یہ

Salman Saleem 03067163117

دیکھ کر کسریٰ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر نہایت گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ نقل کفر کفر نہ باشد، اس نے حضرت عبداللہؓ سے کہا کہ اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کرا دیتا، تمہارے صاحب کی یہ جرأت کہ میرے غلام ہوتے ہوئے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا۔ ایسا گستاخ شخص! میں ابھی اس کی گرفتاری کا فرمان جاری کرتا ہوں اور اسے بلوا کر اپنے دربار میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔[۱] ان گستاخانہ کلمات کے ساتھ اس نے نبی اکرم ﷺ کا نامہ مبارک چاک کر ڈالا[۲]۔

## نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئی

بعد میں جناب رسول اللہ ﷺ کو خسرو پرویز کی اس گستاخی کی خبر پہنچی تو آپؐ نے بطور پیشین گوئی فرمایا کہ ''اس نے میرا خط نہیں پھاڑا، اپنی سلطنت کے پرزے اُڑا دیئے۔'' اُس وقت عالم واقعہ میں تو کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کسریٰ موجود تھی، اس کی لاکھوں کی فوج تھی، اس کی سلطنت لاکھوں میل پر پھیلی ہوئی تھی، اس کی سطوت، شان و شوکت اور رعب و دبدبہ مرعوب کن تھا۔ اس کے پرزے تو کئی سال بعد بھی خلافتِ فاروقی کے دور میں ہونے شروع ہوئے اور اس کی تکمیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے ابتدائی تین چار سالوں میں ہوئی۔ لیکن حضور ﷺ نے اسی وقت پیشین گوئی فرما دی کہ کسریٰ کی سلطنت کے پرخچے اُڑ جائیں گے اور اس کا نام تک باقی نہیں رہے گا۔

## خسرو پرویز کا انجام

خسرو پرویز نے حضور ﷺ کے قاصد اور آپؐ کے نامہ مبارک کے ساتھ گستاخی پر ہی بس نہیں کیا، بلکہ اس نے یمن میں اپنے گورنر کو جو ایرانی تھا، فرمان بھیجا کہ ''یہ مدینہ کا کون گستاخ شخص ہے جس نے میری شان میں ایسی گستاخی کی ہے اور جو نبوت کا مدعی ہے، اسے

---

(۱) یمن میں اس وقت ایران کی حکومت تھی اور ایران کے بادشاہ پورے عرب کو آزاد قبائل کا علاقہ سمجھتے تھے اور اسے اپنی قلمرو کا حصہ گردانتے تھے۔

(۲) واضح رہے کہ اس وقت کسریٰ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک کا ترجمہ تھا جسے اس نے چاک کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا اصل نامہ مبارک محفوظ رہا۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو"۔ باذان گورنر یمن نے اپنے دو گماشتوں کو مدینہ بھیجا۔ ان دونوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر کہا کہ ہمارے شہنشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ اگر آپ حکم کی تعمیل نہیں کریں گے تو وہ آپ کو اور آپ کے پورے ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ اس پر حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ تمہارا بادشاہ رات کو اپنے بیٹے (شیرؤیہ) کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اب تم واپس جاؤ اور اپنے گورنر سے کہہ دینا کہ جلد ہی اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ چنانچہ خسرو پرویز کا یہ انجام ہوا کہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا، جس کی خبر حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے پہنچائی۔

## قیصر و کسریٰ کے انجام میں ایک نمایاں فرق

نبی اکرم ﷺ کے دورِ سعید ہی میں اس دور کی دونوں عظیم سلطنتوں یعنی روم و فارس سے مسلمانوں کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی، جس نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں باقاعدہ جنگوں کی صورت اختیار کر لی، جن کے دو علیحدہ علیحدہ نتائج نکلے۔ وہ یہ کہ جہاں تک قیصر روم کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ شام کے تمام علاقوں سے بالکل بے دخل کر دیا گیا تھا، اور شمالی افریقہ کے تمام علاقے از مصر تا مراکش اس کی فرمانروائی میں نہیں رہے تھے، لیکن اس کی حکومت بالکل ختم نہیں ہوئی، بلکہ ایشیائے کوچک کے تھوڑے سے علاقے اور بلقان کی ریاستوں میں اس کا اقتدار قائم رہا۔ قسطنطنیہ جو اس کا پایۂ تخت تھا وہ بعد میں پندرھویں صدی عیسوی میں ترکانِ عثمانی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ خلافتِ راشدہ میں اس کی حکومت کا بالکل ختم نہ ہونا اس کے اس رویہ کی برکت تھی جو اس نے نبی اکرم ﷺ کے نامہ مبارک کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس خلافتِ فاروقی میں کسریٰ کی حکومت قریباً ختم ہو چکی تھی جس کا خلافت عثمانیہ میں نام بھی باقی نہیں رہا۔ یزدگرد مارا گیا اور وہ پورا علاقہ جو کسریٰ عظیم فارس کے زیر نگیں تھا اسلامی حکومت کا جزو بن گیا۔ یہ انجام تھا اس گستاخانہ رویے کا جو خسرو پرویز نے حضور ﷺ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی صورت میں کیا تھا۔ یہ ایک نمایاں فرق ہے جو ہمیں تاریخ اسلام کے قرنِ اول میں نظر آتا ہے۔

Salman Saleem 03067163117

# بیرونِ عرب مسلّح تصادُم کا آغاز

## غزوۂ مُوتہ

صلح حدیبیہ کے بعد ۷ ھ کے بالکل اوائل میں حضور ﷺ نے ان رؤساءِ عرب کے نام بھی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے تھے جو عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ ان میں غسان کا قبیلہ تعداد میں بھی بڑا تھا اور کافی طاقت ور بھی تھا۔ اس قبیلہ کے لوگ اگرچہ عرب تھے، لیکن ایک مدت سے عیسائی تھے۔ یہ قبیلہ قیصر روم کے ماتحت اور اس کا باج گزار تھا۔ اس وقت قبیلہ کا رئیس وحکمران شُرَحْبِیل بن عمرو نامی شخص تھا۔ اس کے پاس حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ بطورِ قاصد حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ اس بدبخت نے حضور ﷺ کے قاصد کو شہید کر دیا۔ حضورؐ نے انؓ کے خون کے قصاص کے لیے تین ہزار کا لشکر تیار کر کے جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں شام کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور پہلے ہی سے معین کر دیا کہ اگر ان کو دولتِ شہادت نصیب ہو تو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی) سپہ سالار ہوں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہوں گے جو انصاری تھے اور مشہور شاعر تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو لشکر کی سرداری اور سپہ سالاری کس بنا پر سپرد کی گئی ہے۔ لیکن اسلام جس مساواتِ عام کو قائم کرنے کے لیے آیا تھا اس کے لیے یہ عملی نظیر ضروری تھی تاکہ لوگوں میں ایثار کا جذبہ پیدا ہو اور امیر خواہ کوئی بھی ہو اس کی اطاعت فی المعروف کی تربیت حاصل ہو...... مرضِ وفات کے شروع ہونے سے قبل حضور ﷺ نے انہی زیدؓ بن حارثہ کے

Salman Saleem 03067163117

فرزند حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا افسر وامیر مقرر کیا تھا جو شام کی سرحدوں کی طرف بھیجا جانے والا تھا۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مساواتِ انسانی کے محض وعظ ارشاد نہیں فرمائے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس طور پر تزکیہ فرمایا تھا کہ وہ لوگ جو نسلی اور قبائلی تفاخر کو حرزِ جان بنائے رکھتے تھے ایک کنگھی کے دندانوں کی طرح باہم مربوط اور بنیانِ مرصوص بن گئے تھے۔ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اسی نوع کے واقعات کو دیکھ کر ایچ جی ویلز جیسے دشمن اسلام کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ ''مساواتِ انسانی، اخوت اور حریت پر نہایت بلند پایہ مواعظ تو حضرت مسیح علیہ السلام کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اصولوں پر دُنیا میں سب سے پہلا عملی معاشرہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قائم فرمایا۔''

اگرچہ یہ مہم قصاص لینے کے لیے بھیجی گئی تھی، لیکن چونکہ تمام مہمات کا بنیادی وحقیقی مقصد اسلام کی تبلیغ و دعوت تھا اس لیے لشکر کی روانگی سے قبل اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات دیں اور ارشاد فرمایا کہ راہ میں جو قبائل آباد ہیں ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور شُرحَبیل بن عمرو غسانی کو بھی پہلے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ قبول کر لے تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کے ساتھ مدینہ سے باہر کچھ دور تک بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔

اِدھر مدینہ میں مسلمانوں کا لشکر ترتیب پا رہا تھا اور اُدھر جاسوسوں نے شُرحبیل کو خبر کر دی۔ چنانچہ شُرحبیل نے اس لشکر کے مقابلہ کے لیے قریباً ایک لاکھ کی فوج تیار کی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ معاملہ قصاص اور انتقام کا ہے، لہٰذا جنگ ضرور ہوگی۔ پھر خود قیصر روم (ہرقل) ایک بہت بڑی فوج لے کر غسانیوں کے دارالحکومت بصریٰ سے چند میل کے فاصلہ پر آ کر بیٹھ گیا تاکہ اگر غسانی شکست کھائیں تو وہ ان کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر پہنچ جائے۔ اہل ایمان کے لشکر کو جب غسانیوں کی تیاری اور اس کی پشت پر ہرقل کی فوج کی موجودگی کا علم ہوا تو مشورہ ہوا کہ ان حالات میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہاں صرف تین ہزار اور کہاں ایک لاکھ! گویا ایک اور تینتیس کی نسبت بن رہی تھی، چنانچہ مشورہ ہوا کہ دریں حالات مقابلہ کا خطرہ (Risk) مول لینا چاہیے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی جائے اور توقف کر کے آپ ؐ کے حکم کا انتظار کیا جائے۔

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

## شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن!

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ ہمیں سردست مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اٹھے اور انہوں نے تقریر کی کہ مسلمانو! ہم دنیا کے طالب ہو کر نہیں نکلے، فتح اور شکست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ہم تو شہادت کے متمنی ہیں، اللہ نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے تو ہم تاخیر کیوں کریں؟"۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ فیصلہ ہو گیا کہ مقابلہ کیا جائے گا...... چنانچہ تصادم ہو گیا۔ اب کہاں تین ہزار کہاں ایک لاکھ! لیکن جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت سے سرشار یہ مختصر سا لشکر ایک لاکھ کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب انہوں نے علم سنبھالا اور لشکر ان کی قیادت میں آیا تو گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کی ٹانگوں پر تلوار ماری اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تاکہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے۔ پھر نہایت بے جگری سے دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ایک ہاتھ قلم ہوا تو دوسرے ہاتھ میں علم تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہوا تو باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا تاکہ علم ان کے جیتے جی زمین بوس نہ ہو۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گرے اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے کٹے ہوئے دو بازوؤں کی جگہ دو پر عطا فرما دیئے ہیں جن سے وہ جنت میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ اسی وقت سے آپ کا لقب "طیار" قرار پایا اور وہ جعفر طیار کے نام سے موسوم ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو اس غزوہ میں شریک تھے، ان کا بیان ہے کہ میں نے جعفر رضی اللہ عنہ کی لاش بعد میں خود دیکھی تھی، اس پر تلواروں اور برچھیوں کے نوے زخم تھے، لیکن سب سامنے کی طرف تھے، پشت پر کوئی زخم نہیں تھا۔ یہ تھے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔

## خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یکے بعد دیگرے سپہ سالار نامزد کیا تھا، لیکن مزید کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ چنانچہ جب وہ تینوں شہید ہو گئے تو اب مسلمانوں کے لشکر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کمان سنبھالی اور نہایت بہادری اور بے جگری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس غزوہ میں ان کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گریں (1)۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ تھا۔ اس نازک صورت حال میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ایسی جنگی چال کے ذریعے رومیوں کو مرعوب کر کے اتنی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کو پیچھے ہٹالیں کہ رومیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہو، جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ یہ روایات بھی موجود ہیں کہ غسانیوں کے ہراول دستے نے جب حملہ کیا تو واقعتاً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور ہراول دستہ شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ بعد میں دشمن کی پوری فوج نے یکبارگی حملہ کر کے مسلمانوں کی فوج کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے پہاڑ کی جانب سے دشمنوں کا گھیرا توڑا اور اپنے لشکر کو لے کر پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے اور اس طرح اپنی فوج کو دشمنوں کے حملوں سے بچا لائے۔

جب یہ فوج مدینہ پہنچی تو بعض روایات میں آتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ بھاگ کر آئے ہیں۔ چند لوگوں نے شہر سے باہر نکل کر ان پر کنکریاں اور ریت پھینکی کہ تم لوگ بھگوڑے ہو۔ تم لوگ اللہ کی راہ میں قتال کے لیے گئے تھے لیکن اپنی جان بچا کر آ گئے ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مدینہ سے باہر تشریف لائے۔

---

(1) صحیح بخاری ''غزوۂ موتہ'' کے باب میں حدیث ہے کہ جنگ موتہ کی خبر وحی کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مل رہی تھی۔ آپ نے ازروئے وحی فرمایا ''اب اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد بن ولید سیف من سیوف اللہ نے مسلمانوں کا علم اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا''۔ حدیث میں الفاظ آئے ہیں ''فتح اللہ علیہم'' غلبہ اور فتح کی تشریح میں ارباب سیر اور اہل روایت کی مختلف آرا ملتی ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے ان کو اپنی تالیف سیرۃ النبیؐ میں ''غزوہ موتہ'' کے باب کے اختتام پر حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید کا لقب ''سیف اللہ'' اسی حدیث کی رو سے مشہور ہوا۔ (مرتب)

Salman Saleem 03067163117

آپ نے بڑے تپاک سے فوج کا استقبال کیا اور یہ ارشاد فرما کر ان کو تسلی دی کہ تم مفرور نہیں ہو، بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو...... جیسے سورۃ الانفال میں آ چکا تھا کہ پینترا بدلنے اور جنگی چال کے طور پر یا نئی قوت کے ساتھ پھر مقابلہ کی نیت کے ساتھ پیچھے ہٹا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ غزوۂ موتہ سے بچ کر آنے والے اہل ایمان دراصل اس زُمرے میں آتے تھے، یہ جان بچا کر فرار نہیں تھا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اس فوج کو تسلی دی۔ اِدھر نہ صرف غسانی بلکہ سارا عرب اور مشرق وسطیٰ یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ مسلمانوں کے جتنے لوگ شہید ہوئے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں کفار مقتول ہوئے۔ پھر ایک لاکھ کی فوج کے نرغہ سے تین ہزار کی مختصر سی فوج کو بچا لے جانا بھی فوجی اعتبار سے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور عراق کی سرحدوں پر آباد قبائل اور نجدی قبائل کو اسلام کی دعوتِ توحید سے متاثر کیا اور اس غزوہ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں ان قبائل کے لوگ ایمان لے آئے۔

## غسانیوں کا خوف اور جنگی تیاریاں

جنگِ موتہ کے اس معرکے نے غسانیوں اور رومیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کو خوف لاحق ہو گیا کہ مسلمان چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ وہ یقیناً دوبارہ حملہ کریں گے۔ چنانچہ ایک طرف غسانیوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں، دوسری طرف انہوں نے قیصر روم کو لکھا کہ اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، امسال پورا عرب قحط میں مبتلا ہے، لہٰذا یہ بہترین موقع ہے کہ اس اُبھرتی ہوئی قوت کو کچل دیا جائے۔ چنانچہ ہرقل نے بھی چالیس ہزار کی فوج شام بھیج دی اور خود مزید فوج کے ساتھ حمص پہنچ گیا۔ اس طرح غسانیوں اور رومیوں نے ایک لشکر جرار تیار کر لیا۔

## غزوۂ تبوک

شام اور عرب کے مابین تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ تاجروں کے ذریعہ سے یہ خبر پورے عرب میں پھیل گئی کہ غسانی رومی فوج کے ساتھ مل کر عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی یہ خبریں برابر مل رہی

Salman Saleem 03067163117

تھیں چنانچہ آپؐ نے بھی فوج کی تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضور ﷺ کی طرف سے نفیر عام ہوئی۔ یعنی ہر مسلمان جس کو کوئی عذر شرعی لاحق نہ ہو اس کا اس غزوہ کے لیے نکلنا اور فوج میں شامل ہونا لازم قرار دے دیا گیا۔ اس سے قبل یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کہیں کوئی مہم بھیجنی ہوتی تھی تو نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرماتے اور مہم کے لیے مطلوبہ تعداد کے مطابق یا خود انتخاب فرماتے یا ان اصحاب کو شامل فرما لیتے جو خود کو اس مہم کے لیے پیش کرتے۔ لیکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ چنانچہ نفیر عام کے نتیجہ میں تیس ہزار کی فوج تیار ہو گئی اور آپؐ اس لشکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔

سورۃ التوبہ کا اکثر حصہ غزوۂ تبوک سے متصلاً قبل اور متصلاً بعد کے واقعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ یہی موقع ہے کہ جس میں منافقین کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور ان کے نفاق کا پردہ چاک ہوتا ہے۔

## صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سخت ترین امتحان

غزوۂ احزاب کی طرح غزوۂ تبوک بھی صحابہ کرامؓ کے لیے نہایت سخت امتحان کا موقع تھا۔ اس لیے کہ اب ٹکراؤ وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک طاقت یعنی سلطنت روما سے درپیش تھا۔ اب بات عربوں کی باہمی جنگ کی نہیں تھی جہاں ایک اور تین چار یا ایک اور دس یا بیس کی نسبت ہو۔ اب تو سلطنتِ روما سے ٹکراؤ کا مسئلہ درپیش تھا کہ جس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت باقاعدہ فوجیں تیار رہتی تھیں، جو اس دور کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں۔ غسانیوں نے لاکھوں کا لشکر تیار کر رکھا تھا، جس کی پشت پر خود ہرقل قیصر روم اپنی کثیر فوج کے ساتھ شام میں موجود تھا اور وہ کسی طرح بھی اپنے ان مقبوضات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک طرف یہ صورتِ حال تھی، دوسری طرف عالم یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کا اتنا سخت امتحان لیا کہ ہر مسلمان کا جنگ کے لیے نکلنا لازم فرمایا، اِلّا یہ کہ وہ ضعیف یا بیمار ہو۔ پھر یہ کہ قحط کا عالم اور شدت کی گرمی کا موسم تھا کہ لوگوں کو ویسے بھی گھر سے نکلنا شاق گزرتا تھا۔ ان حالات میں طویل سفر گویا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر منافقین کا پردہ چاک ہو گیا، جو خود بھی جنگ کے لیے نکلنے سے جی چراتے تھے اور

Salman Saleem 03067163117

دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ ((لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ))(التوبۃ:۸۱) "گرمی میں نہ نکلو"۔ مزید یہ کہ کھجوروں کی فصل تیار تھی اور یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اب چلے گئے تو یہ کھجوریں کون اُتارے گا۔ یہ درختوں ہی پر گل سڑ کر ختم ہو جائیں گی۔ پہلے ہی کھانے کے لالے پڑے ہیں، یہ فصل بھی اگر برباد ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟

سب پر مستزاد یہ کہ طویل ترین سفر اور سلطنت روما سے ٹکراؤ کا مرحلہ درپیش تھا، لہٰذا ساز و سامان بھی کافی درکار تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دے رہے تھے کہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مالی انفاق بھی کرو۔ نبی اکرم ﷺ کی اس ترغیب کے نتیجہ میں پرستارانِ حق نے ساز و سامان کی فراہمی میں اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آسودہ حال تھے انہوں نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا نصف ساز و سامان اور اثاثہ جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا اثاثہ نذر کر دیا اور گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ غریب صحابہ رضی اللہ عنہم نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا لا کر حاضر کر دیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک باغ میں پانی سینچا اور اس کے معاوضہ میں اِنہیں جو کھجوریں ملیں وہ لا کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اُتار کر دے دیئے۔ الغرض تمام اہل ایمان میں جوشِ جہاد کی لہر دوڑ گئی۔

یہ نفیر عام اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب منافقوں کے لیے کسوٹی بن گئی۔ اس موقع پر پیچھے رہ جانے اور انفاق سے ہاتھ روکنے کے معنی یہ تھے کہ ایسے شخص کا اسلام کے ساتھ تعلق کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا۔ چنانچہ منافقین کے لیے یہ موقع ان کے نفاق کا پردہ چاک کرنے کا سبب بن گیا۔ دوسری طرف وہ اہلِ ایمان بھی تھے جو سواریوں کی کمی اور سامان کی قلت کی وجہ سے تبوک کے سفر پر جانے سے معذور تھے۔ حالانکہ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلیں۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں رو رو کر کہتے کہ اگر آپؐ ہمیں بھی لے چلیں تو ہماری جانیں قربان ہونے کے لیے حاضر ہیں۔ ان مخلصین کی بے تابیوں کو دیکھ کر حضور ﷺ کا دل بھر آتا تھا...... چنانچہ سورۃ التوبہ میں جہاں ضعفاء اور مریضوں کو اس غزوہ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے تسلی دی گئی وہاں ان مخلص اہلِ

Salman Saleem 03067163117

ایمان صحابہ کی تسلی کے لیے یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ○ (التوبہ: ۹۲)

''اور (اسی طرح) ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے جو (اے نبی) آپؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہم کو سواری دیجئے (تا کہ ہم بھی ساتھ چلیں) تو آپؐ نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہم اس جہاد میں حصہ لینے کی مقدرت نہیں رکھتے۔''

## تبوک کی طرف کوچ

الغرض رجب ۹ھ میں نبی اکرم ﷺ نے ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے شام کی طرف کوچ فرمایا اور تبوک کے مقام پر قیام فرمایا جو شام اور جزیرہ نمائے عرب کا سرحدی مقام ہے۔ اس سفر میں دس ہزار گھڑسوار آپؐ کے ہمراہ تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔

## قیصر کا جنگ سے اعراض

غسانیوں نے لاکھوں کی فوج تیار کر رکھی تھی اور قیصر نے چالیس ہزار رومی سپاہ ان کی مدد کے لیے بھیج رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ غسانیوں کی مدد کے لیے حمص میں موجود تھا۔ لیکن جب قیصر کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا جو لشکر مدینہ سے آ رہا ہے اس کی قیادت خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں تو اس نے غسانیوں اور رومی فوجوں کو حکم بھیجا کہ سرحد سے تمام فوجیں واپس چلی آئیں۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ حضور ﷺ اللہ کے رسولؐ ہیں اور یہ کہ اللہ کے رسولؐ سے مقابلے کا نتیجہ شرمناک شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ پھر غزوۂ موتہ میں ایک جانب تین ہزار اور دوسری جانب ایک لاکھ فوج کے مقابلہ کی جو کیفیت اس کے علم میں تھی تو اس کے بعد اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ تیس ہزار فدائین کے اس لشکر سے مقابلہ کرے جس کی کمان خود نبی اکرم ﷺ فرما

Salman Saleem 03067163117

رہے تھے۔ حالانکہ اُس وقت اس کے پاس غسانیوں اور رومیوں کی دو لاکھ سے بھی زیادہ فوج موجود تھی۔ چنانچہ وہ طرح دے گیا اور اس نے سرحد سے تمام فوجیں واپس ہٹا کر مسلح تصادم کا ہر امکان روک دیا۔

## نبی اکرم ﷺ کے اقدامات

نبی اکرم ﷺ نے اس مرحلہ پر قیصر کے اعراض اور پسپائی کو کافی سمجھا اور از خود تبوک سے آگے بڑھ کر شام کی سرحد میں داخل ہونے کے بجائے اس بات کو ترجیح دی کہ اس طرح لشکر اسلام کو جو اخلاقی اور نفسیاتی فتح حاصل ہوئی تھی اس سے زیادہ سے زیادہ سیاسی اور جنگی فوائد حاصل کیے جائیں۔ حضور ﷺ وہاں بیس دن تک مقیم رہے تا کہ اگر قیصر مقابلہ میں آتا ہے تو آئے...... اس عرصہ کے دوران آپ ﷺ نے سرحد کے اردگرد جو قبائل آباد تھے، ان کے رئیسوں اور سرداروں سے معاہدے کیے اور اس طرح اس علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنالی۔ گویا ہجرت کے بعد غزوۂ بدر سے قبل حضور ﷺ نے قریش کے خلاف جو اقدام (Active Resistance) کیا اور قریش کی سیاسی ناکہ بندی (Political Isolation) کی، وہی کام حضور ﷺ نے تبوک کے ۲۰ یوم کے قیام کے دوران انجام دیا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

الغرض یہ ہیں سیرت کے وہ اہم واقعات یعنی سلاطین و رؤساء کو نامہ ہائے مبارکہ کی ترسیل، جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک جن سے انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی تصدیر (Export) کے کام کا آغاز ہوا۔ یعنی جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اب اطراف و اکنافِ عالم میں حضور ﷺ کی انقلابی دعوت پہنچانے اور توحید کا علم کرۂ ارضی پر بلند کرنے کا جو کام اُمت کے سپرد تھا، اس کا راستہ حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس کھول دیا۔

## حجۃ الوداع

نبی اکرم ﷺ نے ۱۰ھ میں فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد آپ ﷺ کا یہی پہلا اور آخری حج ہے۔ اسی لیے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا مشن اُمت کے حوالہ فرما دیا۔ اس موقع پر سوا لاکھ کا مجمع موجود تھا۔ آپؐ نے پہلے تو مجمع سے گواہی لی کہ میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا کہ نہیں؟ جب تین مرتبہ

Salman Saleem 03067163117

پورے مجمع نے اقرار کیا کہ بے شک آپؐ نے حق تبلیغ، حق نصیحت اور حق امانت ادا فرمادیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''یعنی (میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا) اب وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں (ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو) پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی میں گویا یہ بات ازخود مضمر ہے کہ میں نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی ہے اور اس عمل کا آغاز کر دیا ہے جس کا تعلق بین الاقوامی مرحلہ سے ہے۔ لہٰذا انقلاب کی عالمی سطح پر تکمیل کی ذمہ داری اب تمہارے کاندھوں پر ہے۔

## رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت

حجۃ الوداع کے بعد ۱۲/ ربیع الاول ۱۱ھ تک حضور ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے ۸۰ دن بنتے ہیں جس کے بعد ((اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى)) فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے اس دُنیا سے پردہ فرمایا اور رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس مراجعت سے چند دن قبل آپؐ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کے لیے ایک لشکر تیار فرمادیا تھا، جسے بجا طور پر اس بات کا ثبوت قرار دیا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس انقلاب کی بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کرنے کے لیے اُمت اور اپنے جانشینوں کے لیے ایک واضح لائحہ عمل کی جانب رہنمائی فرمادی تھی اور اس ضمن میں قابلِ تقلید عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا تھا۔

(بحوالہ ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'')

Salman Saleem 03067163117

سکین بائے ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

Salman Saleem 03067163117

# نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف:۱۵۷)

ربیع الاول کے مہینے میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی تھی' لہٰذا اس مہینے میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانہ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت و عقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ ہم نے بحیثیت امتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیے۔ یہ جھوٹا اطمینان (Pseudo Satisfaction) عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہئے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے اور ہم سے خدا کے ہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہوگا؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کریں اور اس ضمن میں جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کا ازالہ کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اگر ہم یہ ارادہ لے کر سیرت کی کسی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر وہاں سے اٹھیں تو یہ یقیناً فائدے کی بات ہے اور آخرت کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔

Salman Saleem 03067163117

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کے تقاضوں کو واضح کرنے کے لیے میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ ازروئے قرآن مجید نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے لیے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت 157 کا آخری جزو منتخب کیا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۵۷)

''پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور جنہوں نے ان کی مدد اور حمایت کی (یعنی ان کے مشن میں ان کے دست و بازو بنے' اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں''۔

جس آیت کریمہ کا آخری جزو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ پوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل تخاطب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ ''الرسول النبی الامی'' ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں اور جن کی آمد کی خوش خبری انبیاءِ سابقین دیتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس آ گئے ہیں' یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں' تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بے جا وزن اور بوجھ لاد رکھے ہیں اور رسوم و قیود کی جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں' ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں...... اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۵۷)

Salman Saleem 03067163117

آیت کریمہ کے اس حصے پر غور کرنے سے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق کی چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

☆ پہلی یہ کہ حضور ﷺ پر ایمان لایا جائے، آپ کی تصدیق کی جائے۔

☆ دوسری یہ کہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔

☆ تیسری یہ کہ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔

☆ چوتھی یہ کہ حضور ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لیے اس مینارۂ نور سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں پیش کر دی جائیں، جو اگرچہ تفصیل کی متقاضی ہیں، لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کر دی جائیں جو ہمارے لیے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

## ① ایمان

متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اولین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ کو اللہ کا نبی، اللہ کا رسول، اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اقرار و یقین کا نام "ایمان" ہے اور اسی سے ہمارے اور حضور ﷺ کے مابین ایک تعلق اور رشتے کا آغاز ہوتا ہے۔ امت مسلمہ میں اگرچہ سادات اور ہاشمی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، لیکن عظیم اکثریت یقیناً ان لوگوں کی ہے جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہر امتی کو حضورؐ کے ساتھ ایک نسبت و تعلق حاصل ہے اور یہی تعلق سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے، یعنی ایمان کا تعلق، اس یقین کا تعلق کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو پورے عالَم کے لیے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کیے گئے اور جو تمام بنی نوعِ آدم کے لیے

Salman Saleem 03067163117

بشیر ونذیر بنا کر بھیجے گئے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸)

''اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر!)''

اکثر و بیشتر حضرات کے علم میں ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ میں ان دو درجوں کے لیے دو اصطلاحیں آئی ہیں' ایک اِقْرَارٌ بِاللِّسَان اور دوسری تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْب ۔یعنی نبی اکرم ﷺ پر ایمان کے ضمن میں زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقین کامل رکھنا۔ ان کو آپ ایمان کے دو درجے' دو مراتب یا دو پہلو کہہ سکتے ہیں اور جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے لیکن دل میں یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے بلکہ آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے' لیکن ان کے دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانہ جہنم قرار پایا' بلکہ جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ ازروئے الفاظ قرآنی: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (النساء: ۱۴۵) ''یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے''۔ اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضور ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانون شریعت کی رو سے ایسا شخص کافر قرار پائے گا۔ دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اور آخرت میں وہی شخص مومن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو' جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابدالآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرار

Salman Saleem 03067163117

باللسان اور تصدیق بالقلب لازم وملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

## ۲ توقیر و تعظیم

ایمان کے دونوں درجوں کو لازم وملزوم سمجھنے سے یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ میں آ جائے گی کہ ایمان جب یقین قلبی کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات لازماً پیدا ہونے چاہئیں۔ اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد عَزَّرُوْهُ کے لفظ میں آیا ہے۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ یعنی ''پس وہ لوگ جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی''۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ آپ ہمارے خالق' ہمارے مالک' ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں' اُس کے پیغامبر ہیں' اُس کے رسول ہیں جنہیں اُس نے ہماری ہدایت ورہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ پیش فرمایا ہے، جو تعلیم دی ہے' جو احکام دیے ہیں' جو خبریں دی ہیں' جو اوامر و نواہی بتائے ہیں' حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں' ان میں سے کوئی بات بھی انہوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے' جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (آیات: ۳، ۴) ''اور یہ (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو صرف وحی ہے جو (ان پر) بھیجی جاتی ہے'' تو دل میں آپؐ کی توقیر و تعظیم کا جذبہ پیدا ہونا اور عمل میں اس کا اظہار منطقی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا ادب واحترام ہے۔

سورۃ الحجرات میں اس ادب و احترام اور توقیر و تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں سے مطلوب ہے اور جو انہیں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

Salman Saleem 03067163117

تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ○ (الحجرات:۲)

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو' مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں شعور تک نہ ہو''۔

شعور و احساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا، بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے نیک اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی اور حکم عدولی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کو پس پشت ڈال دینا تو بڑی دور کی بات ہے' جس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں' محض یہ سوئے ادب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر دیا جائے' تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے اور کیسی زبردست تنبیہ کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملے میں ایسی بے احتیاطی برتنے کے سبب سے اب تک کے تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا' تمہاری سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں معلوم تک نہ ہوگا کہ تم نے اس بے ادبی اور بے احتیاطی سے کیا کچھ کھو دیا اور تم کیسے عظیم نقصان اور خسارے سے دوچار ہو گئے۔ اس لیے کہ تم اس مغالطے میں رہو گے کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حکم عدولی تو نہیں کی اور ہم سے کسی معصیت صریحہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا۔ سورۃ الحجرات کی اس آیت مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان بالرسالت کا پہلا لازمی نتیجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب و احترام اور آپؐ کی توقیر و تعظیم ہے۔

اب اسی ایمان کے دو مضمرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو مشہور احادیث کے حوالے سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ہے اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرا ہے محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

اطاعت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کا پہلا لازمی نتیجہ آپ کی مکمل اطاعت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ[1]

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں''۔

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں ''شرح السنۃ'' کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک ان تمام احکامِ شریعت' حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دلی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن و سنت کے ذریعے سے پیش فرمائے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی خواہشات کو کچلتے ہوئے قرآن و سنت پر عمل کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن و سنت کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہوگا۔ مثلاً سورۂ آل عمران (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ج اسی طرح سورۃ التغابن (آیت ۱۲) میں فرمایا گیا: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج یعنی ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی''۔ جب محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ مان لیا ہے تو اب تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تمہیں ان کا ہر حکم ماننا پڑے گا اور ہر ارشاد کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔

---

(۱) رواہ فی شرح السنۃ' وقال النووی فی اربعینہ: هذا حديث حسن صحيح' رويناه فی كتاب الحجة باسناد صحيح۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ جس رسول کو بھی بھیجتا ہے اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ٦٤) میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (آیت ٨٠) ''جس شخص نے رسول کی اطاعت کی تو اُس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لیے ہمارے پاس خود نہیں آتا' اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لیے انبیاء و رسل کو واسطہ بنایا ہے، لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسولؐ کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا کہ:

مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ (١)

''جس نے میری اطاعت کی تو اُس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی تو اُس نے اللہ کی نافرمانی کی''۔

نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے لزوم کے لیے سورۃ النساء کی آیت 65 بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

''پس نہیں' آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں' پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں''۔

یہ آیت مبارکہ حضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے نص قطعی ہے۔

---

(١) صحیح البخاری' کتاب الجهاد' باب قول الله تعالیٰ: اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم... وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة امراء فی غیر معصیة... عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ

Salman Saleem 03067163117

رسول محض مان لینے کے لیے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے' اس کے تمام فیصلے تسلیم کیے جائیں' اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے۔ اس کی سنت کی پیروی کی جائے اور اس کے نقش قدم کو رہنما بنایا جائے۔ حضور ﷺ کو صرف مرکز عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں، بلکہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے لازمی عملی نتیجے کے طور پر آپؐ کو مرکز اطاعت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس اطاعت کلی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا، لیکن یہ حقیقی ایمان کے اعتبار سے خدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔

## محبت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا دوسرا لازمی نتیجہ آپؐ سے محبت ہے۔ صرف زبردستی مجبوری اور مارے باندھے کی اطاعت تو کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جا سکتی ہے، بلکہ کی جاتی ہے، لیکن جب یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ کے لیے مطلوب ہو تو پھر زبردستی کی اطاعت نہیں بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو انتہائی گہری محبت' دل کی پوری آمادگی اور پورے انبساطِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ ہو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱)

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لیے اس کے باپ' اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں"۔

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مومن نہیں۔ حدیث مبارک

(۱) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب حب الرسول من الايمان۔ و صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ اكثر من الاهل والولد والوالد والناس اجمعين... عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ۔

کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے، بلکہ بڑے واضح الفاظ میں صاف صاف اور دوٹوک انداز میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت آپ پر صحیح معنوں میں وہ ایمان ہی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اُس کی عدالت سے جزاوسزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا: ''عمرؓ! تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟'' ذرا اندازہ لگائیے کہ اس گفتگو سے کس قدر اپنائیت کا احساس ابھرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور عمر فاروقؓ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا۔ سوال کا انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اس ہستی سے کیا جا سکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلم ہو۔ حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا کہ ''حضور! آپ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔''

حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ''اور خود اپنی جان سے بھی؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: "اَلْآنَ" یعنی ہاں حضور! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کے سوال کا جواب سوچ سمجھ کر، اپنا جائزہ لے کر اور اپنے دل کے اندر جھانک کر دیا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعوائے محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں، الا ماشاء اللہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں، اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو''۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا جو اللہ کو مطلوب ہے۔

## اتباع

دل کی حقیقی محبت، طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب

Salman Saleem 03067163117

انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم ہی کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو، بلکہ وہ اُس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہے اور اس کے چشم وابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند' ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے' ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے' چلتے کس طرح ہیں' وہ لباس کون سا پہنتے ہیں' انہیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں خواہ کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو' لیکن جس کے دل میں کسی کی حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے' جو کسی کا والہ وشیفتہ ہو جائے' اس کے لیے وہ احکام جو الفاظ میں دیے گئے ہوں' زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں یا وہ کام جن کے کرنے کی ترغیب وتشویق دلائی گئی ہو ان کا تو کہنا ہی کیا' وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل' ایسے شخص کے لیے تو چشم وابرو کا اشارہ بھی حکم قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ محبوب کی ہر ہر ادا کی نقالی اور اس کے ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں!

اس طرزِ عمل کا نام ''اتباع'' ہے، جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں جن سے ان کے جذبۂ اتباع کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' اتفاق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا' لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا کہ جب کبھی ان کا اس راستے سے گزر ہوتا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا' جہاں جہاں استراحت فرمائی اور جہاں حوائج ضروریہ سے فراغت پائی' حضرت ابن عمرؓ نے سفر حج میں انہی مقامات پر پڑاؤ' استراحت اور رفع حاجت کا التزام کیا۔ حالانکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور شریعت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اعمال واجب التعمیل بھی

Salman Saleem 03067163117

نہیں تھے، بلکہ خالص عقلیت پسند (Rationalist) لوگ تو شاید اس کو جنون اور خواہ مخواہ کا Fanaticism کہیں، لیکن یہ معاملہ عشق و محبت کا معاملہ ہے جس میں محبوب کے ہر نقش قدم کی پیروی دستورِ محبت شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنافی حب الرسول ﷺ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویہ یہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح سیر صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے جو کسی دور دراز علاقے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو بس اسی ایک موقع پر دیکھا تھا اور اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ کا گریبان کھلا تھا۔ آپ ﷺ کو کھلے گریبان کے ساتھ دیکھ کر ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے، اس لیے کہ انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کی طرف سے انہیں ایسا کوئی حکم تو کجا، کسی ادنیٰ درجے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا اور شریعت کی رو سے یہ نہ فرض ہے نہ واجب، لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کے ہر نقش قدم کی پیروی اور ہر ادا کی نقالی اپنے اوپر لازم کر لی جائے۔ اسی طرزِ عمل کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں اتباع ہے۔

اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ سورۂ آل عمران کی آیت 31 کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (آل عمران: ۳۱)

"(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا (اور) بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم ﷺ کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت

Salman Saleem 03067163117

کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں ان کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اب تک کی گفتگو کے اہم نکات کا اعادہ کرلیں اور اس کے لُبِّ لباب کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اولین اور اہم ترین بنیاد آپ ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اس ایمان کا زبانی اقرار بھی ضروری ہے اور قلبی یقین بھی۔ پھر ایمان کا اولین تقاضا آنحضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا کماحقہ ادب و احترام ہے۔ آپؐ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کے دو ناگزیر لوازم ہیں۔ ایک اطاعت کلی اور دوسرے محبت قلبی جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور جب یہ دونوں جمع ہوں گی تو اس کا نام ''اتباع'' ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرلو' اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت کرے گا' تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔

## انتباہ

یہاں پر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے ان دونوں ناگزیر لوازم میں سے اگر ایک بھی غائب ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امید موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر نبی اکرم ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے، لیکن محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے، یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کی کیفیت نہیں ہے' دل میں تنگی اور اپراہٹ ہے تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دور کے منافقین بھی ایمان لانے کے مدعی تھے اور وہ آپ کی اطاعت بھی کرتے تھے، لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعت رسول ﷺ تو درکنار رسول اللہ ﷺ کے احکام کا استہزاء

Salman Saleem 03067163117

کریں، جنت دوزخ اور جزا وسزا کا مذاق اڑائیں، ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں، سنت رسول ﷺ کے التزام سے انکار کریں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو آج کے دور کے لیے ناقابل عمل قرار دیں، لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اس معاشرے کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا اور خود کو مسلمان کہلانا تھا اس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ اس پر مجبور تھا کہ نماز پڑھے، شعائر دین کا احترام کرے اور فرائض دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے جتن کرتے تھے، بلکہ قسمیں کھا کھا کر حضور ﷺ کو اپنے صادق و مخلص ہونے کا یقین دلاتے تھے، لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی، وہ تھی یقین قلبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حضور ﷺ سے حقیقی و واقعی محبت۔

چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون میں فیصلہ فرمادیا کہ:

إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝

(المنافقون:۱)

”(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشبہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں“۔

یعنی ان کی یہ بات تو اپنی جگہ سچی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن چونکہ یہ دل سے آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں، ان کے دلوں میں آپؐ کی حقیقی محبت موجود نہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں، ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور، اس لیے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قلبی یقین اور محبت کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہو تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ محبت رسول ﷺ کے محض دعوے ہیں، لیکن اطاعت نہیں، فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر ونواہی کی پرواہ نہیں، احکامِ شریعت کا

Salman Saleem 03067163117

سرے سے کوئی لحاظ نہیں، تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت اور فسق و فجور پر مبنی ہے۔ محبت کا یہ خالی خولی دعویٰ اللہ کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہو گا۔ ایسا دعویٰ تو اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہو سکتا بلکہ مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ کسی بیٹے کو والد کی محبت کا دعویٰ ہو، لیکن وہ ان کا کہنا نہ مانتا ہو، بلکہ ہر عمل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیتا ہو تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعوائے محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بلند بانگ دعاوی، بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام، بڑے جوش و خروش اور شان و شوکت سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالس سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی اور پیروئ سنت کے جذبہ سے عاری ہیں تو یہ سب کچھ سراپا ڈھونگ ہے، فریب نفس ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، بلکہ یہ سب قابل مواخذہ ہیں۔

## ③ نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

آیت زیر مطالعہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد "وَنَصَرُوْهُ" کے لفظ میں بیان ہوئی ہے یعنی "جن لوگوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدد اور حمایت کی"۔ اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بات طے کرنی چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نصرت و حمایت اور ان کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ نبوت و رسالت ایک فریضۂ منصبی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا، نیند کے ماتوں کو جگانا، انسان کو شرک کے اندھیاروں میں سے نکال کر توحید کے روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا، اسے اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کا خوگر بنانا، انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا، معاشرے میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا اور انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا

Salman Saleem 03067163117

ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک و آقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لیے کھڑا ہونا ہوگا' از روئے الفاظ قرآنی: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ (المطففین:٦) اور يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ○ (الانفطار:١٩) یعنی جس روز لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا' کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا اور جس دن تکوینی حاکمیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ تشریعی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی و جہد کا نتیجہ اس کے سامنے ہوگا۔ برے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا، اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیش نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰىۙ ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰىۙ ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاۙ ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ ﴿٤١﴾

''جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا، اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ تو جس نے سرکشی کی تھی، اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا، اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی!''

## تبلیغ کا بارِ گراں

دعوت و تبلیغ کا کٹھن کام' شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری' بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام' طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور اقامت دین کے جان جوکھوں

Salman Saleem 03067163117

کے یہ مراحل طے کرنا' یہ تھا وہ بارِ گراں جو نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا۔ اس بارِ گراں کی خبر حضور ﷺ کو نبوت کے آغاز ہی میں دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں فرما دیا گیا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ○ (المزمل: ۵) یعنی ''ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے (ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے)'' اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند ہی دنوں بعد آنحضور ﷺ کے شانوں پر رکھ دیا گیا' چنانچہ سورۃ المدثر میں حکم آ گیا: یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝۳ یعنی ''اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو' ان کو ہوشیار کرو' ان کو باطل عقائد اور غلط اعمال کے انجام بد سے ڈراؤ) اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو''۔

سورۃ المدثر کی تیسری آیت میں نبی اکرم ﷺ کو ''تکبیر رب'' کا حکم دیا گیا ہے' جس کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور اللہ کی بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں، بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم اور برپا کر دینا ہے جس میں تشریعی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاکم اعلیٰ اور مقتدرِ مطلق (Absolute Sovereign) تسلیم کیا جائے، اسی کا حکم حرفِ آخر ہو' اُسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو' اسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلند تر ہو جائے اور اُسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: وَکَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ؕ (التوبۃ: ۴۰) ''اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے''۔ کبریائی تو واقعتاً وہ کبریائی ہے جو عملاً قائم ہو' محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں اور محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی، بلکہ بڑائی اور کبریائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ ''تکبیر رب'' کا حقیقی مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اُس کے احکام' اُس کی ہدایات اور اُس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو' اُس کا عطا کردہ آئین اور اُس کے نازل کردہ قوانین عملاً نافذ ہوں' اور اس طرح اسے حقیقی طور پر مقتدر تسلیم کیا گیا ہو۔

Salman Saleem 03067163117

## دعوت وتبلیغ کی غایت اُولیٰ

مدنی دور میں اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں' لٰہذا دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہار دین حق اور غلبۂ دین متین بھی نہ صرف آپؐ کے فرائض رسالت میں شامل ہے بلکہ آپ ﷺ کی بعثت کی غایت اولیٰ ہے۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول یا نبی آنے والا نہیں' لٰہذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری کتاب اور مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا وہاں یہ بھی ضروری قرار دیا کہ دین حق بتمام وکمال قائم بھی ہو، تا کہ انسان کے لیے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ یہ مضمون مدنی دور کی تین سورتوں، سورۃ التوبہ (آیت ۳۳) سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصف (آیت ۹) میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا:

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تا کہ وہ اس (ہدایت اور دین حق) کو پورے کے پورے دین (نظام حیات) پر غالب کر دے''۔

تو یہ تھا وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم ﷺ کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور ظہورِ نبوت کے وقت صورتِ حال یہ تھی کہ آپ اس وقت پورے عالم انسانی میں اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل یکہ وتنہا تھے۔ دنیا کے بت کدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا' تکبیر رب کا نعرہ لگانا' خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا' اظہار وغلبۂ دین کے لیے کشمکش کرنا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا' اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا علم بلند کرنا اور ظلم وتعدی' جور وستم اور استبداد واستحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا' اسی لیے اسے ''قولِ ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا۔

Salman Saleem 03067163117

تکبیر رب کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرے سے اعلانِ جنگ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تھا کہ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۝۳ (المدثر) یعنی کھڑے ہو جاؤ' پس (بنی نوع انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو! آپؐ سے فرمایا گیا کہ آپ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی فرماتے رہیں اور وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝ اور وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ۝ کے مصداق چاہے مشرکوں اور کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہو وہ کتنا ہی راستہ روکیں اور مزاحمت کریں' وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرے میں پڑ گئی ہوں' وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں' کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں' ظلم و تشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں اور جور و تعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں' ان تمام مخالفتوں' مظالم اور استبداد کے علی الرغم' ان تمام موانع کے باوجود اور ان تمام شدائد و مصائب کے باوصف نبی اکرم' سرور عالم' محبوب خدا' رحمت للعالمین' خاتم الانبیاء والمرسلین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض منصبی میں شامل تھا کہ تکبیر رب کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں' باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوں اور اس راستے میں ہر نوع کے شدائد و مصائب اور ہر طرح کے طنز و استہزاء اور طعن و تشنیع کے وار برداشت کریں۔ یہ وہ بھاری بوجھ اور بھاری ذمہ داری تھی جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔

## آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی کی اہم ترین ذمہ داری

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرضِ منصبی کے ادراک سے نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اور اس کا دل اس بات کی تصدیق کرے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' اس کے لیے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رفیق و ناصر بنے۔ اب اسے تکبیر رب کی کٹھن مہم میں' اقامت دین اور غلبۂ دین کی جاں گسل جدوجہد میں' دعوت و تبلیغ کے راہِ خارزار میں' حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ

جنگ وجدال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دست و بازو اور آپ کا حامی و مددگار بننا ہوگا۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت سمجھے اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقد جان کی نذر گزارنے میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کا یقین ہو، اس کا جینا اور مرنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہو، اس کا مال و منال اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دین حق کے غلبے کے لیے وقف ہوں جو خالق کائنات اور رب العالمین کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے کر مبعوث فرمایا گیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصد حیات اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ (الانعام: ۱۶۲) نہ ہو تو ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا دعویٰ غیر معتبر ہے، اور مغالطے اور فریب نفس پر مبنی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

لفظ نصرت سے کسی کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ اللہ کے نبی اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت؟ نبی کا مقام و مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود ان کا مولا اور ناصر ہوتا ہے، پھر اللہ کے فرشتے نبیؑ کے پشت پناہ ہوتے ہیں اور نبی کو تو روح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے، لہٰذا نبی کو اہل ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت؟ پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس عالم اسباب میں دین حق کے غلبے کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو زمین میں اللہ کے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیاء و رسل کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق و انفس میں اللہ کی آیات انبیاء و رسل کی دعوت کے قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان کی صداقت کے ثبوت کے لیے ان پر آسمانی کتابوں کا نزول بھی ہوتا ہے جو واضح اور روشن آیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حسی معجزات سے بھی سرفراز فرماتا ہے، لیکن حق کو قبول یا رد کرنے کے فیصلہ کے لیے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا

شَا كِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○ (الدھر) یعنی ''ہم نے تو انسان کو سیدھی راہ سجھادی ہے اب وہ حق کو تسلیم کرے یا ناشکری کرے!'' بہر حال اقامت دین' شہادت حق اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعیٔ اول ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ○ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ○ (سورۃ الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم!) ہم نے آپ کو گواہی دینے والا' بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا' اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے ولاا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے''۔

## امتحان اور آزمائش

پھر جو لوگ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت قبول کریں اور اس پر ایمان لائیں' اللہ تعالیٰ عزوجل اس عالم اسباب میں ان کو جانچتا ہے' ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ اس عالمِ علت و معلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر، رسولؐ پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مومنین صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں' ان کے ایثار و قربانی اور ان کی جدوجہد سے پھیلے گا۔ دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہوگی تو ان ہی کی کشاکش، محنت اور جہاد و قتال سے قائم ہوگی۔ وہ خاک و خون میں لوٹیں گے اور راہِ حق میں نقد جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائیدؔ و نصرتؔ سے اللہ کا دین غالب ہوگا۔ یہی سنت اللہ ہے' اور اللہ کو ایسے ہی جوانمردوں سے محبت ہے۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ (الصف: ۴)

''یقیناً اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں''۔

Salman Saleem 03067163117

اور انہی سرفروشوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی جدوجہد اور کشمکش میں مومنین صادقین کی آزمائش ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان کا جھوٹا دعویدار ہے۔ اس جہاد و قتال کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی تکمیل میں سردھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عالم رنگ و بو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں، جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں فرمایا: وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○ (العنکبوت:١١) ''اور اللہ تعالیٰ لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو منافق ہیں''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مومن بنے پھرتے ہیں، جو حقیقت واقعی کے لحاظ سے منافق ہیں۔ اس دنیا میں ایمان و نفاق کا فیصلہ انہی آزمائشوں، انہی سرفروشیوں اور انہی جانفشانیوں سے ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا؟ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب رسالت کی تکمیل میں اپنا جان و مال کھپایا یا نہیں کھپایا؟ دعوت الی اللہ کے مراحل میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی؟ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں، پھر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ ناقابل قبول ٹھہرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد کر دیا جائے گا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا اور دکھاوا قرار پائے گا۔

## دَروں بینی کی ضرورت

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ذرا چشم تصور میں غزوۂ احد کا نقشہ لائیے کہ محبوبِ خدا، سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثار صحابہؓ کی معیت میں مشرکین کے سامنے سینہ

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

سپر ہیں' آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ اس معرکۂ کارزار میں جان کی بازی لگا رہے ہیں' اس کشمکش میں رحمۃ للعالمین ﷺ زخمی ہو گئے ہیں' خود کی کڑیاں سر مبارک میں گھس گئی ہیں' رخسارِ مبارک بھی مجروح ہو گیا ہے' دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں' آپ ﷺ کا مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے...... اور فرض کیجئے کہ عین اُس وقت کوئی مدعیٔ عشق رسول ﷺ کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو، آنحضور ﷺ پر سلام پڑھ رہا ہو یا آپ ﷺ کی شان میں نعتیں پڑھے جا رہا ہو' تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہو گی! اس طرزِ عمل کا ایمان بالرسولؐ اور محبت رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت و تعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کہ محمد رسول اللہ ﷺ تو کارزارِ اُحد میں' جہاں پر ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو' اپنے جاں نثاروں کے ساتھ اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم فرما رہے ہوں اور اللہ کے جھنڈے کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشق رسولؐ کہیں کسی گوشے میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو' جس قدر مضحکہ خیز اُس وقت ہوتا اُسی قدر مضحکہ خیز آج بھی ہے۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ کا مشن مردہ نہیں ہوا' زندہ و تابندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے اور آپ ﷺ کے بعد یہ فریضۂ رسالت امت مسلمہ کو بحیثیت امت ادا کرنا ہے۔ بنی نوع انسان آج بھی ہدایت ربانی کی محتاج ہے۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے۔ آج بھی ہر اُس شخص پر جو خود کو مسلمان سمجھتا ہے' یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوعِ انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ آنحضور ﷺ کی بعثت صرف اہل عرب کے لیے نہ تھی بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے تھی۔ آنحضور ﷺ کی بعثت ایک مخصوص زمانے اور وقت کے لیے نہ تھی، بلکہ قیامِ قیامت تک کے لیے تھی۔ توحید کی دعوت دینا' شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا۔ از روئے الفاظ قرآنی:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (التوبہ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصف: ۹) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے قول کے مطابق

اس آیت کی کامل شان کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اس کا ظہور اُس وقت تک نہ ہوگا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اسی طرح اللہ کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطلہ کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال کی محنت شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور وہاں پہلے سے قائم طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پس اب اس مدعیٔ ایمان، اس عاشق رسولؐ اور اس محب رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہئے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت اور آپ کے مشن سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسے خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورتِ حال رونما ہو چکی ہے کہ بقول حالی: ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

## نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔ صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ [1]

''اسلام کی ابتدا غربت (اجنبیت) کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ جائے گا۔ تو بشارت ہے ''غرباء کے لیے''۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا و سیعود غریبا......

Salman Saleem 03067163117

اردو میں غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہوتے ہیں، لیکن عربی میں یہ لفظ ''اجنبی'' کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ جیسے ایک اجنبی مسافر اپنے اہل وعیال اور اپنے وطن سے دور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے' اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں اجنبی اور تنہا تھا' یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ پھر غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔ کفار' ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی۔ اگرچہ نام کے مسلمان کثیر التعداد ہوں گے، لیکن سچے' موحد' دین دار اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان قلیل ''غرباء'' کے لیے (بہشت کی) بشارت اور مبارکباد ہے۔ مسند احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے ''غرباء'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

أُنَاسٌ صَالِحُوْنَ فِيْ أُنَاسِ سُوْءٍ كَثِيْرٍ مَنْ يَعْصِيْهِمْ أَكْثَرُ مِمَّنْ يُطِيْعُهُمْ

''برے لوگوں کی کثیر تعداد میں وہ نیک لوگ (غرباء) ہیں کہ جن کی بات ماننے والے کم ہوں اور نافرمانی کرنے والے زیادہ ہوں''۔

ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے خبر دی کہ:

لَا يَبْقٰى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ إِلَّا رَسْمُهٗ (۱)

''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ نہ بچے گا''۔

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر اسلام کہیں فی الواقع قائم نظر نہیں آئے گا۔ انسانوں کے کردار اور ان کی شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما دیکھنے کے لیے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ اس کی تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے باقی رہ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا و سیعود غریبا...

Salman Saleem 03067163117

جائے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیث مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورتِ حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے' اگر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے، تو کیا اس کا مقصودِ حیات اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت تھا؟ یعنی اعلاء کلمۃ اللہ، اظہار دین الحق علی الدین کلہ اور تکبیر رب! اگر ہم میں سے کسی کے مقاصد زندگی میں اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم شامل نہیں اور اگر وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست و بازو اور آپ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق درست نہیں' جس کی اسے فکر کرنی چاہئے۔ تو یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو ''وَنَصَرُوْهُ'' کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

## اتباع کا تقاضا

''نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کی مزید وضاحت ''اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کے حوالے سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' اتباع کے معنی ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے' پیہم و مسلسل ہوا ہے' جو پورے تیئس برس تک شب و روز ہوا ہے' جس میں ایک لمحے اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں' وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں' کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا؟

Salman Saleem 03067163117

ان سب کے لیے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے، جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں، اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اول یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم، مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے، وہ عمل دعوت و تبلیغ کا عمل ہے، وہ تکبیر رب کی سعی و جہد ہے، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہے، وہ دین حق کے سربلند کرنے کی تگ و دو ہے، وہ غلبہ و اقامت دین کے لیے مجاہدہ اور تصادم ہے۔ اس سعی و جہد اور مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دور میں یہ جدوجہد دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجے میں تھی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر و اُحد اور اَحزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی، کہیں قبائل عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعے دعوت دینے کے مراحل میں تھی اور کہیں صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی، لیکن آپؐ کا جو عمل تئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے، وہ ہے عمل دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا التزام ضروری ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر، متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت و تبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

## رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت اللہ کی نصرت ہے

نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قرآن مجید کا ایک اہم مقام سورۃ الصف کی آخری آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے اپنے

Salman Saleem 03067163117

حواریوں سے دریافت فرمایا: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ یعنی ''اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟'' تکبیرِ رب، دعوتِ توحید، تبلیغِ دین اور نورِ ہدایت سے دنیا کو منور کرنے کا جو کام میرے سپرد ہوا ہے اس کی جدوجہد میں اب کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو اس راہ میں میرا دست و بازو بنے؟ آپؑ کے حواریوں کے جواب کو قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے:

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ یعنی ''حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار''۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے سوال اور حواریوں کے جواب کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے دریافت کیا تھا: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ جواب دیا گیا: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ رسول کی نصرت اللہ ہی کی نصرت ہے اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسول کا حامی، مددگار اور دست و بازو بنتا ہے، اس راہ میں جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا جان و مال کھپاتا ہے، وہ اللہ کے رسول کی نصرت بھی کر رہا ہے اور اللہ کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ چنانچہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسولؐ دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔

## ④ اتباعِ قرآن مجید

اب اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد کا ذکر ہے اور وہ ہے نورِ قرآنِ مجید کو حرزِ جان بنانا، اسے اپنا رہنما قرار دینا اور اس کا اتباع کرنا۔ فرمایا: وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ ''اور اتباع کیا اُس نور کا جو اُن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ (یا ان پر) نازل کیا گیا''۔ یہاں نور سے مراد قرآن ہے، یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس کا اتباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں یعنی اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس چوتھی بات کا اضافہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال اس دنیا سے

Salman Saleem 03067163117

تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک معین مدت تک کے لیے ہی صحابہ کرامؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابدالآباد تک کے لیے جس چیز کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے جو فرقانِ حمید بھی ہے اور کتاب مبین بھی۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اترا۔ اور یہ وہ نور ہے جو دائم و قائم ہے۔ بقول اقبال:

مثلِ حق پنہاں وہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے بارے میں تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابُ اللهِ(۱)

"اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے، وہ چیز ہے کتاب اللہ"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں گفتگو سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم اس ارشادِ گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آپ کشمکش حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پورے خطبے میں موجود ہے، بلکہ خطبے کے آغاز ہی میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ وَاللهِ لَا اَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا اَلْقَاكُمْ بَعْدَ يَوْمِيْ هٰذَا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

Salman Saleem 03067163117

بِمَکَانِیْ ھٰذَا، فَرَحِمَ اللّٰہُ مَنْ سَمِعَ مَقَالَتِیَ الْیَوْمَ فَوَعَاھَا[1]

''لوگو! اللہ کی قسم' میں نہیں جانتا' شاید آج کے بعد میں تم سے اس مقام پر دوبارہ نہ مل سکوں۔ پس اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے آج میری باتوں کو سنا اور ان کو یاد رکھا......''

چنانچہ اس خطبہ میں آنحضور ﷺ کے ارشادات کا انداز وصیت کا سا ہے، یعنی امت کو ان امور کی تاکید و تلقین جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے یہ بات تاکیداً ارشاد فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا' اسے حرزِ جاں بنانا' اس کے دامن سے وابستہ رہنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جا رہا ہوں جو تمہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

## حبلُ اللہ

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمودات کی رو سے قرآن مجید ہی وہ ''حبل اللہ'' ہے جس کے ساتھ چمٹ جانے اور وابستہ ہو جانے کا سورۂ آل عمران میں حکم آیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حکم سورۃ الحج میں وارد ہوا ہے جس کی آخری آیت میں فرمایا گیا: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ'' اُس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ سے کیسے چمٹیں' اُس کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو''۔ اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس وضاحت کے باوجود یہ سوال باقی رہا کہ پھر حبل اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیسے تھامیں؟ کس سے جڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبی اکرم ﷺ نے فرما

(۱) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب الاقتداء بالعلماء

Salman Saleem 03067163117

دی اور وحی غیر متلو کے ذریعے امت کو مطلع فرما دیا کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جس سے اعتصام کا' جس کے ساتھ چمٹ جانے اور جڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم سورۂ آل عمران میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نہایت جامع حدیث میں جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت' اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی اہمیت کا بیان مفصل انداز میں ہوا ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ یعنی "یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے"۔ اسی طویل حدیث میں قرآن حکیم کی شان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی لائق توجہ ہیں کہ "قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے' نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔" یعنی اس کے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا اور اس کان سے حکمت و معارف کے نئے نئے موتی اور جواہرات برآمد ہوتے رہیں گے۔

(یہ حدیث سنن ترمذی اور سنن دارمی میں روایت ہوئی ہے۔)

## ہماری حالت زار

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تاابد گمراہ نہیں ہو گے' لیکن بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہو جانے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت قرار پایا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی کی صورت ہی میں ظاہر ہونا چاہئے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں' آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا' اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی و رہنما سمجھا' اپنے عمل' اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی' ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا' دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگ عالم میں لہراتا رہا' لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا اور نورِ

Salman Saleem 03067163117

حکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے، ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور نتیجتاً مغلوب و مقہور ہو گئے۔ ان کے عقائد خراب ہوئے‘ اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو دراندازی کا موقع ملا۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ بنیانِ مرصوص بنتے‘ بے شمار فرقوں اور قومی و نسلی اور لسانی وجغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہئے آج اسے ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں رہا کہ ہم اسے محض حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اگر اس کی تلاوت کرتے بھی ہیں تو اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض حصولِ ثواب کے لیے! بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا‘ اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لیے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ گویا اپنے لیے بھی اب ہم تلاوتِ قرآن کے ذریعے حصولِ ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے، بلکہ اب تو قرآن مجید ہمارے نزدیک صرف مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے!! بقول اقبال:

با آیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا○

(الفرقان: ۳۰) ”اور کہا رسولؐ نے کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا (نظر انداز کر دیا تھا)“۔ اگرچہ سیاق وسباق کے لحاظ سے اس آیت میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابل التفات چیز تھی ہی نہیں اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحی ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے‘ تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدم توجہ والتفات کی روش اختیار کریں‘ یعنی جو نہ اس کی تلاوت کو اپنے معمولات میں شامل کرتے

Salman Saleem 03067163117

ہوں' نہ اسے اپنے غور و فکر کا موضوع بناتے ہوں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے پر آمادہ ہوں۔ یہاں آیت زیر نظر وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ میں ''اتباع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ ہر حکم' ہر ہدایت' ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن حکیم کے ساتھ اگر اس نوع کا تعلق ہو گا تو ہم نہ صرف یہ کہ گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری نسبت بھی صحیح بنیادوں پر استوار رہ سکے گی!...... یہاں یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا' اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی' حکم اور رہنما قرار دینا' اس کی تعلیمات پر عمل کرنا' اس کی صبح و شام تلاوت کرنا' اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا' اس کو حرزِ جان بنانا' اس کا اتباع کرنا' یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ گویا اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑ گئے اور اس سے کٹے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹ گئے۔

## اصلاحِ حال کا واحد طریق

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے' اس ضمن میں یہ حدیث شریف نہایت جامع ہے' جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَآ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَآءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱)

''اے قرآن والو! قرآن کو اپنا تکیہ ہی نہ بنالو، بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، اور اس کو (چہار دانگ عالم میں) پھیلاؤ، اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو، اور اس میں تدبر اور غور و فکر کیا کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان

Salman Saleem 03067163117

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل قرآن کا خطاب دیا ہے:
یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے
یَا اَھْلَ الْکِتَابِ۔ الکتاب کا آخری، مکمل اور جامع ایڈیشن ''القرآن'' ہے جس کی حامل
امت مسلمہ ہے۔ اسی مناسبت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ کے
الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ سبحان اللہ! کتنا پیارا خطاب ہے جو اس امت کو ملا۔ میں اس سے
قبل بھی کسی موقع پر یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ
جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے ''اہل قرآن'' کا عنوان اختیار کیا، ہم نے بھی ان کو
اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا، حالانکہ یہ نام انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے گمراہ
کن نظریات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا اصل نام ہونا چاہیے تھا ''منکرین
سنت'' یا ''منکرین حدیث''۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ
کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جس کے وہ ہرگز اہل نہیں ہیں! یہ خطاب تو
آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو دیا تھا، منکرین حدیث کو نہیں!

اس حدیث کا ایک ایک لفظ لائق توجہ ہے۔ کس قدر جامع ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا
ہے۔ یہاں اس حدیث کی تشریح تو پیش نظر نہیں ہے، محض ایک نکتے کی جانب اشارہ کر کے
ہم آگے بڑھیں گے۔ یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ کا سادہ سا ترجمہ تو یہ ہوگا
کہ اے اہل قرآن! اس قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا۔ لیکن یہاں تکیہ کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔
تکیہ چونکہ کمر کے پیچھے لگایا جاتا ہے لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اس قرآن کو پس پشت نہ
ڈال دینا، اسے نظر انداز نہ کر دینا۔ پھر یہ کہ تکیہ چونکہ سہارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو
اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں
اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول کر اور اسے نہایت قیمتی جزدان میں اونچے طاق پر
رکھ کر مطمئن ہو جاؤ کہ اس کی موجودگی باعث برکت ہے۔ اس کتابِ مبین سے ہمارا عملی
تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے وہ جھوٹی قسم ہی

Salman Saleem 03067163117

کیوں نہ ہو، تو اس کے لیے اس کتاب کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ دم توڑتے شخص کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنادی جاتی ہے یا بیٹی کو قرآن کا ایک نسخہ جہیز میں دے کر ایک رسم پوری کر دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ اور خیر سلا! قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا عملی رویہ تو وہ ہونا چاہیے جو اس حدیث کی رو سے سامنے آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ میں ہمارے لیے فکری و عملی رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

اللہ کے اس نور کا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم کو ملا' جب ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس دنیا میں اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم یہاں ذلت و رسوائی کا ایک عبرت ناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذاب اخروی تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے اور وہ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے تو دوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسا صادق آتا ہے ہمارے حال پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان جسے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ [1] یعنی ''اللہ تعالیٰ یقیناً اس کتاب عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار کرے گا''۔ گویا دنیا میں بحیثیت قوم ہماری تقدیر اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حدیث کی بہت عمدہ تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آیت زیر نظر کے اس ٹکڑے وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ پر غور کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں ایمان بالرسالت' توقیر و تعظیم رسولؐ اور نصرت رسولؐ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پوری طرح احاطہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب فضل من یقوم بالقران ویعلمه...

Salman Saleem 03067163117

کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح و صلاح اور نجات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستگی پر موقوف ہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل ایک بات مزید عرض کرنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کا زوال و انحطاط دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام اپنی تقریروں اور تحریروں میں کہتے چلے آئے ہیں' جن میں سے ایک ایسی بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں۔ وہ ماضی بعید کی نہیں' ماضی قریب کی ایک مسلمہ محترم شخصیت ہیں اور وہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) کے دوران حکومت برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تالیف ''وحدتِ امت'' میں لکھا ہے کہ 1920ء میں شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دار العلوم دیوبند کے اکابر اور علماء کو جمع کیا اور فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے انہیں آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے

Salman Saleem 03067163117

کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزو مند ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرکوز ہو جانی چاہیے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے' سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی بہترین عملی جدوجہد اور قوتوں کو صرف کرنا اگر ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرے میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہوگا' عقائد اسی سے درست ہوں گے' جاہلیت قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہوگا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دور ہوں گے' عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہوگی۔ معاملات اگر سنوریں گے تو اسی کتابِ مبین کی رشد و ہدایت سے سنوریں گے۔ اور اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبل اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم ہوگا۔ اس کی بنیاد پر جو دعوت اٹھے گی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق پر جو انقلابی کام ہوگا اسی کے نتیجے میں یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے!

تعلم و تعلیم قرآن کی عظمت و اہمیت اور قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کے بارے میں درج ذیل تین احادیث نہایت اہم اور جامع ہیں۔ انہیں اپنے ذہن نشین کر لیجیے۔ پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ (۱) یعنی ''تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں''۔

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن و علمه' وسنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ماجاء فی تعلیم القرآن۔

Salman Saleem 03067163117

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلَیْسَ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَآءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟ قُلْنَا: بَلٰی، قَالَ: فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ، فَتَمَسَّکُوْا بِہٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے'' ہم نے عرض کیا: یقیناً! تب آپ نے فرمایا: ''پس تم خوشیاں مناؤ، اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ''۔

تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔''

## حرفِ آخر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادوں میں سے اولین بنیاد ''ایمان'' ہے اور دوسری توقیر و تعظیم جو دراصل ایمان ہی کا فوری لازمی تقاضا ہے۔ ایمان و تعظیم ہی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پورے طور پر اطاعت کی جائے اور یہ کہ ہمارے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت خود سے اور دوسرے تمام

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ و ابن جریر بحوالہ صحیح الجامع الصغیر للالبانی: ۴۴۷۳

Salman Saleem 03067163117

انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ ان دونوں چیزوں کے اجتماع کا نام ''اتباعِ رسولؐ'' ہے جو فی الاصل مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد ''نصرت'' ہے۔ اس نصرت کی ضرورت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کسی ذاتی کام کے لیے نہیں، بلکہ اپنے مشن کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد میں انہیں معاون اور دست و بازو درکار ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل ایک درجے میں ہوئی یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کل روئے ارضی کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ وسیع تر سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام اور پورے کرۂ ارضی پر غلبۂ دین کا مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض امت کے ذمہ ہے۔ اس مشن کی تکمیل کا بوجھ امت کے کندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہر اس شخص کی طرف منتقل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیوا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد ''اتباعِ قرآن مجید'' ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لیے اس طریق کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے جس پر کاربند ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر، اس کے داعی، علمبردار اور پیغامبر بن کر ہمیں دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دنیوی و اُخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

(بحوالہ ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہم'')

Salman Saleem 03067163117

# اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

## سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں (۱)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

حضرات! ان آیات پر ہماری گفتگو دو حصوں میں ہوگی۔ ایک تو ان شاء اللہ ہم درس

---

(۱) سورۃ الاحزاب کی آیات 21 تا 27 پر مشتمل یہ درس محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے مسلسل درسِ قرآن کریم کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں مئی 1979ء میں دیا۔

Salman Saleem 03067163117

کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے۔ پھر اس رکوع میں اسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئیں گے' ان کو ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی انطباق (Practicable Application) سے متعلق ہے اور ہمارے لیے اس میں جو عملی سبق ہے اس کو میں بعدازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ارشاد ہوا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے''۔

اسوہ کے لفظ کا مادہ ''ا س و'' ہے۔ اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں۔ جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں' اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں' اور اس کا معنی و مفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا' اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا' خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت۔ چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت و راحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہوگا۔ اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ''نمونہ'' اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے، لیکن اس ترجمے سے ''اسوہ'' کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اصل میں ''اتباعِ سنت'' کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے۔

یہاں لَكُمْ (تمہارے لیے) عام ہے۔ گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں، بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ اور حیات طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔

## قرآن مجید اور اسوۂ رسول ﷺ میں ایک قدر مشترک

آگے فرمایا: لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ یہ درحقیقت لَكُمْ کا بدل آ رہا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم جمع کر دیے گئے ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں سورۃ البقرہ میں دو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوعِ بشر کے لیے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ اس میں تا قیامِ قیامت ہر دور میں تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور یہ ہر اعتبار سے

Salman Saleem 03067163117

اکمل واتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو هُدًى لِّلنَّاسِ کہا گیا ہے۔ (البقرہ: ۱۸۵) یہ علی الاطلاق ہے، یعنی یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے، لیکن سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے، اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو، کچھ اللہ کی طرف انابت ہو، نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو، انسان خیر و شر میں امتیاز کرتا ہو۔ چنانچہ تقویٰ کا اساسی سرمایہ اور بنیادی اثاثہ اگر موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایت کاملہ و تامہ ہے، لیکن اس سے استفادے کے لیے جو شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہیے وہ شرط تقویٰ ہے، لہٰذا سورۃ البقرۃ کے آغاز میں ارشاد ہوا:

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اور آیت ۱۸۵ میں فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ

آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنام زمانہ کتاب "ستیارتھ پرکاش" کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کیے تھے ان میں پہلا اعتراض یہی تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں، فاسقوں اور فاجروں کو ہے۔ قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو، بہت خدا ترس ہو اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو، یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو۔ ایسے شخص کو ہم متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا ان معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اس شخص نے پیش کیا۔ تو اس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید درحقیقت هُدًى لِّلنَّاسِ ہی ہے، لیکن اس سے استفادے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ بنیادی اثاثہ موجود ہو۔ ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

اور خیر و شر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دار و مدار ہے۔ آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں اسے Starter کہتے ہیں...... یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریے باہر نکلتے چھوڑ دیے جاتے ہیں تا کہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اس کے ساتھ لگ جائے۔ پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اوپر لے جانے کے لیے Starter کا ہونا ضروری ہے' اسی طرح قرآن مجید سے استفادے کے لیے تقویٰ یعنی خیر و شر اور نیکی و بدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے۔

بعینہ یہی بات اسوۂ رسول ﷺ کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے بھی مجسم ہدایت ہیں۔ آپؐ کے لیے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپ نورِ ہدایت' شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسم ہیں...... جیسا کہ آپ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ (1)۔ لیکن آپؐ کے اس اسوہ' نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کر لے، لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں۔ ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

"ہر اُس شخص کے لیے (نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ ہے)
جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرۃ۔ ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں' جو گویا تین Pillars of Faith ہیں: (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرہ یا معاد اور (۳) ایمان بالرسالت۔ ایمان

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی: ۱/ ۳۰

بالرسالت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ یہ ایمانیاتِ ثلاثہ باہم گتھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لیے نمونہ کیسے بنا لے گا! اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرت ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کرے گا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہوگا۔ یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو اور جو اللہ سے ملاقات کی امید دل میں نہ رکھتا ہو' اسی طرح جس شخص کو یومِ آخرت اور محاسبہ اخروی کی کوئی توقع نہ ہو' گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو' اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ آنحضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے' جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسول ﷺ کے کس درجے قریب تر رہا ہے۔ لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپؐ کے نقشِ قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے' جس کی وضاحت والیوم الاخر سے مزید ہو گئی۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت' اللہ کی شفقت' اللہ کی نظرِ عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کی آیت 28 میں فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ''وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام' اپنے رب کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر''۔ وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں۔

Salman Saleem 03067163117

یہاں فرمایا: لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ''جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یوم آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے''۔ گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے۔ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ''اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ''۔ یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یوم آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دنیوی زندگی کا حساب دینا ہے۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہوگا۔

## اسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ

اب چونکہ یہاں نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کر کے بتایا جائے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہئے۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات کہے بغیر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرما دیا گیا:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾

''اور حقیقی مومنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس صورتِ حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھا دیا''۔

یہ بات گویا اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے۔

Salman Saleem 03067163117

## غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اسوۂ رسول ﷺ

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے؟ اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لیے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے۔ ایک باپ کے لیے آپ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ایک شوہر کے لیے آپ کامل نمونہ ہیں کہ اُسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایک پڑوسی کے لیے آپ اسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکی، ہادی و داعی اور مبلغ کے لیے آپ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک حکمران اور سربراہِ ریاست کے لیے آپ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک منصف اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے لیے آپ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اکمل واتم نہ ہو۔

میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مطہرہ کا یہ گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے نامکمل و ناتمام اور خالی نظر آتا ہو!...... آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہر پہلو سے مصروف ترین اور گھمبیر ترین تھی۔ ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو وہ عموماً خطابت نہیں کرتا' خطیب علیحدہ ہونا چاہئے۔ جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کر لیں گے! گویا کہ امامت علیحدہ' خطابت علیحدہ۔ پھر مدرس علیحدہ۔ مزید برآں جو صاحب درس کے فرائض انجام دے رہے ہوں' عام طور پر ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ و تربیت بھی کریں گے۔ اس کے لیے کہیں اور جائیے۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجئے' مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ ﷺ پڑھا دیں گے' تزکیۂ نفس کے لیے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہوگی' جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہوگا...... پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں ممکن نہیں کہ وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آئیں! یا کم از کم کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں ہی مصروف ملیں! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور تدریس و

Salman Saleem 03067163117

تعلیم میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت وتبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اوران میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کا گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جا کر یہ کام انجام دیئے ہیں۔

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جو جامعیت ہے وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء ورسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ آپ مسجد نبوی کے پنج وقتہ امام بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں' اصحابِ صُفّہ کے لیے مدرس ومعلم بھی ہیں' تمام صحابہ کرامؓ کے لیے آپؐ مزکی ومربی بھی ہیں۔ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں۔ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں۔ مقدمات وتنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔ تصور تو کیجئے کہ کون سا میدان اور کون سا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نمونہ نہیں مل سکتا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک باپ کے لیے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں' ایک شوہر کے لیے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ کسی قاضی' کسی سپہ سالار' کسی فاتح اور کسی صدرِ ریاست کے لیے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ آنجنابؑ ایک درویش' ایک مبلغ اور ایک مربی ومزکی کی حیثیت سے تو ایک مکمل نمونہ ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آ رہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب وذہن اور شعور وادراک پر جس چیز کا گہرا تاثر ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے۔ میں جب گرد وپیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے، جبکہ وہاں کیا عالم ہے! کون سی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی ہوئی ہے اور اس کو کما حقہٗ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو! الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار' ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل واتم ہے...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات اور شخصیت ہے، اور اس کا

Salman Saleem 03067163117

سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی۔ یہ بھی خاصۂ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب لفظ "اسوۃ حسنۃ" آیا ہے تو کس سیاق و سباق اور سلسلۂ عبارت (Context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپؐ کا اصل اور خصوصی اسوہ کون سا ہے!...... یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے۔ وہ صبر و ثبات' اللہ کے دین کے لیے سرفروشی و جان فشانی کہ جان نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو، جہاں قالین بچھا دیے گئے ہوں اور وہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں، جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خندق کھودنے کے لیے کدالیں چلا رہے ہوں، بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپ ﷺ بھی شامل ہیں۔ کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرامؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں: اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں: فَاغْفِرِ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَۃِ [1] یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپ برابر کے شریک ہیں۔ اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے' صحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں۔ اس پر سرور عالم' محبوبِ ربّ العالمین' خاتم النبیین والمرسلین ﷺ اپنا کرتا اٹھاتے ہیں تو ان صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپ ﷺ ہر وقت وہاں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرامؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لیے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے' اسی طرح حضور ﷺ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب لا عیش الا عیش الآخرۃ ح: ۶۴۱۳

Salman Saleem 03067163117

کے لیے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے استراحت کے لیے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو...... بنی قریظہ کی غداری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل و عیال مبتلا تھے' اسی سے آپ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لیے یا اپنے اہل و عیال کے لیے آپ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورتِ واقعہ اور صورتِ حال' جس میں فرمایا گیا کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اور ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل پیرا ہیں! ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے' لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اس اصل اور بڑے اسوہ کے لیے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہو سکتا ہے کہ "میں بڑا متبع سنت ہوں۔ میں نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے' لباس میں بھی میں سنت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے"۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسوہ بھی زندگی میں ہے یا نہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے! دعوت و تبلیغ اور اقامت و اظہارِ دین الحق کے لیے سرفروشی' جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات' تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا۔ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تو درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آ چکا ہے اور ہمارا اس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل "اسوہ" ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے (الا ماشاء اللہ!) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصی طور پر مرتکز (Focus) کرتا ہے۔

## امتحان و آزمائش میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے: وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ "جیسے

Salman Saleem 03067163117

کوئی مشین یا پریس ہو' اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک اس میں فٹ ہے' اسی کا نقش (Impression) ان پر آتا چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ اس ''اسوۂ حسنہ'' کا نقش ہے جو صحابہ کرامؓ نے قبول کیا۔ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کل ''اسوہ'' سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الا ماشاء اللہ) یہ ہو گیا ہے کہ مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تمثیل ہے جو علمائے یہود کے اس طرزِ عمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی تھیں یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات و فروعات کو وہ کل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسی کی تدریس و تعلیم میں مصروف رہتے تھے اور اس ضمن میں ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بیان کردہ یہ تمثیل دنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ضرب المثل بن گئی ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں' معاذ اللہ! نبی اکرم ﷺ کی ہر سنت' چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو' واجب الاتباع ہے۔ ان سنتوں کا اہتمام و التزام اگر اس ''اسوہ'' کے ساتھ ہو جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو سونا ہے' اس کے بغیر ہو تو تانبا ہے' جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لیے کہ اگر نسبت و تناسب درست نہیں ہو گا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہو گا! پھر تو وہی طرزِ عمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں۔

اس ''اسوہ'' کی چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہو گئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو امڈ امڈ کر ادھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے، بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے' جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے۔ مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے۔ آیت 10 میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت 11 میں فرمایا گیا: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (الاحزاب:11) ''یہ وہ

Salman Saleem 03067163117

وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے"۔ یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرامؓ کے صبر وثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق کے اس پار محصور تھے۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنو قریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے' وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تُلے بیٹھے ہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں' جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے۔ ان حالات میں اہل ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ:

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز

"انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا"۔

### امتحان و آزمائش...... اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مومنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہو گی...... ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں' ہم انہیں آزماتے ہیں' ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے۔ سورۃ العنکبوت' جو مکی سورت ہے' اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ فرمایا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ

Salman Saleem 03067163117

ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!''

پھر سورۃ البقرہ جو مدنی سورت ہے' کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ‌ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ‌ؕ

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے...... البتہ میرے خیال میں هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ کے پس منظر میں سورۃ البقرہ کی یہ آیات آتی ہیں:

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَؕ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓـئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ‌ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف و خطر' تنگی' فاقہ کشی اور جان و مال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی

Salman Saleem 03067163117

طرف سے بڑی عنایات ہوں گی اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی، اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُه کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں امتحانات اور ابتلاءات آنے والے ہیں۔

میں سیرتِ طیبہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر "یومِ طائف" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جب دریافت کیا کہ آپ پر یومِ احد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "ہاں! مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا"۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لیے یومِ طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطہ عروج (Climax) ہے جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرامؓ کی جماعت کے لیے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے...... جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ غور کیجیے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آخری امتحان یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے سے متعلق وارد ہوا ہے کہ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ (الصٰفٰت: ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ "شاباش" کا اس سے بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا۔ وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے اہل ایمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور ان کو خوب جھنجھوڑ لیا۔

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح امڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ اُحد میں تو ستر صحابہؓ شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیر اندازی سے چند صحابہؓ شہید

ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد ونوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف ومشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' جس کا نقشہ آیت 10 میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ: وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب:۱۰) ''جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے'' تو ان حالات میں مومنین صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر وثبات کا نقشہ اس آیت میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

''اور حقیقی اہل ایمان کا حال اس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم ورضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا''۔

اس کے برعکس منافقین اور وہ لوگ جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے' ان کا کیا حال تھا؟ فوری تقابل کے لیے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات بھی دیکھ لیجیے:

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۚ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

''اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ

Salman Saleem 03067163117

تھا، صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔ جب ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں، حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (محاذ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی"۔

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مومنین صادقین علیحدہ علیحدہ نمایاں ہو گئے۔ غزوۂ احد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے، انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔ غزوۂ خندق میں جب احد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

## غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد

جب امتحان مکمل ہو گیا اور مومنین صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے تو نصرتِ الٰہی آ گئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔ مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللهُ بِمَا

Salman Saleem 03067163117

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○ (الاحزاب:۹)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اُس وقت کر رہے تھے"۔

رات کو پورا لشکر موجود تھا' صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ رات کی شدید آندھی نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور نظر نہ آنے والی فوجوں نے کھلبلی مچا دی' جس کے نتیجے میں تمام حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر کے کوچ کر گئے۔ "نظر نہ آنے والی فوجوں" سے مراد وہ مخفی قوتیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔

بہر حال اس تمام صورتِ حال کی غرض و غایت دراصل آزمائش و امتحان تھی' جس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین کے قول مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ○ کے برعکس دلی یقین کے ساتھ یہ کہا کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ اس ابتلاء سے نہ وہ ہراساں اور خوفزدہ ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے' بلکہ ان کی کیفیات یہ تھیں کہ: وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○ یعنی اس پوری صورتِ حال نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کی کیفیات کو اور زیادہ بڑھا دیا اور وہ پورے قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں "زَادَ" کا فاعل دراصل وہ پوری صورتِ حال ہے جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی۔

## ایمان میں کمی بیشی......امامِ اعظمؒ اور امام بخاریؒ کا موقف

اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لیے بھی نص ہو گئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے۔

Salman Saleem 03067163117

یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مومنین صادقین کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان کی جو کیفیت تسلیم و رضا تھی' وہ بھی بڑھ گئی ...... اور ان کا رویہ یہ ہو گیا کہ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں بھی غزوۂ احد پر تبصرے کے دوران آیا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا

"(وہ مومنین صادقین) جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا"۔

یہاں زَادَهُمْ ایمانِ حقیقی اور کامل سپردگی میں اضافے کے لیے آیا ہے۔ لہٰذا از روئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آ گئیں ...... اور جو چیز بڑھ سکتی ہے' وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا موضوع ہمارے منتخب نصاب میں ایمانِ حقیقی کے مباحث کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ یہاں میں اجمالاً وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ درحقیقت ایک قانونی ایمان ہے جو اس دنیا میں ہمارے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھے جانے کا سبب یا ذریعہ بنتا ہے۔ اس قانونی ایمان میں عمل سرے سے زیر بحث نہیں آتا' لہٰذا یہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے' نہ گھٹتا ہے۔ اس کے بارے میں سید الفقہاء امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ اَلْاِيْمَانُ تَصْدِيْقٌ بِالْجَنَانِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ لَا يَزِيْدُ وَلَا يَنْقُصُ "ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے، جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔" اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ کسی کے دل میں اتار کر دیکھ لیا جائے کہ ایمانِ حقیقی موجود ہے یا نہیں! اور کوئی جھوٹ موٹ کلمہ پڑھ رہا ہے یا سچ پڑھ رہا ہے؟ یہ قانونی ایمان کسی شخص کے اسلامی معاشرے کا فرد اور کسی اسلامی ریاست کا شہری بننے کی بنیاد بنتا ہے اور یہ ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ جبکہ ایک ہے ایمانِ قلبی یعنی تَصْدِيْقٌ

Salman Saleem 03067163117

بِالْقَلْبِ والا ایمان' جو دل میں ہوتا ہے۔ قانون اس سے بحث نہیں کرتا، لیکن آخرت میں ساری بحث اسی سے ہوگی۔ اللہ کو کسی کے قانونی مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں ہے' یہ دنیوی معاملہ ہے' دنیا میں اس بنیاد پر معاملات طے ہو چکے۔ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں پر ہے کہ یہاں ایمان و یقین ہے یا نہیں!...... اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (آیت ۱۴) "ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے"۔ قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں "عمل" ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لیے کہ دل میں یقین ہوگا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہوگا۔ اس اعتبار سے رئیس المحدثین امام بخاریؒ کا یہ قول صدفی صد درست ہے کہ اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ يَزِيْدُ بِالطَّاعَةِ وَيَنْقُصُ بِالْمَعْصِيَةِ یعنی ایمان قول و عمل کے مجموعے کا نام ہے' جو کہ اطاعت سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ یہ ضمنی بحث وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○ کے ضمن میں آ گئی۔ "اور اس چیز نے نہیں بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو"۔

یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے جو ایک قلبی کیفیت ہے اور "تسلیم" سے مراد ہے سپردگی و حوالگی۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اسلام بابِ افعال ہے اور تسلیم بابِ تفعیل ہے۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ کوئی کام ایک دم ہو جائے' لہٰذا اسلام کا مطلب ہوگا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا اور بابِ تفعیل کسی کام کے پے در پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کا مفہوم ہوگا ہر دم' ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وہ دفعتاً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آ گیا۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں یکا یک چھلانگ لگا دی اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے، ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرزِ

Salman Saleem 03067163117

عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا، تو یہ تسلیم ہے۔ یہ مصرع اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

## جواں مرد اہل ایمان کا ایفائے عہد

اگلی آیت میں فرمایا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ

(الاحزاب:۲۳)

''اہل ایمان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی (اپنی باری آنے کا) منتظر ہے، اور انہوں نے (اپنے رویے اور طرزِ عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

کاش اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرما دے!

یہ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غزوۂ احزاب کے پس منظر میں غور و تدبر کیا جائے...... اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کی مدح و ستائش فرما رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی جواں مرد اور باہمت لوگ ہیں جو اپنے عہد کو پورا کر چکے۔ یہاں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے جو رجل کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین اس سے خارج ہو گئیں۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو بالعموم مذکر کے صیغے میں خطاب کیا گیا ہے۔ ایسا بغرضِ تغلیب ہوتا ہے اور اس میں آپ سے آپ خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہاں لفظ ''رجال'' اپنی اس معنویت کو لے کر آیا ہے کہ اس دنیا میں شیطانی وساوس سے بچ کر دین پر کاربند رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ بڑی ہمت اور جواں مردی کا کام ہے۔ یہی مضمون سورۃ

Salman Saleem 03067163117

النور کے پانچویں رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْأَبْصَارُ ○

(النور: ۳۷)

''ان میں ایسے باہمت جواں مرد بھی ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی''۔

اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ کیفیات عورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ خواتین میں صحابیات ہیں، امہات المومنین ہیں، رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین۔ پھر بڑی بڑی متقی، صالح، صابر، عابد و زاہد اور مجاہد خواتین امت میں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ایک اللہ والی خاتون حضرت خنساء رضی اللہ عنہا بھی ہیں، جن کے چار جوان بیٹے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کی جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے اور انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ایک خاتون وہ بھی ہیں کہ جب غزوۂ احد میں عارضی ہزیمت ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ مدینہ تک پہنچی تو وہ بے تابانہ میدانِ احد میں آتی ہیں۔ ان کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے والد شہید ہو گئے، مگر وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ کوئی بات نہیں، مجھے یہ بتاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا۔ وہ اللہ کی بندی کہتی ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتاؤ۔ اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخیریت ہیں تو وہ کہتی ہیں: الحمد للہ! اس خوشخبری کے آگے سب کچھ ہیچ ہے...... باپ، شوہر اور بیٹا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر کامران و کامیاب ہو گئے۔ الغرض ہماری تاریخ میں ایسی خواتین کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ:

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد

Salman Saleem 03067163117

چنانچہ اس بات کو اس مقام پر ذہن میں رکھئے کہ یہاں رجال سے جواں مرد و باہمت لوگ مراد ہیں، خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔

ان آیات سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ بندۂ مومن کی زندگی کے دو رخ ہیں...... ایک طرف اللہ کے ساتھ دلی تعلق اور لگاؤ اور اس میں ثبات، اور دوسری طرف اللہ کے دین کے لیے جہاد و مجاہدہ اور اس میں صبر و ثبات اور استقلال و استقامت۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ میں جو آیۂ بِرّ کے نام سے ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے، بِرّ و تقویٰ کی حقیقت کے ضمن میں ارشاد ہوا کہ اللہ کے نزدیک صادق اور نیک لوگ وہ ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جب کوئی عہد و معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں تنگی اور مصیبت نیز جہاد و قتال کے موقع پر انتہائی صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بندۂ مومن کی زندگی کے یہ دو رخ ہیں اور ان دونوں کے اعتبار سے انتہائی صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہاں فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج (الاحزاب: ۲۳) ''اہل ایمان میں وہ جواں مرد اور باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اپنے اللہ سے کیا تھا''۔

اب غور کیجئے کہ یہ عہد کون سا ہے؟ اسلام خود ایک بہت بڑا عہد ہے۔ پھر ہم نماز کی ہر رکعت میں اس کا اقرار اور اس کی تجدید کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اللہ کے ساتھ اس سے بڑا عہد ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے طالبِ اعانت و دستگیری ہیں اور رہیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے حوالے کر دیا ہے۔ ع سپردم بہ تو مایۂ خویش را! از روئے الفاظِ قرآنی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ''بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں''۔ اب انہیں اس سودے میں پورے اتر کر دکھانا ہے۔ کہنے کو کہہ دیا، پڑھنے کو پڑھ لیا، سننے کو سن لیا، لیکن پورا اتر کر دکھانا قیامت ہے۔ کہنے کو تو شاعر نے بھی کہہ دیا کہ ؎

Salman Saleem 03067163117

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

لیکن اس پر پورا اترنا کوئی آسان بات نہیں...... پس یہاں ان اہل ایمان کی مدح و ستائش ہو رہی ہے جنہوں نے اس آزمائش و ابتلاء میں اپنے آپ کو پورا تول کر دکھا دیا۔ لہٰذا ان کی شان میں فرمایا: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ آگے فرمایا: فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ "پس ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے" یعنی اللہ کی راہ میں جان دے کر سرخرو اور سبک دوش ہو گئے...... وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ "اور ان میں وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں"۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آئے جب ہم اپنے اس عہد کو پورا کر کے سرخرو ہو جائیں اور اپنے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اتروا کر سبکدوش ہو جائیں...... اگر گردن کٹ گئی تو شانوں کا بوجھ اتر گیا اور سبکدوشی حاصل ہو گئی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ (۱)

"جو شخص صدقِ دل سے اللہ سے شہادت طلب کرتا رہے گا تو چاہے اس کی موت بستر پر واقع ہو، اللہ تعالیٰ اُسے شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا۔"

یہ اصل میں يَّنْتَظِرُ والی کیفیت کی ایک طرح کی شرح ہے۔ البتہ اس انتظار کی کیفیات اور شرائط ہوں گی...... قتال کا مرحلہ کیسے آئے گا جبکہ آپ نے جہاد ہی کی کوشش شروع نہیں کی؟ اگر آپ نے دین کے لیے محنت و مشقت کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا، آپ اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے والی کسی تنظیم و جماعت سے وابستہ ہی نہیں ہوئے تو پھر قتال کا مرحلہ کہاں سے آ جائے گا جو جہاد کی آخری اور چوٹی کی منزل ہے؟ یہ مرحلہ تو اس وقت آ سکے گا جب آپ کسی ایسی منظم دعوت اور تحریک سے عملاً وابستہ ہوں جو اقامت دین کے لیے کوشاں ہو۔ غور کیجیے ایسے صحابہ کرامؓ بھی تو ہیں جن کا ہجرت سے قبل

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب استحباب طلب الشھادۃ فی سبیل اللہ تعالیٰ

Salman Saleem 03067163117

انتقال ہو گیا' لیکن وہ دعوت وتبلیغ اور تکبیر رب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست و بازو رہے ہیں۔ اپنی جانیں' اپنا مال' اپنے اوقات' اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں لگاتے رہے ہیں' کھپاتے رہے ہیں۔ وہ اگر غزوۂ بدر یا اُحد تک پہنچ گئے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ اُن کے قدم پیچھے ہٹ جاتے! ان کا سابقہ طرزِ عمل ثابت کرے گا کہ وہ اپنے موقف میں کتنے ثابت قدم اور سرگرم عمل رہے ہیں۔ جو شخص قدم قدم پر پیچھے ہٹ رہا ہو اور پیسے پیسے کو سینت سینت کر رکھ رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اگر کبھی وقت کا تقاضا ہو تو وہ جان و مال کی بازی لگا دے گا؟......

پس جو بندۂ مومن صدقِ دل سے شہادت کا طالب ہو اور اللہ کی راہ میں نذرِ جاں پیش کرنے کا آرزومند ہو اُس کی زندگی میں اس کے عملی مظاہرے آ کر رہیں گے۔ اگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور شہادت کا طلبگار بھی ہے تو وہ اس بات کی توقع رکھے کہ اگر بستر پر بھی اس کی موت آئے تو اسے مرتبۂ شہادت مل سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس نے کاغان کا سفر شروع کیا ہے تو اس کے لیے بابوسر پاس تک بھی پہنچنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بالاکوٹ سے آگے بڑھنے اور وادیٔ کاغان میں قدم رکھنے کے لیے ہی تیار نہیں تو بابوسر پاس کب آئے گا؟ بیٹھے بیٹھے بابوسر پاس کی تمنا کرتے رہنا تو سوائے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے اور کچھ نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ع خود را بہ فریبد کہ خدارا بہ فریبد...... ایسا شخص خود اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے یا خدا کو فریب دے رہا ہے؟...... علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے کہ:

خبر نہیں نام کیا ہے اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

تو اس دھوکے کے انداز میں شہادت کی تمنا نہ ہو، بلکہ عمل کے ساتھ صدقِ دل سے یہ تمنا ہو تو بستر کی موت بھی ان شاء اللہ شہادت کی موت ہوگی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی موت بستر پر آئی ہے جن کی زندگی ہمیشہ جنگوں کے اندر بیتی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ آنجناب رضی اللہ عنہ کو بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ کا خطاب ملا تھا۔ لہٰذا ان کی شہادت گویا اللہ کی تلوار ٹوٹنے کے مترادف ہوتی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو شہادت کی موت کی بڑی تمنا تھی اور اسلام لانے کے بعد آپ کی زندگی جہاد و قتال میں

Salman Saleem 03067163117

گزری ہے۔ اگرچہ ان کی شہادت کی آرزو بظاہر پوری نہیں ہوئی، لیکن نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا قول مبارک اور نوید کے مطابق ان کی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ٥ (الاحزاب: ٢٣) ''انہوں نے اپنے رویے میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی''...... تَبْدِيْلًا یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے اور اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ان اہل ایمان نے بالکلیہ اپنے عہد اور وعدے کو ایفا کیا اور اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی، بلکہ اس کو پوری طرح نبھایا...... اور یہ جان لیجیے کہ ہمارے اور اُس معاشرے میں بڑا بنیادی فرق یہی تھا۔ وہ عہد کے سچے تھے اور ہم عہد کرتے ہیں تو اس کا ایفا نہیں کرتے' اس کو نبھاتے نہیں۔ ابھی عہد کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ دیں گے، لیکن دو دن کے اندر اس کو توڑ دیں گے۔ یہ جو ہمارے کردار میں گھن لگ گیا ہے' اس کے سبب سے ہماری شخصیتیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، جبکہ اُس معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے تو ہر چہ بادا باد' عہد کو بہر صورت ایفا کرنا اور نبھانا ہے' پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ کردار اُس معاشرے میں ایامِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ اُس دور کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیسے اس معاشرے میں ظہورِ اسلام سے قبل سرے سے کوئی خیر تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے سے بہت سے اعتبارات سے وہ معاشرہ کہیں بہتر تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی دشمن بھی مہمان کے طور پر مقیم ہو گیا' چاہے وہ باپ کا قاتل ہے' تو اس پر آنچ نہیں آئے گی اور اس حالت میں انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جسے بھائی کہہ دیا اس کے لیے جان و مال سب حاضر ہے۔ جس کو پناہ دے دی ہے اس کے لیے پورے قبیلے کی مخالفت گوارا کر لی جائے گی اور اس کی مدافعت میں اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ وہاں حال یہ تھا کہ اگر کسی کی اطاعت قبول کر لی ہے تو اب اس اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کی جائے گی۔ یہ بنیادی کردار ہوتا ہے۔ ہم اس وقت جن اسباب کی بنا پر دنیا میں ذلیل و رسوا اور پامال ہو رہے ہیں' ہمارا کوئی وقار نہیں ہے' کوئی باعزت مقام ہمیں حاصل نہیں ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کردار پست ہو چکا ہے اور ہم' الا ماشاء اللہ' بنیادی اخلاقیات سے بھی تہی دست ہو چکے ہیں۔ ہمارے کردار میں پختگی نہیں ہے' بلکہ انتہائی بودا پن موجود ہے۔ عہد کر کے نبھانے اور اس کو وفا کرنے کی خو

Salman Saleem 03067163117

اور ارادہ نہیں ہے۔ جھوٹے وعدے ہم کرتے ہیں اور اچھے اچھے اور بڑے بڑے سمجھدار لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہیں۔ یہ ہمارے کردار کی ناپختگی اور بودے پن کا بہت بڑا سبب ہے۔

ہمارے دین میں ایفاءِ عہد کی جو اہمیت ہے اس کا تفصیل سے ذکر ہمارے منتخب نصاب میں متعدد بار آتا ہے۔ جیسے آیۂ بِرّ (سورۃ البقرۃ' آیت ۱۷۷) کے درس میں اہل بِرّ و تقویٰ کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کے درس میں بیان ہوتا ہے: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ○ (الاسراء: ۳۴) اسی طرح سورۃ المومنون کے پہلے رکوع کی آیت 8 اور سورۃ المعارج کے پہلے رکوع کی آیت 32 میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر امانت اور عہد کے متعلق مومنین صالحین کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ (المومنون: ۸) "اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پوری طرح حفاظت کرنے والے ہیں" (وہی فلاح یافتہ ہیں)...... یہ ہے کردار کی اہم ترین بنیاد کہ اہل ایمان اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار کو وفا کرنے والے اور ان کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان مومنین صادقین کی اس استقامت و مصابرت کا جو نتیجہ نکلا اس کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ "تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے"۔ یہاں لام' لامِ عاقبت ہے یعنی کسی کام کا جو نتیجہ نکلتا ہے' اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس صورتِ حال کے متعلق آپ کو بتایا تھا کہ یہ کڑا امتحان اس لیے لیا گیا تھا کہ جدا کر کے اور نمایاں کر کے دکھا دیا جائے کہ کون لوگ مومنین صادقین ہیں' کون لوگ ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں اور کون لوگ منافقین ہیں! یہی تو تمیز کرنی تھی اور یہ تمیز اس لیے تھی کہ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ

## دین میں 'صدق' کا مقام و مرتبہ

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہمارے دین میں صدق کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ آیۂ بِرّ میں نیکوکاروں کے متعدد اوصاف بیان کر کے آخر میں فرمایا گیا:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

Salman Saleem 03067163117

صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرہ:۱۷۷)

''(حقیقی نیکوکار تو وہ لوگ ہیں) جو تنگی اور مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کرنے والے ہوں' یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں، اور یہی لوگ درحقیقت متقی ہیں''۔

سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ○ (التوبہ:۱۱۹)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں میں شامل ہو جاؤ''۔

صدیقین کے اوصاف میں سے چوٹی کے دو اوصاف یہ ہیں کہ وہ ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے اور مصیبت و ابتلاء میں اور میدانِ قتال و وغا میں استقامت و مصابرت کا مظاہرہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لیے سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں منعم علیہم کی فہرست میں نبیین کے بعد صدیقین ہی کا رتبہ اور مقام بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین''۔

اس صدق کی بنیاد یہی ہے کہ قول میں سچے ہوں' وعدوں میں سچے ہوں' عمل میں سچے ہوں...... اگر راست گفتاری نہیں ہے' راست بازی نہیں ہے' راست کرداری نہیں ہے تو نہ تقویٰ ہے اور نہ نیکی ہے۔ اس کے بغیر دین کا ڈھانچہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ بے وقعت و بے روح ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے کے افراد صرف نمائشی پہلوان ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی دین محض بطور نمائش شامل ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ معاشرہ صدق کی دولت سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ یہ پونجی اور یہ سرمایہ اس کے پاس سے نکل چکا ہے اور اس پہلو سے وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ الا ماشاء اللہ، کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ پونجی

Salman Saleem 03067163117

موجود ہو۔ حالانکہ ہمارے دین کا شدید ترین مطالبہ یہ ہے کہ جو کہہ رہے ہو اس کو عمل سے سچ کر دکھاؤ' جو تمہارے اندر ہے وہی باہر لاؤ۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں' جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' دوٹوک انداز میں فرمادیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝

''اے اہل ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ حرکت سخت ناپسندیدہ اور بیزار کن (اور اس کے غضب کا باعث) ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں۔ اللہ کو تو وہ اہل ایمان محبوب ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں''۔

یہ ہے دراصل صدق کی بنیاد...... صدق قول کا بھی ہے' صدق عمل کا بھی ہے' صدق انسان کی سیرت و کردار کا بھی ہے...... صدق بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں نقد جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی ہے۔ اب ان آیات میں صدق کی اہمیت دیکھئے۔ فرمایا:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۲۳، ۲۴)

''اہل ایمان میں وہ باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری کا منتظر ہے، اور انہوں نے (اپنے طرزِ عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ مومنین صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقین کو اگر چاہے تو سزا دے یا اگر چاہے تو (ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور) ان کی توبہ قبول فرمالے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے''۔

Salman Saleem 03067163117

## منافقین کے بارے میں تدریجی احکام

غزوۂ احزاب ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ زمانہ مدنی دور کا وسط ہے۔ منافقین کے باب میں آپ کو قرآن مجید میں یہ تدریج نظر آئے گی کہ شروع میں یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران میں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ صرف اس مرضِ نفاق کی علامات ظاہر کی گئیں۔ سورۃ النساء میں لفظ نفاق کے ساتھ سخت لہجہ اور اسلوب میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہاں یہ معاملہ ہے کہ منافقین کا کردار تو واضح اور نمایاں طور پر بیان کر دیا گیا ہے' لیکن ان کے رویے کے متعلق آخری فیصلہ ابھی نہیں سنایا گیا، تا کہ اگر کسی کے اندر اصلاح پذیری کا کوئی مادہ اور رمق موجود ہے تو وہ اصلاح کر لے۔ کوئی اگر نفاق کی حالت سے لوٹ سکتا ہے تو لوٹ آئے۔ کوئی اگر ایمانِ حقیقی کی طرف رجوع کر سکتا ہے تو کر لے' دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ لیکن آگے جا کر اس ضمن میں آخری احکام اور فیصلے آئے ہیں' جن میں سے ایک فیصلہ تو سورۃ النساء میں شامل کیا گیا کہ: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۝ (النساء:۱۴۵) ''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے، اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے''۔ اور سورۃ التوبہ (البراءۃ) میں جو ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی' مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے ان منافقین کی اصل حقیقت کھول کر یہ فیصلے صادر فرما دیے گئے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ هِیَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۝ (التوبہ:۶۸)

''منافق مَردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لیے موزوں ٹھکانہ ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے، اور ان کے لیے قائم و دائم رہنے والا عذاب ہے''۔

آگے یہاں تک فرما دیا کہ:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (التوبہ:۸۰)

Salman Saleem 03067163117

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ خواہ ایسے لوگوں کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپ ستر بار بھی ان کو معاف کر دینے کی درخواست کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسقوں کو راہ یاب نہیں فرماتا''۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا مزاج ہے۔ آپ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ بار استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں کرتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ یہاں ستر سے مراد عدد یا ہندسہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک استعارہ ہے۔ یہاں ستر کا لفظ کثرت کے لیے آیا ہے کہ اب ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ان کو بار بار متوجہ کیا گیا۔ تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان کو اصلاح کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اس مقام پر ہی دیکھ لیجیے کتنے پیارے انداز میں فرمایا گیا: وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۲۴) مومنین صادقین کے لیے تو قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا: لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ لیکن منافقین کے لیے توبہ کرنے اور اپنے رویے کی اصلاح کرنے کا موقع رکھا گیا اور ان کو مہلت دی گئی کہ ابھی ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلے کا وقت نہیں آیا ہے، ابھی ان کے لیے راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا رکھا گیا تھا لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غفوریت اور رحمانیت کا بیان فرما دیا تا کہ منافقین بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ گویا ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ، لوٹو اور رجوع کرو۔

| | |
|---|---|
| باز آ باز آ آں ہر چہ ہستی باز آ | گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ! |
| ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست | صد بار اگر توبہ شکستی باز آ! |

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب آگے چلیے۔ فرمایا: وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ''اور اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا اور وہ اپنے دل کی جلن اور غصہ وغیظ لیے یونہی پلٹ گئے اور ان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا''۔ غور کیجیے کہ ان کفار کو کن کن حسرتوں کا منہ دیکھنا پڑا ہوگا۔

Salman Saleem 03067163117

کیسے کیسے ساز وسامان کے ساتھ اور کیسی کیسی سازشوں کے نتیجے میں اتنی مختلف سمتوں سے لشکروں کا ایک جگہ آ کر جمع ہو جانا! اس کے لیے انہوں نے کیا کیا کھکھیڑ مول نہیں لیے ہوں گے؟ کتنی سفارتی بھاگ دوڑ اور چلت پھرت ہوئی ہوگی۔ کتنے ایلچی آئے اور گئے ہوں گے۔ کتنے پروگرام بنے ہوں گے! وہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن کا دور تو نہیں تھا۔ اس زمانے کے عرب میں اس حملے کی تیاری اور پروگرام بنانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے ہوں گے، ذرا ان کا تصور تو کیجیے! لیکن ان کے متحدہ محاذ اور ان کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خیمے اکھاڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر ان کے دلوں میں غیظ وغضب کی جو آگ سلگ رہی تھی اس پر اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہا ہے: وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو ان کے غیظ وغضب سمیت لوٹا دیا، اب وہ اس میں سلگیں اور جلیں، گویا ان کے دل آگ کی بھٹی بنا دیے گئے...... وہ کوئی خیر نہ پا سکے، کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اپنے مقاصد میں سے کچھ بھی انہیں ملا ہوتا، وہ ناکام اور خائب وخاسر ہو کر لوٹا دیے گئے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ "اور اللہ کافی ہو گیا اہل ایمان کی طرف سے قتال کے لیے"۔ قتال کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ خندق میں جو کوئی بھی کودا مبارزت طلبی کے بعد واصل جہنم ہوا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا! سیرتِ مطہرہ کی کتب میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے پوری کوشش کی تھی لیکن انہیں خندق میں لشکر اتارنے کی ہمت نہیں ہوئی، کیونکہ مسلمان تیر اندازوں نے اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کو ہزیمت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا اس غزوے میں دو بدو گھمسان کی جنگ، جیسے بدر اور احد میں ہوئی، کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ یہ جنگ تو اللہ نے مسلمانوں کے لیے جیت لی۔ اصل میں تو مسلمانوں کا امتحان مقصود تھا، وہ ہو گیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو گیا، یعنی اہل ایمان اور اہل نفاق جدا جدا ہو کر نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ بس یہی مطلوب تھا۔ اب کفار کے لشکروں کے منہ موڑنے کے لیے اللہ کافی ہو گیا۔

یہ آیت مبارکہ اس پُرجلال وپُرہیبت اسلوب سے ختم ہوتی ہے کہ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا

Salman Saleem 03067163117

عَزِیْزًاO ''اللہ بڑی قوت والا' زبردست ہے''۔ اس سے پہلے کی آیت میں درِتوبہ وا رکھا گیا تھا، لہٰذا وہاں صفات کون سی آئیں؟ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاO آیات کے آخر میں بالعموم اللہ کی جو صفات یا اسماءِ حسنیٰ آتے ہیں ان کا مضمون سے گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ ان پر سے سرسری طور پر گزرنا نہیں چاہئے۔ یہاں دو صفات کی وساطت سے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔ اس کی ذاتِ والا صفات فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُO ہے' وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ پورے عرب کے مشرک قبائل اور یہود کے دو قبیلے متحدہ محاذ بنا کر اسلامی تحریک کو بالکلیہ نیست و نابود کرنے کے لیے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے، لیکن تقریباً ایک ماہ کے طویل محاصرے کے بعد قدرتِ الٰہی کا کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی' کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی نے دشمنوں کے خیمے تلپٹ کر دیئے تھے اور ان کے اندر شدید افراتفری مچ گئی تھی۔ مشرکین عرب کا یہ متحدہ محاذ قدرتِ الٰہی کا یہ کاری وار سہہ نہ سکا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا جس کو دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے تھے:

لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ (۱)

''اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے، بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے''۔

## غزوۂ بنو قریظہ...... غزوۂ احزاب کا ضمیمہ و تتمہ

آگے چلیے! غزوۂ احزاب کا جو ضمیمہ اور تتمہ ہے' یعنی غزوۂ بنی قریظہ' اس کا نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اس رکوع کی آخری دو آیات میں ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر یہاں غزوۂ احزاب کے ضمن میں ایک Appendix کے طور پر کیا گیا ہے۔

(۱) تفسیر ابن کثیر

Salman Saleem 03067163117

ان دو آیات کے مطالعے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ میں یہود کے جو تین قبائل آباد تھے ان کے متعلق تھوڑا سا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ یہ قبیلے تھے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ نبی کریم ﷺ کا کمالِ تدبر یہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد آپؐ نے ان تینوں قبائل کو ایک معاہدے کا پابند کرا لیا تھا۔ حضور ﷺ کی اس کمال فراست کو میں جو بھی خراج تحسین پیش کروں گا، وہ عقیدت میں شمار ہو سکتا ہے، لیکن اس تدبر و فراست پر مستشرقین کمال درجہ کا خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔ وہ ایچ جی ویلز ہوں، منٹگمری واٹ ہوں یا دوسرے مستشرقین ہوں، انہوں نے حضورؐ کے کمال تدبر اور پیش بینی کی جو مدح سرائی کی ہے، وہ کافی ہے۔ اصل تعریف و شہادت تو وہ ہے جو اَعداء دیں۔ مدینہ میں بسنے والے اوس و خزرج کے اکثر لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دو قبیلے اصلاً مدینہ کے رہنے والے تھے، جبکہ یہود باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اوس و خزرج کی دعوت پر ہی باذنِ الٰہی حضور ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور یہاں تشریف آوری کے بعد آپؐ کی حیثیت مدینہ کے امیر، حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ کی ہو گئی۔ آپؐ نے ان یہودی قبائل کو اس معاہدے میں جکڑ لیا کہ اگر باہر سے مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا جو یہود کے گلے کا طوق بن گیا۔ یہ معاہدہ نہ ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ واللہ اعلم!

اپنی جگہ پر ایک دوسری بات بھی قابل توجہ ہے کہ مسلمان قوم جب بگڑتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر وھن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لفظ "وھن" کی حضور ﷺ نے تشریح یوں فرمائی ہے کہ حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ (۱)۔ یعنی اس قوم میں دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔ یہود اس وقت کی بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ان کے اندر وہ ضعف تھا کہ سورۃ الحشر میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ط" (اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام۔

Salman Saleem 03067163117

کر"۔ان یہودیوں کے برعکس مشرکین نے کھلے میدانوں میں آ کر جنگ کی ہے۔ابوجہل نے غزوۂ بدر میں اپنے معبودانِ باطل اور اپنے اوہامِ باطلہ کے لیے دو بدو ہو کر میدان جنگ میں گردن کٹوائی۔لیکن یہود کا معاملہ یہ ہے کہ جب لڑیں گے تو فصیلوں پر چڑھ کر عورتوں کی طرح پتھراؤ کریں گے۔پھر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ازروئے الفاظ قرآنی: بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ۚ (الحشر: ١٤) تم ان کو اکٹھا سمجھتے ہو حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔لہٰذا تم ان سے گھبراؤ نہیں۔بظاہر ان کی جمعیت بہت مرعوب کن ہے' یہ بہت پیسے والے ہیں' ساز و سامان بھی ان کے پاس وافر موجود ہے' اسلحہ بھی ان کے پاس بہت ہے' ان کے پاس گڑھیاں ہیں' قلعے ہیں۔صورتِ واقعہ یہ تھی کہ یہ اندر سے اتنے بودے تھے کہ ان میں میدان میں آ کر لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔پھر ان تمام کمزوریوں کے علی الرغم نبی اکرم ﷺ نے ان کو معاہدے میں جکڑ لیا تھا۔

اب یہ ہوا کہ مختلف مواقع پر اس معاہدے پر تلملاتے رہے۔ان میں سب سے زیادہ شجاع بنو قینقاع تھے۔آہن گری اور زرگری کے پیشے کے اعتبار سے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور سامانِ حرب اسلحہ وغیرہ بھی کافی تھا۔غزوۂ بدر کے بعد سب سے پہلے ان کی طرف سے نقضِ عہد ہوا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی۔حضور ﷺ نے فوراً اقدام فرمایا اور ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا۔یہ پہلا موقع تھا۔نبی اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ بڑی رعایت برتی' ان کو اپنا تمام ساز و سامان لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اونٹوں پر اپنا تمام اسباب لاد کر گاتے بجاتے ایک جشن کی صورت میں مدینہ سے نکلے۔یہ پہلا معاملہ تو ٢ھ میں بدر کے بعد بنو قینقاع کے ساتھ ہو گیا۔غزوۂ احد کے بعد یہی معاملہ بنو نضیر کے ساتھ پیش آیا۔احد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور یہ قبیلہ دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا۔یہاں تک کہ اس نے خود نبی اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش تک کر ڈالی۔نبی اکرم ﷺ نے اس قبیلے کو بھی مدینہ بدر کر دیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر کے آس پاس جا کر آباد ہو گئے' جہاں یہودی پہلے سے آباد تھے اور انہوں نے بڑی مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔

Salman Saleem 03067163117

## اہل ایمان کے خلاف مشرکین عرب اور یہود کی مشترکہ سازشیں

ان دونوں قبیلوں کو اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی عداوت تو پہلے ہی سے تھی۔ مدینہ سے جلا وطنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ قبیلے خیبر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف عرب کے مشرک قبائل کو بھڑکانے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے پر اکسانے کے لیے مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ ان کے سردار' ان کے شعراء اور ان کے خطیب مشرکین کے قبیلوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ چنانچہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب میں ہر چہار سمت سے عرب کے مشرک قبائل نے مدینہ پر جو یلغار کی وہ انہی یہود کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس یلغار کی نقشہ بندی میں بھی یہی یہودی پیش پیش تھے۔ اس موقع پر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' حملہ آور لشکریوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اتنی بڑی جمعیت اس سے قبل کبھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ حملہ اچانک ہوتا تو سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہو سکتا تھا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آپ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کی برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر دفاع کے لیے جبل احد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ اسی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ بقیہ سمتوں میں قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے نا آشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرے کے لیے مجبور ہونا پڑا' جس کے لیے وہ تیار ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نہیں آئے تھے۔

اب ان کے لیے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کے یہودی قبیلے کو مدینہ منورہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ طے تھا کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کریں گے لہٰذا اس طرف سے بے فکر ہو کر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس سمت میں دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا بلکہ اپنی عورتیں اور بچے بھی ان گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنو قریظہ کی جانب تھیں۔ کفار نے مسلمانوں کے دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا اور انہوں نے بنو قریظہ کے سرداروں کے پاس سفارت بھیج کر ان کو غداری پر آمادہ کرنے کی

Salman Saleem 03067163117

کوشش کی۔ اول تو وہ ہچکچائے کہ ہمارا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ ہے اور ہم کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابتداء میں ان کا موقف یہی تھا، لیکن اس کے بعد حُیَی بن اخطب نے ان کو مزید دلائل دیے کہ "دیکھو میں عرب کی متحدہ قوت کو محمدؐ پر چڑھا لایا ہوں' اسلام کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اتنے بڑے لشکر آئندہ کبھی جمع نہیں ہو سکیں گے اور پھر ساری عمر ہم سب کو کفِ افسوس ملنا پڑے گا' کیونکہ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا"۔ ابن اخطب کی ان باتوں سے بنو قریظہ پر بھی معاہدے کی پاسداری اور اخلاقی اقدار کے لحاظ پر اسلام دشمنی غالب آ گئی اور وہ نقضِ عہد پر آمادہ ہو گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ آپؐ نے انصار کے سرداروں میں سے حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ، نیز دو اور حضرات (رضی اللہ عنہم) کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا کہ جا کر تحقیق کر کے آئیں کہ صورتِ حال کیا ہے! ادھر خود اہل ایمان کے لشکر میں منافقین کا ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے خبریں پھیلا رہے تھے کہ اب بنو قریظہ کی جانب سے بھی حملہ ہوا چاہتا ہے، لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے گھروں کی خبر لو جو جنوب مشرقی گوشے سے بنو قریظہ کی براہِ راست زد میں ہیں۔ آیت ۱۳ میں منافقین کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: يَٰٓأَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمۡ فَٱرۡجِعُواْ "اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پس پلٹ چلو"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن سرداروں کو بنی قریظہ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا تھا ان کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ بنو قریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو تم آ کر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان خوش خبری دینا کہ یہ محض افواہ ہے' اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے' لیکن اگر وہ نقضِ عہد کا فیصلہ کر چکے ہیں تو صرف مجھے اشارۃً اس کی اطلاع دینا' عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے حوصلے مزید پست ہو جائیں۔ ان حضرات نے واپس آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشارہ و کنایہ میں بنو قریظہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے کہ بنو قریظہ کے سرداروں نے ان انصار سے برملا کہہ دیا تھا کہ لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ "ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مابین کوئی عہد و پیمان نہیں ہے"۔

Salman Saleem 03067163117

## بنو قریظہ کی غداری اور نُعیمؓ بن مسعود کی حکمت عملی

غزوۂ احزاب میں سب سے زیادہ تشویشناک صورت بنو قریظہ کی اس غداری سے ہی تھی۔ اس لیے کہ نہ صرف اسلامی لشکر کا عقب محفوظ نہیں رہا تھا بلکہ وہ گڑھیاں اور مدینہ منورہ کا شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے جہاں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کی شاخ اشجع سے ایک صاحب نُعیم بن مسعودؓ مسلمان ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے اسلام قبول کرنے کا ابھی کسی کو علم نہیں ہے' آپ اس وقت جو چاہیں مجھ سے خدمت لے سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم جا کر ان احزاب اور بنو قریظہ میں پھوٹ ڈالنے اور عدم اعتماد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ وہ پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے جہاں ان کا پہلے ہی سے آنا جانا تھا اور وہ وہاں متعارف تھے اور ان کے سرداروں سے کہا کہ "قریش اور غطفان کے قبائل تو محاصرے کی طوالت سے تنگ آ کر بغیر لڑے بھڑے واپس بھی جا سکتے ہیں' ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' لیکن تم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا؟ اس کو بھی سوچ لو۔ میری رائے ہے کہ تم اس وقت تک کوئی اقدام نہ کرنا جب تک باہر سے آئے ہوئے ان قبائل کے چند سر برآوردہ لوگ تمہارے پاس بطور یرغمال نہ ہوں"۔ بنو قریظہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یہ مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "میں بنو قریظہ کے پاس سے آ رہا ہوں' وہ کچھ متذبذب معلوم ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے یرغمال کے طور پر چند آدمی طلب کریں اور پھر انہیں محمد (ﷺ) کے حوالے کر کے ان کے ساتھ از سرنو اپنا معاملہ استوار کر لیں' اس لیے ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت ہے"۔

سردارانِ لشکر یہ بات سن کر ٹھٹک گئے۔ انہوں نے بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اس طویل محاصرے سے تنگ آ گئے ہیں' اب ایک فیصلہ کن معرکہ ہونا ضروری ہے۔ کل تم اپنی سمت سے بھرپور حملہ کرو' ادھر سے ہم یکبارگی مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے۔ بنو قریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ اپنے چند چیدہ آدمی بطور یرغمال ہمارے حوالے نہیں

Salman Saleem 03067163117

کریں گے، ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ انہوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچے کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ نتیجتاً نعیم بن مسعودؓ کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور دشمنوں کے کیمپ میں بداعتمادی اور پھوٹ پڑ گئی۔

## بنو قریظہ کے خلاف اقدام کا فیصلہ

بنو قریظہ نے اگرچہ عملاً غزوۂ احزاب میں کوئی حصہ نہیں لیا...... لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ فسخ کر چکے تھے اور انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ۔ لہٰذا اب جب کہ غزوۂ احزاب اس معنی میں ختم ہوا کہ مشرکین عرب کے تمام لشکر محاذ چھوڑ کر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے تو نبی اکرم ﷺ اپنے ہتھیار اتار رہے تھے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! آپ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جا کر بنو قریظہ کا محاصرہ فرمائیے"۔ چنانچہ اسی وقت حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

## اصحابُ الرائے اور اصحابُ الحدیث کے مابین اختلاف کی حقیقت

اب یہاں ایک اہم بات بھی لگے ہاتھوں بیان کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو دو مکاتیب فکر ہیں، یعنی اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث، ان کے مابین اصل اختلاف کیا ہے! وہ نوٹ کر لیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ معنی کیا تھے؟ یہ کہ جلد سے جلد پہنچو! اللہ کا حکم ہے، حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر بتایا ہے۔ پس جلد پہنچنے کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ عصر سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ تاکہ ان کا معاملہ چکا دیا جائے۔ اب راستے میں صورت یہ پیش آ گئی کہ ایک ٹکڑی ابھی بنو قریظہ تک نہ پہنچ پائی تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لشکر مختلف ٹکڑیوں میں منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کئی میل کا سفر تھا۔ جس ٹکڑی کو راستہ ہی میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو نماز قضا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ حضور کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہاں پہنچے بغیر عصر مت پڑھو، بلکہ منشا یہ تھا

Salman Saleem 03067163117

کہ ہم عصر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کسی وجہ اور مجبوری سے درمیان ہی میں عصر کا وقت ہو گیا ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہئے۔ لیکن دوسرے فریق نے کہا کہ نہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے ہم تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو ''منشا'' بیان نہیں فرمایا' لہٰذا ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ کی پیروی کریں گے اور عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے قبل نہیں پڑھیں گے' چاہے نماز قضا ہو جائے۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کرلیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے صحیح عمل کیا۔

اب یہ ہے وہ حکمت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیں تعلیم فرما گئے ہیں۔ لہٰذا خدارا بات کو کھلے دل سے سمجھئے اور خواہ مخواہ رائے' تعبیر اور اجتہاد کے اختلاف پر مستقل طور پر من دیگرم تو دیگری کا رویہ اختیار نہ کیجئے۔ یہ تفرقہ وحدتِ امت کے لیے سمّ قاتل ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ حدیث کے جو الفاظ (Letters) ہیں ہم تو بالکل حرف بہ حرف' ہو بہو Literally اس پر عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ علت کیا ہے اور حکمت کیا ہے؟ وہ اللہ جانے اور اس کا رسولؐ جانے۔ اگر مسواک کا لفظ حدیث میں آیا ہے تو ہم تو مسواک ہی استعمال کریں گے۔ جبکہ دوسرا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ مسواک کرنے کی اصل غایت وعلت دانت صاف رکھنا ہے، اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش سے دانت صاف کرلیے تو مقصد پورا ہو گیا۔ اس طرح یہ دو مکاتیب فکر ہیں۔ ایک اصحابِ حدیث جو حدیث کے الفاظ کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح اور اقرب الی السنۃ سمجھتے ہیں اور اسی طرزِ عمل میں عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اصحاب الرائے ہیں جو غور و تدبر کرتے ہیں کہ کسی حدیث کی اصل حکمت کیا ہے' اس کی غرض و غایت کیا ہے! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دونوں قسم کے طرزِ عمل کی تصویب فرمائی...... یہ اللہ کا شکر اور اس کا کرم و فضل ہے کہ اس معاملے میں اُس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دونوں طرزِ عمل کی تائید کرادی۔ اس لیے کہ دونوں کی نیت دراصل تعمیلِ حکم اور اتباع تھا۔ پس ہم کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ دونوں Attitudes کے لیے اپنے دل میں کشادگی پیدا کریں۔ عمل تو ایک ہی پر ہوگا' اس میں تو کوئی شک نہیں، یا آپ الفاظِ ظاہر پر عمل کریں گے یا اس کی حکمت و علت معلوم کر کے اسے اختیار کریں گے۔

Salman Saleem 03067163117

اجتہاد کی بنیاد بھی تو یہی ہے کہ اہل علم احکامِ شرعیہ کی علت تلاش کریں اور دیکھیں کہ درپیش مسئلہ میں علت کس درجہ کی مشترک ہے، اسی کے مطابق قیاس کر کے مسئلہ کا حل نکال لیا جائے...... تو یہ طریق تھا اصحابِ فقہ کا جن کو اصحاب الرائے بھی کہا گیا ہے اور اول الذکر طریقہ تھا اصحابِ حدیث کا۔ لیکن حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے دونوں مسلک حق ہیں' اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ میں دونوں فریقوں کی تصویب فرمائی۔ یہ واقعہ اسی غزوہ کے دوران پیش آیا تھا تو میں نے چاہا کہ اسے بھی آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہر واقعہ میں ہمارے لیے رہنمائی ہے اور یہی حضور کے اسوۂ حسنہ کے اکمل واتم ہونے کی دلیل ہے...... بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آ گئی' اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیجئے۔

بنوقریظہ کا محاصرہ

بنوقریظہ کی گڑھیوں پر سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بطور مقدمۃ الجیش پہنچا۔ بنوقریظہ یہ سمجھے کہ یہ ہمیں محض دھمکانے آئے ہیں۔ وہ اُس وقت تک تو بڑے طنطنے میں تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی شان میں گستاخیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں پورے اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے عین آڑے وقت اور پُرخطر حالات میں معاہدہ توڑ ڈالا تھا اور مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت خیز خطرے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے پشت سے خنجر گھونپنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ یہ تو حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کی جنگی چال اور حکمت عملی تھی' جس سے وہ مات کھا گئے۔ ان کا جرم کسی طور پر بھی قابلِ عفو نہیں تھا اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تھی۔

جب محاصرے کی شدت' جو دو تین ہفتے جاری رہی' ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا جائے' وہ ان کے متعلق جو بھی فیصلہ کریں وہ فریقین تسلیم کر لیں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس توقع پر حکم بنانے کی تجویز رکھی تھی کہ اوس اور بنوقریظہ کے مابین مدتوں سے حلیفانہ تعلقات چلے آ رہے

Salman Saleem 03067163117

تھے۔ان کو امید تھی کہ وہ ان کا لحاظ کریں گے اور بنو قینقاع اور بنو نضیر کی طرح ان کو بھی اپنے ساز وسامان اور مال و اسباب کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔
حضرت سعدؓ کو خندق میں دشمنوں کا ایک تیر لگ گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے علاج معالجہ کے لیے مسجد نبویؐ میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی تیمارداری فرما رہے تھے اور آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخم کو داغا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت سعدؓ سے بہت محبت تھی۔ انصار میں دو سعد تھے۔ ایک سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے رئیس تھے اور دوسرے سعدؓ بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے رئیس تھے۔ خود حضرت سعدؓ بن معاذ کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی محبت تھی۔ ان کی بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح فدویت کی کیفیت تھی۔

## حضرت سعدؓ بن معاذ کا تورات کے مطابق فیصلہ

حضرت سعدؓ بن معاذ ایک ڈولی میں بنو قریظہ کی بستی میں لائے گئے۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا وہ عین یہودی شریعت کے مطابق تھا کہ بنو قریظہ کے تمام جنگ کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے‘ عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ حضرت سعدؓ اس غزوہ میں دیکھ چکے تھے کہ بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مدینہ سے نکل جانے دیا گیا تو وہ گرد و پیش کے سارے قبائل کو بھڑکا کر قریش کی سرکردگی میں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ چنانچہ حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنو قریظہ کے ساتھ ہوا۔ اگر یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تسلیم کر لیتے جو انتہائی رؤف اور رحیم تھے تو وہ شاید اس انجامِ بد سے بچ جاتے‘ لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی‘ اس لیے ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عدم اعتماد کیا...... جیسا کہ عرض کر چکا ہوں‘ حضرت سعدؓ بن معاذ نے یہ فیصلہ عین تورات کے مطابق کیا تھا۔ بنو قریظہ اسی انجام کے مستوجب تھے‘ کیونکہ انہوں نے اُس وقت جبکہ مسلمانوں کے لیے انتہائی کٹھن وقت تھا‘ عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان بنو قریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو ان کو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان

Salman Saleem 03067163117

غداروں نے پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شامل حال نہ ہوتی تو ایک طرف مشرکین یکبارگی خندق عبور کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے اور دوسری طرف بنوقریظہ یہ سارا جنگی سامان عین عقب سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرتے۔

## غزوۂ بنوقریظہ پر قرآن کا تبصرہ

زیر درس رکوع کی بقیہ دو آیات کا تعلق اسی بنوقریظہ کے واقعہ سے ہے، اس لیے میں نے قدرے تفصیل سے صورتِ حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان آیات کے پس منظر سے براہِ راست متعلق ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کیجیے۔ فرمایا:

وَاَنۡزَلَ الَّذِیۡنَ ظَاهَرُوۡهُمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مِنۡ صَيَاصِيۡهِمۡ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ فَرِيۡقًا ۝

(الاحزاب: ۲۶)

''اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا (یعنی بنوقریظہ) تو اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے کو قید کر رہے ہو''۔

بنوقریظہ پہلے تو محاصرے کی حالت میں اپنے قلعوں پر چڑھے رہے، لیکن دو تین ہفتوں سے زیادہ سہار نہ سکے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار لایا۔ یہاں ظَاهَرُوۡهُمۡ کا لفظ قابل توجہ ہے۔ اس کی اصل ظَهَرَ ہے۔ باب مفاعلہ میں اس سے مُظَاهَرَة بنتا ہے۔ ظہر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں آخری مقابلہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ہوتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی سی نفری کسی بڑی نفری کے گھیرے میں آ جاتی تھی تو چھوٹی نفری والے باہم پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا مفہوم ہوگا کسی مقصد کے غلبہ کے لیے یک جان ہو کر کام کرنا...... اس لیے میں نے اس آیت کی ترجمانی میں ''حملہ آوروں کا ساتھ دینا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ صِیۡصٌ کی لغوی بحث کو بھی سمجھ لیجیے۔ صِیۡصٌ مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں، اس کی جمع صَیَاصِیۡ ہے۔ چونکہ مرغ اپنے پنجوں سے

Salman Saleem 03067163117

دفاع کرتا ہے لہٰذا عرب اس لفظ کو استعارتاً دفاعی قلعوں اور گڑھیوں کے لیے استعمال کرنے لگے...... بنوقریظہ نہ تو حملہ آوروں کا ساتھ دے سکے اور نہ ان کے قلعے ان کو پناہ دے سکے اور وہ ان سے نیچے اترنے اور باہر نکل کر خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر وہ دوبدو لڑنے کا فیصلہ کرتے تو ان کے جو چھ سات سو مرد قتل ہوئے تھے' یہ سو دو سو مسلمانوں کو بھی شہید کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو سازوسامان جمع کر رکھا تھا' اس کی تفصیل میں بیان کر چکا ہوں، لیکن اسلحہ استعمال کرنے کے لیے ہمت اور جوش و ولولہ درکار ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کو وَھَن کی بیماری لگ جاتی ہے یعنی حبِّ دنیا اور موت کا خوف تو یہ حال بھی ہوتا ہے کہ میزائل تک دھرے رہ جاتے ہیں اور فوج کو ان کے بٹن دبانے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ جان بچانے کے لیے اپنی جوتیاں چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ معاملہ کئی مواقع پر مسلمانوں کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ صحرائے سینا سے مصری فوج اسرائیل کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح فتنۂ تاتار کے دور میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کے بازاروں میں سو مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور ایک تاتاری آ کر ان سے کہتا تھا کہ میرے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے' میں یہ لے کر آتا ہوں' خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے......اور وہ تلوار لے کر آتا تھا اور ایک ایک کی گردن مارتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بنوقریظہ میں جرأت و ہمت ہوتی تو حضرت سعدؓ کے فیصلے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے کہ یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے' سو پچاس کو ساتھ لے کر مریں گے' لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ ان کے مرد قتل کیے گئے اور ان کی عورتیں' بچے اور بچیاں غلام اور لونڈیاں بنائی گئیں۔

اس پوری صورتِ حال پر صرف ایک آیت میں تبصرہ فرما دیا گیا:

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ○ (الاحزاب:۲۷)

Salman Saleem 03067163117

''اور اللہ نے تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنادیا اور وہ علاقہ تمہیں دے دیا جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

بنو قریظہ ایک بڑا یہودی قبیلہ تھا' بہت مالدار اور سرمایہ دار...... ان کے بڑے بڑے باغات اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں' بے شمار مال و متاع تھا...... یہ پورا علاقہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر لڑے بھڑے عطا کر دیا۔ جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ صرف محاصرے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہاتھ آ گیا۔ اس زمین پر گھوڑے دوڑے ہی نہیں کہ وہ پامال ہوتی۔

اس رکوع کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ○ (الاحزاب: ۲۷) اور واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کا اس سے جامع اختتام ممکن ہی نہیں تھا۔ غزوۂ احزاب کی پوری صورت واقعہ اور بنو قریظہ کا خاتمہ' یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کی شان کے مظاہر ہی تو تھے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (یوسف: ۲۱) ''اللہ غالب ہے' وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔ اگر لوگوں کو یہ یقین قلبی ہو جائے تو اُسی سے مانگیں' اسی سے جڑیں' اسی کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ انہیں تو ان وسائل اور اسباب پر یقین و توکل ہوتا ہے جو ان کی دسترس میں ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ [1]

''دنیا میں زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تم حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو اور مال کو ضائع کرو' بلکہ دراصل زہد یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا اعتماد و توکل اس سے زیادہ ہو جو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے''۔

اگر تم اپنے وسائل' اپنے ذرائع' اپنی صلاحیتوں' اپنی ذہانت اور اپنی قوت کو مقدم رکھو گے اور ان پر تکیہ کرو گے تو تم کو زہد چھو کر بھی نہیں گیا۔ لیکن اگر تم کو اللہ کی توفیق' اللہ کی تائید'

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا

Salman Saleem 03067163117

اللہ کی نصرت اور اللہ کی قدرت پر ہی اعتماد و توکل اور بھروسہ ہو جائے تو یہ اصل زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ہم نے آج اس رکوع کا مطالعہ ختم کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ ہم اس رکوع کے مطالعہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں آپؐ کے اس ''اسوۂ حسنہ'' کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے جو غزوۂ احزاب کے پس منظر میں اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔ پورے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''اسوۂ حسنہ'' کا تذکرہ اسی ایک مقام پر کیا گیا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خود آپؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے سخت دن ''یومِ طائف'' گزرا ہے لیکن بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر سب سے زیادہ ابتلاء و آزمائش کا مرحلہ یہ غزوۂ احزاب ہے' جس میں جانی نقصان تو اگرچہ بہت کم ہوا لیکن اس محاصرے کے دوران جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا' صحابہ کرامؓ کی جماعت کو جن شدائد و مصائب اور تکالیف سے سابقہ پیش آیا ان کو بجا طور پر ابتلاء کا نقطہ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ دی ہے: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ○ (الاحزاب:١١)

آج کا یہ درس ان لوگوں کے لیے انتہائی سبق آموز ہے جو بفضلہ تعالیٰ شعوری طور پر یہ بات جان چکے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ' اظہار دین الحق اور اقامت دین' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر فرض ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تقریر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلو اجاگر کروں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع اور صحابہ کرامؓ کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا کرے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

(بحوالہ ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم'')

Salman Saleem 03067163117

# ختمِ نبوت

''ختمِ نبوت کے دو مفہوم اور تکمیل رسالت کے تقاضے'' کے موقع پر بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا زیر نظر خطاب ۲۳ جون ۲۰۰۲ء کو لاہور کے الحمرا ہال نمبر ا میں ہوا۔ سامعین کی کثرتِ تعداد کے باعث یہ وسیع وعریض شاندار ہال اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ دامانی پر شکوہ سنج نظر آ رہا تھا۔ بانی تنظیم کا یہ مفصل خطاب قریباً دو گھنٹوں پر محیط تھا۔

خطبہ مسنونہ، قرآنی آیات کی تلاوت اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا:

معزز حاضرین اور محترم خواتین! آپ کے علم میں ہے کہ آج ہماری گفتگو کا عنوان اور موضوع نہایت اہم بھی ہے اور کسی قدر طوالت طلب بھی۔ آج کی اس نشست کے لیے جو ہینڈ بل شائع ہوا ہے اس میں مَیں نے ذیلی عنوانات بھی معین کر دیے ہیں تاکہ آپ کے سامنے بھی یہ رہے کہ آج کن کن موضوعات پر کن کن عنوانات کے تحت گفتگو ہونی ہے۔ وہ ذیلی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ختم نبوت کے دو مفہوم
۲) ختم نبوت کے قانونی تقاضے
۳) تکمیل نبوت کے دو مظاہر
۴) ختم نبوت کے خلاف غلام احمد قادیانی کی دلیل اور اس کی تردید
۵) تکمیل رسالت کے دو مظاہر
۶) معراج انسانیت کا مظہر اَتم
۷) تکمیل رسالت کا منطقی تقاضا، جو ابھی تشنۂ تکمیل ہے، اور اس ضمن میں اُمت

Salman Saleem 03067163117

کی ذمہ داری... اور اس اعتبار سے پاکستان اس وقت فیصلہ کن دوراہے پر۔

اور آخری عنوان ہوگا ''پس چہ باید کرد؟'' یعنی ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ عنوانات سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ بات کافی طوالت طلب ہے۔ میں نے ان موضوعات پر علیحدہ علیحدہ گفتگوئیں مختلف مواقع پر کئی بار کی ہیں، اپنے خطاباتِ عام میں بھی ان موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن ایک جامع (compact) انداز میں اس پورے موضوع کو سمو لینے کی آج جو ہمت اور کوشش کر رہا ہوں اس کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر رہا ہوں کہ اس کی ہمت اور توفیق سے میں ان تمام موضوعات کو آج ایک حیاتیاتی وحدت (Organic whole) میں سمو کر آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اور یہ اسی طریقے سے ممکن ہوگا کہ نہ تو بہت زیادہ تفاصیل میں جایا جائے اور نہ ہی خطابت کا انداز اختیار کیا جائے، بلکہ سائنٹفک انداز میں جیسے یہ عنوانات مرتب ہو گئے ہیں اسی انداز میں ان کی وضاحت کی جائے۔

۱) ختم نبوت کے دو مفہوم

اب آیئے سب سے پہلی بات کی طرف۔ ختم نبوت کے یہ دو مفہوم کیا ہیں، اس کو آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان اردو میں بھی ختم کے دو مفہوم ہیں۔ مثلاً ''پیسے ختم ہو گئے'' یعنی پہلے پیسے تھے، اب نہیں رہے۔ کسی شے کا پہلے وجود تھا، اب نہیں ہے۔ یا پنجابی میں کوئی کہے کہ ''دانے مُک گئے'' یعنی پہلے گندم یا کوئی اور جنس تھی، اب نہیں ہے۔ یہ ختم نبوت کا ایک مفہوم ہے کہ وہ نبوت جو حضرت آدمؑ سے چلی آ رہی تھی (اس لیے کہ پہلے نبی حضرت آدمؑ تھے) وہ ختم ہو گئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں۔ لیکن ختم کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے سکول کا طالب علم کہتا ہے: ''میں نے اپنا ہوم ورک ختم کر لیا''۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنا کام مکمل کر لیا، پورا کر لیا۔ ختم کا یہ دوسرا مفہوم ہے جس کی رو سے نبوت اور رسالت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کامل ہوئی۔

ذرا نوٹ کیجیے، پہلا مفہوم اپنی جگہ پر ایک واقعہ ہے، حقیقت ہے، لیکن اس میں فضیلت کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ایک زنجیر چلی آ رہی تھی، آتے آتے ختم ہو گئی، تو اس کی آخری کڑی میں فضیلت کا کیا مفہوم ہوا؟ اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا کوئی پہلو سامنے نہیں آتا۔ بلکہ آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ نبوت رحمت ہے، نبوت تو نوعِ انسانی کی

Salman Saleem 03067163117

ہدایت کا ایک سلسلہ تھا۔ چنانچہ جہاں سے وہ شروع ہوئی اس کی فضیلت زیادہ ہونی چاہیے۔ بنسبت اس کے کہ جہاں آ کر وہ ختم ہو گئی۔ میری بات کو دوبارہ نوٹ کیجیے کہ اپنی جگہ پر یہ واقعہ ہے، لیکن اس اعتبار سے حضور ﷺ کی عظمت کا کوئی انکشاف نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ کی عظمت اور فضیلت کا پہلو تو اس اعتبار سے ہے کہ نبوت آپ پر کامل ہو گئی، رسالت کی آپ پر تکمیل ہو گئی۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں قرآن مجید اور حدیث شریف میں حضور ﷺ کے ضمن میں خاص طور پر تکمیل، اکمال، اِتمام اور تتمیم جیسے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا'' وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (المائدۃ: ۳) ''اور اب (قیامت تک کے لیے) اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کر لیا''۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ○ (الصف) ''اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ○ (التوبہ) ''اللہ کو ہرگز یہ منظور نہیں مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا، چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) ''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اخلاق کے جو بلند مقامات ہیں ان کا اِتمام کر دوں''۔ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکمال، تکمیل، اتمام اور تتمیم، یہ الفاظ کثرت کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت اور آپ کی بعثت کے ضمن میں آ رہے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی اصل فضیلت اسی اعتبار سے ہے اور آپ کی نبوت کی عظمت کا انکشاف اسی پہلو سے ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایسا نہیں ہے کہ ایک فصیل جس کی اونچائی برابر تھی چلی آ رہی تھی اور ایک جگہ آ کر ختم ہو گئی۔ یہ ختم نبوت کا پہلا مفہوم ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ ایک چیز تدریجاً ترقی کرتے کرتے اپنے نقطہ عروج کو پہنچی اور ختم ہو گئی۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ختم نبوت کا جو پہلا مفہوم ہے اس کی قانونی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد اگر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ کذاب، دجال،

Salman Saleem 03067163117

جھوٹا اور کافر ہے، اور جس کسی نے بھی اس کی تصدیق کی، اس کو مان لیا وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج اور مرتد شمار ہوگا۔ یہ اس کی قانونی اہمیت ہے۔ کوئی شخص مسلمان رہا یا نہیں رہا، یہ تو بڑا اہم مسئلہ ہے جس کی حیثیت قانونی ہے۔ اگر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی نبوت کا اقرار کرلیا یا خود اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو وہ مرتد ہے، واجب القتل ہے، اس کی بیوی کا اس سے نکاح ختم ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کے اس مفہوم پر علماء کرام نے بڑی تفصیل سے گفتگوئیں اور تقاریر کیں، خطبات دیئے اور تصانیف تحریر کیں۔ اسی موضوع پر مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ کی کتاب میرے نزدیک حرفِ آخر ہے، جس پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔

ختم نبوت کا دوسرا مفہوم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کی تکمیل ہوئی ہے، چونکہ اس کی کوئی قانونی اہمیت نہیں تھی، لہٰذا اس پر کما حقہ توجہ نہیں ہوئی۔ اس پہلو کو نمایاں کرنا درحقیقت میری آج کی گفتگو کا اصل موضوع ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ علماء کرام کی تقاریر میں ختم نبوت پر گفتگو ہوتی ہے تو قرآن مجید کی یہی ایک آیت پیش کی جاتی ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط (الاحزاب: ۴۰)

''(اے مسلمانو! حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی مُہر ہیں''۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ بولا بیٹا بنالیا تھا تو واضح کیا جارہا ہے کہ منہ بولا بیٹا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ورنہ آپ کسی مرد کے والد نہیں ہیں.... آپ کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں بیٹے دیئے بھی لیکن وہ جلد ہی فوت ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دَور میں بھی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی، وہ بھی بچپن ہی میں فوت ہوگئے، لیکن آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی مہر ہیں۔ یعنی مہر لگ گئی اور یہ راستہ بند ہوگیا۔ یہاں سے اب کسی اور نبوت کے اجراء کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

غور کیجئے کہ یہ آیت کس سیاق وسباق میں آئی ہے۔ عرب میں ہمیشہ سے ایک رواج چلا آرہا تھا اور یہ ان کی تہذیب وثقافت کا جزوِ لازم تھا کہ کسی کا اگر منہ بولا بیٹا ہے اور اس کا انتقال ہوگیا یا اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو منہ بولے بیٹے کی بیوہ یا مطلقہ بیوی سے وہ شخص کبھی نکاح نہیں کرسکتا۔ وہ گویا حرامِ مطلق ہے۔ شریعت میں یہ حکم نہیں ہے۔ شریعت

Salman Saleem 03067163117

میں صُلبی بیٹے کی بیوی حرامِ مطلق ہے۔ وہ بیوہ ہو جائے یا مطلقہ ہو جائے تو باپ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ محرماتِ ابدیہ میں سے ہے، لیکن منہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ اس رسم کو توڑنے کے لیے اگر خود حضور ﷺ اس پر عمل نہ کرتے تو کسی طرح بھی یہ صورت ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب ؓ کا حضور ﷺ کے ساتھ آسمان پر نکاح کر دیا۔ زمین پر نکاح بعد میں ہوا ہے.... یہاں فرمایا کہ اب اگر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہ کام (یعنی اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح) نہ کرتے تو اس غلط رسم کی اصلاح کی کوئی شکل نہ ہوتی، اس لیے کہ آپ ؐ کے بعد تو کوئی نبی آنے والا ہے نہیں۔ چنانچہ ختم نبوت کا جو قانونی مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ متعلقہ آیت ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن میں نے جو دوسری آیات تلاوت کی ہیں، وہ ختم نبوت کے دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اہم ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی فضیلت اور آپ ؐ کی عظمت والا مفہوم کہ آپ ؐ پر رسالت اور نبوت کی تکمیل ہوئی ہے۔ ان آیات پر گفتگو بعد میں ہو گی۔ پہلے میں چاہتا ہوں کہ ختم نبوت کے جو دو مفاہیم میں نے بیان کیے ہیں، ان کے اعتبار سے ہم بعض احادیث نبویہ ﷺ کا مطالعہ کر لیں۔

(۱) جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهُ نَبِيٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ))

''میری امت میں تیس افراد ایسے اٹھیں گے جو کذاب (انتہائی جھوٹے) ہوں گے، ان میں سے ہر شخص اپنے بارے میں یہ گمان کرتا ہو گا کہ وہ نبی ہے، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، اب میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔''

اس حدیث میں اس قانونی مفہوم کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اگرچہ دجال اٹھیں گے، نبوت کے جھوٹے مدعی پیدا ہوں گے، لیکن میں آخری نبی ہوں۔ حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں مدعیانِ نبوت اٹھ گئے تھے، پھر اس دور میں تو ان کی

Salman Saleem 03067163117

رفتار بڑی تیز ہوگئی ہے، آخری زمانہ آرہا ہے، تیس کی تعداد اب پوری ہونی ہے۔ بہاء اللہ ایران میں اٹھا، غلام احمد قادیانی ہندوستان میں اٹھا، ابھی آپ کے ہاں ایک یوسف کذاب سامنے آیا تھا جس کو ایک شخص نے ساہیوال جیل میں گولی ماردی ہے، وہ بھی کہتا تھا کہ میں محمد ہوں، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ.... پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ ملتان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ وہ گرفتار کیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمادیا کہ میری اُمت میں تیس افراد ایسے ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے مگر وہ جھوٹے ہوں گے، حقیقت یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

(۲) بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِيْبٌ مِّنْ ثَلَاثِيْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ)) (متفق علیہ)

”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تیس کے قریب ایسے افراد نہ اٹھا دیے جائیں جو دجال ہوں گے، کذاب ہوں گے، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔“

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی اس مفہوم کی حدیث سنن ابی داؤد میں بایں الفاظ آئی ہے:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ))

”قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تیس دجال ظاہر نہ ہو جائیں، جن میں ہر شخص یہ کہے گا اور سمجھے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔“

یہ تین حدیثیں ختم نبوت کا قانونی مفہوم دوٹوک انداز میں بیان کر رہی ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے۔ اس میں تکمیلِ نبوت کا تصور آرہا ہے، یہ بڑی پیاری

Salman Saleem 03067163117

حدیث ہے۔ یہ حدیث بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور اس کی سند بہت قوی ہے۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے، یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بُنْیَانًا، فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضَعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ مِنْ زَوَایَاهُ، فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَیَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَیَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ؛ قَالَ: فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ))

''یقیناً میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کی، اس نے اس عمارت کو بہت عمدہ اور خوبصورت بنایا، سوائے اس کے کہ اس کے کونوں میں سے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ پھر لوگ آ کر اس عمارت کے چکر لگانے لگے اور (اس کی خوبصورتی اور عظمتِ شان پر) تعجب کا اظہار کرنے لگے اور لوگ کہتے: بھلا یہ اینٹ کیوں نہ لگائی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔''

مسلم کی ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں: ((فَاَنَا مَوْضَعُ اللَّبِنَةِ، جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْاَنْبِیَاءَ))، ''پس اس اینٹ کی جگہ (مکمل کرنے والا) میں ہوں، میں آیا تو میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔''

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ((خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ)) ''میرے ذریعے سے اس عمارت (قصرِ رسالت) کی تکمیل ہو گئی اور مجھ پر رسولوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔''

اب یہاں محل اور محل میں ایک کمی اور اس کمی کا آپ ﷺ کے ذریعے پورا ہو جانا، یہ ہے تکمیل نبوت و رسالت کا معاملہ۔

## ۲) ختم نبوت کے قانونی تقاضے

ختم نبوت کا یہ پہلو کہ جس شخص نے بھی حضور ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے یا

Salman Saleem 03067163117

کرے گا، وہ کذاب، دجال، جھوٹا، کافر، مرتد اور واجب القتل ہے، یہ اس کا قانونی تقاضا ہے۔ چنانچہ عالمِ اسلام میں اس سے پہلے جب بھی کسی نے ایسا دعویٰ کیا تو جب تک مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، ایسے افراد کو قتل کر دیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے فوراً بعد مُسیلمہ کذاب اور جو دوسرے بڑے بڑے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ان کے خلاف جہاد کیا گیا اور انہیں تہ تیغ کیا گیا۔ ایران میں بہاء اللہ اٹھا تو وہاں چونکہ مسلمانوں کی حکومت تھی لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ اب بھی کوئی بہائی ایران میں نہیں رہ سکتا، سب وہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ کوئی وہاں آئے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے وقت ہندوستان میں انگریز کی حکومت تھی، لہٰذا ہر شخص کو کھلی چھوٹ تھی۔ اکبر الٰہ آبادیؒ نے بڑے خوبصورت الفاظ میں وہ نقشہ کھینچا ہے:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں، وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسے آزادیاں تھیں میتر
''انا الحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

اگر اسلامی حکومت ہوتی یا مسلمان حکومت ہی ہوتی تو مرزا کو یہ جرأت نہ ہوتی۔ مسلمان حکومتوں کے دوران جس نے ''انا الحق'' کہا (منصور) وہ سولی چڑھا دیا گیا اور جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا وہ قتل کر دیے گئے، لیکن یہاں انگریز کی حکومت تھی، جس میں کھلی چھوٹ تھی کہ چاہو تو خدائی کا دعویٰ کر دو، نبوت کا دعویٰ کر دو، رسالت کا دعویٰ کر دو، کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی پکڑنے والا نہیں، کسی دار و گیر کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ اسی زمانے میں غلام احمد قادیانی نے ایک دعوتی خط امیر کابُل کو لکھا کہ وہ اس کی نبوت پر ایمان لائیں۔ جب وہ خط وہاں پہنچا تو امیر کابل نے اسی خط پر دو الفاظ لکھ کر خط واپس کر دیا: ''ایں جا بیا!'' یعنی ذرا یہاں آؤ! یہاں آ کر تم نبوت کا دعویٰ کرو تو پتا چل جائے کہ کس بھاؤ بکتی ہے۔ تم انگریز کی چھتری تلے بیٹھے ہوئے دعوے کر رہے ہو اور انگریز تمہاری پشت پناہی کر رہا ہے۔ تم نے جہاد کو ختم کر دیا، حرمتِ قتال کا فتویٰ دے دیا۔ انگریز کو اور کیا چاہیے؟ Gladstone جبکہ برطانیہ کا وزیر اعظم تھا، اس نے اپنی پارلیمنٹ میں قرآن کو لہرا کر کہا تھا کہ جب تک یہ

Salman Saleem 03067163117

کتاب موجود ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا، یہ تو جہاد اور قتال کی بات کرتی ہے۔تو انگریز کو اور کیا چاہیے تھا کہ اگر کوئی اس قتال کو منسوخ کر دے اور مسلمانوں میں سے جذبہ جہاد وقتال فی سبیل اللہ کو نکال دے تو اس سے بڑی اور کیا خدمت ہوگی! امیر کابل کے دو لفظی جواب میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر تمہیں یہ دعوت دینی ہے تو ذرا یہاں آ کر مجھے دعوت دو تا کہ تمہارے چودہ طبق روشن ہوں اور تمہیں معلوم ہو کہ اس دعویٰ کا مطلب کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا کہ اس ملک میں ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار پانے کا فیصلہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت ہی مبارک فیصلہ تھا۔ اس کے لیے جو تحریک اٹھی وہ بھی بہت ہی عمدہ تھی، بہت پُر امن تھی، بہت منظم تھی۔ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اس کے قائد تھے۔ کوئی سیاسی لیڈر اس میں نمایاں نہیں تھا، خالص دینی تحریک تھی۔ پھر اُس وقت ہمارے ہاں حکمران ذوالفقار علی بھٹو تھا جو خالص سیکولر ذہن کا آدمی تھا، اور قادیانیوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اس کی حمایت کی تھی۔ قادیانی سمجھتے تھے کہ وہ تو ہمارا اپنا آدمی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھوں بہترین طریقے سے، جس پر اعتراض کیا ہی نہیں جا سکتا، پارلیمنٹ کے ذریعے سے فیصلہ کرایا۔ کوئی آرڈی نینس، کوئی حکم یا فرمان جاری نہیں ہوا تھا۔ پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور قادیانیوں اور لاہوریوں کو اپنا موقف کھل کر پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ ان دونوں گروہوں کے سرکردہ لوگوں نے اس کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر بیانات دیے اور وضاحت سے اپنا موقف بیان کیا۔ اس وقت ان کا خلیفہ مرزا طاہر احمد کا غالباً بڑا بھائی مرزا ناصر احمد تھا، اس نے کہا کہ غلام احمد قادیانی کو ہم ڈنکے کی چوٹ پر نبی مانتے ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ یہ غیر مسلم ہیں۔

یہ ایک صحیح فیصلہ تھا، لیکن یہ فیصلہ ادھورا تھا۔ اس لیے کہ اس فیصلے سے قادیانیت کے فتنے کو کوئی گزند نہیں پہنچا ہے۔ غیر مسلم قرار دیے جانے کے فیصلے کے باوجود وہ فتنہ جوں کا توں پنپ رہا ہے۔ ویسے تو عالمی سطح پر انہیں بڑی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے، پوری مغربی دنیا ان کی سرپرستی کر رہی ہے، لیکن اندرونِ ملک بھی اس فتنے کا قلع قمع اگر ہوسکتا تھا تو صرف اس وقت جبکہ اس فیصلے کا جو قانونی اور منطقی تقاضا ہے، وہ بھی پورا کیا جاتا، اور وہ یہ کہ مرتد کی

Salman Saleem 03067163117

سزا قتل نافذ کی جاتی۔ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدعیانِ نبوت سے قتال کیا گیا، اور اسلامی تاریخ میں جتنے بھی لوگوں نے نبوت کے دعوے کیے انہیں ہمیشہ قتل کیا گیا۔ لہٰذا مرتدین کی سزا قتل جب تک نافذ نہیں ہوگی، اس فتنے کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، بلکہ وہ تو اس فیصلے کے بعد اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں اور دنیا کے سامنے مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آپ جتنے چاہیں آرڈی ننس نافذ کرلیں لیکن وہ سارے اسلامی شعائر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مسجد کی شکل نہیں بنا سکتے، ماڈل ٹاؤن میں ایک بڑی کوٹھی کے اندر ان کا جمعہ ہوتا ہے، ان کے عید کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ وہ سارے شعائر اسلامی کو استعمال کر رہے ہیں اور الٹا مظلومیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، جیسے دنیا میں یہودیوں نے Holocaust کی مظلومیت کا لبادہ اپنے اوپر اوڑھا ہوا ہے کہ ہم جو چاہیں نوعِ انسانی پر ظلم کرلیں یہ ہمارا حق ہے، اس لیے کہ ہم نے Holocaust کی صورت میں بہت بڑا ظلم سہا تھا۔ جرمنوں نے ہمارے ساٹھ لاکھ آدمی ختم کر دیئے تھے، تو ہم اگر آٹھ، دس لاکھ فلسطینی اور دوسرے مسلمانوں کو قتل کر دیں گے تو کون سی بڑی بات ہے؟ اسی طرح قادیانیوں نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس روز بھی یہ فیصلہ ہوا، ساتھ ہی واضح کر دیا جاتا کہ آج کی اس تاریخ سے پہلے پہلے جو قادیانی ہیں وہ تو اقلیت قرار پائیں گے، لیکن اس فیصلے کے نفاذ کے بعد جو شخص بھی قادیانیت اختیار کرے گا اس پر قتل مرتد کی حد جاری کی جائے گی۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس فتنے کا استیصال تو دور کی بات ہے، اس کو کوئی گزند بھی نہیں پہنچ سکتا۔

### ۳) تکمیل نبوت کے دو مظاہر

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کامل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رسالت کامل ہوئی، ان دونوں باتوں کو اب میں علیحدہ علیحدہ بیان کر رہا ہوں، ذرا اس کو سمجھ لیجیے۔ دراصل نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ ہر رسول لازماً نبی بھی ہے، مگر ایسا نہیں کہ ہر نبی لازماً رسول بھی ہو۔ نبی اور رسول میں فرق کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ اس فرق کی بنیاد کیا ہے، یہ میرا اس وقت کا موضوع نہیں ہے، لیکن جو شخص نبی بھی ہے اور رسول بھی اس کی

Salman Saleem 03067163117

شخصیت میں جو دونوں چیزیں جمع ہو گئیں ان کی باہمی نسبت کیا ہے؟ دیکھئے نبوت اللہ سے لینے والا پہلو ہے۔ یعنی اللہ سے receive کرنا، وحی حاصل کرنا، وحی کو وصول کرنا، یہ نبوت ہے۔ جبکہ رسالت ہے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا، عوام تک ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا۔ تو ایک پہلو نبوت ہے، دوسرا پہلو رسالت ہے۔ نبوت وہ کھڑکی ہے جہاں سے وحی آ رہی ہے اور اس کو اللہ کا نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وصول کر رہا ہے۔ اب اس کا کام بحیثیت رسول اس وحی کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ ''اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے آپ پر آپ کے رب کی طرف سے''۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ:٦٧)
''اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔''

نبوت کی تکمیل کے دو مظاہر ہیں اور اس کے لیے میرے نزدیک قرآن مجید کی جو متعلقہ (relevent) آیت ہے وہ الفاظ قرآن میں تین مرتبہ آئے ہیں، سورۃ التوبۃ میں، سورۃ الفتح میں اور سورۃ الصف میں: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر، تاکہ اسے کل جنسِ دین پر غالب کر دے''۔ یہاں قرآن حکیم کے لیے ''الہدیٰ'' کا لفظ آیا ہے، یعنی The Total Guidance, The Final Guidance. اور ''الہدیٰ'' اور ''دین الحق'' کے درمیان حرفِ عطف ''وَ'' آیا ہے۔ یعنی یہ دو چیزیں الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا۔ کس لیے بھیجا؟ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ تاکہ وہ غالب کر دے اسے تمام ادیان پر، تمام نظاموں پر، پورے کے پورے جنس دین پر۔ اس کے بعد دو جگہ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ''خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو''۔ اور ایک جگہ آیا: وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ''اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ (یا بطور مددگار)''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دو چیزیں دی گئیں، الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق، نوٹ کیجیے کہ یہ دونوں چیزیں ابتدا سے چلی آ رہی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا تو ساتھ ہی فرما دیا گیا: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرۃ:٣٨) ''پھر جو بھی تمہارے

Salman Saleem 03067163117

Salman Saleem 03067163117

پاس میری جانب سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہوگا''۔ تو ہدایت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ شروع ہو گیا، لیکن جیسے جیسے بحیثیت مجموعی نوعِ انسانی کے شعور نے ترقی کی، ذہنی اور فکری سطح بلند ہوئی ویسے ہی اس ہدایت کے اندر بھی ارتقا ہوتا چلا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی بچہ اگر پرائمری کا طالب علم ہے اور آپ اس کے لیے پی ایچ ڈی ٹیچر رکھ دیجئے تو کیا وہ اسے پی ایچ ڈی کی تعلیم دے گا؟ یا ایم اے کا نصاب پڑھائے گا؟ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ ابھی عہد طفولیت میں ہے اور اس کے لیے ایک خاص حد سے آگے بات کا سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تو نوعِ انسانی جب تک عہدِ طفولیت میں تھی ہدایت بلکہ ہدایات آتی رہیں کہ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ نوٹ کیجئے، میں یہاں ''ہدایت'' کی جگہ ''ہدایات'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ تورات ''احکامِ عشرہ'' (Ten Commandments) پر مشتمل تھی کہ یہ dos ہیں اور یہ donts ہیں، یہ تمہیں کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ جب تک نوعِ انسانی شعور کے اعتبار سے، اپنے فلسفیانہ فکر کے اعتبار سے، اپنے ذہن اور شعور کی ارتقائی منزل کے اعتبار سے پختہ کار (mature) نہیں ہوگئی تو اس عبوری دَور (INTERIM PERIOD) کے لیے ہدایات آتی رہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، لیکن جب نوعِ انسانی شعور کے اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گئی تو اسے ہدایات کے بجائے ہدایت کاملہ عطا کر دی گئی۔

تاریخ اور فلسفہ کے ماہرین خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ نوعِ انسانی کا فلسفیانہ شعور (Philosophical Consciousness) بارہ سو سال میں ترقی کی منازل طے کرتا ہوا اپنے بلوغ کی منزل کو پہنچا ہے۔ یہ دور ۶۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۶۰۰ بعد مسیح پر ختم ہو گیا۔ سارے کے سارے فلسفے انہی بارہ سو سالوں میں پیدا ہوئے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو بھی اسی دَور میں پیدا ہوئے اور گوتم بدھ، مہاویر، کنفیوشس اور تاؤ نے بھی اسی دور میں جنم لیا۔ اس بارہ سو سالہ دَور میں انسان کا ذہنی، خاص طور پر فلسفیانہ شعور اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے پختگی (maturity) کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ یادش بخیر پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ کا ذکر کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے، جب میں کرشن نگر میں پریکٹس کرتا تھا وہ شام کو میرے پاس آکر

بیٹھ جایا کرتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ پھلجھڑیاں ہوتی تھیں جو اُن کے منہ سے نکلتی تھیں، جو گویا فلسفیانہ اور تاریخی معلومات اور مذہبی مسائل کا ایک خزانہ تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا عجیب بات ہے ۶۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ بعد مسیح تک جتنے مذاہب اور جتنے فلسفے پیدا ہونے تھے ہو چکے، اس کے بعد کوئی نیا مذہب یا نیا فلسفہ دنیا میں نہیں آیا۔ یہ تو پرانی شراب ہے جو نئے لیبلوں کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ اس پر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا اور میں نے کہا: چشتی صاحب! اس کا تو پھر براہِ راست تعلق ختم نبوت کے ساتھ ہے! کہنے لگے: کیوں؟ میں نے کہا: جب انسان جو کچھ از خود سوچ سکتا تھا سوچ چکا تو پھر اسے ہدایت کاملہ سے نواز دیا گیا، اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ۶۰۰ عیسوی تک انسان کا فلسفیانہ شعور اپنی پختگی اور بلوغ کو پہنچ گیا تھا تو ۶۱۰ء میں حضرت محمد ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾ (العلق) اور شاید سیرت النبی ﷺ کا یہ پہلو بہت کم لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

اس ''اقرأ'' کی وحی کے آنے سے متصلاً قبل (مدت کا ہمارے پاس تعین نہیں ہے کہ کتنے مہینے یا کتنا لمبا عرصہ لگا ہے) حضور ﷺ غارِ حرا میں جو مراقبہ کیا کرتے تھے وہ کس چیز پر مشتمل ہوتا تھا؟ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کھانے پینے کا کچھ سامان کر دیتیں اور آپؐ غارِ حرا میں چلے جاتے اور وہاں کئی کئی روز دن رات قیام فرماتے۔ اس دوران آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ حدیث میں الفاظ آتے ہیں: یَتَحَنَّثُ فِیْهِ ''وہاں آپ عبادت کیا کرتے تھے''۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی عبادت؟ آپؐ اگر یہودیوں کے ہاں پیدا ہوتے تو یہودیوں والی عبادت کرتے اور عیسائیوں کے ہاں پیدا ہوتے تو عیسائیوں والی عبادت کرتے، لیکن آپ ﷺ تو عرب کے اندر مکہ میں مشرکانہ ماحول میں پیدا ہوئے اور ظاہر بات ہے کہ مشرکین والی عبادت کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ آپ ﷺ سلیم الفطرت انسان تھے اور آپؐ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ تو آپ ﷺ کون سی عبادت کرتے تھے؟ شارحینِ حدیث نے اس کا حل نکالا ہے: کان صفة تعبّدہ فی غار حراء التفکر والاعتبار۔ یعنی غارِ حرا میں حضور ﷺ کی جو عبادت تھی وہ غور و

فکراور سوچ بچار پر مشتمل تھی۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری انسانی فلسفیانہ سوچ کے مراحل طے کرائے ہیں اور اس کے بعد وحی نبوت کا آغاز ہوا ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ یہ سارا مرحلہ اسی لیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سوچ اور غور وفکر سے، اپنی سلامتیٔ طبع، اپنی سلامتیٔ فطرت اور عقل سلیم کی رہنمائی میں غور وفکر کریں، تدبر کریں اور اس کے نتیجے میں پھر آپؐ اس مقام پر پہنچے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (الضحیٰ:۷) یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے پایا آپ کو کہ آپ ہدایت کی تلاش میں سرگرداں ہیں، تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایتِ کاملہ سے سرفراز فرمادیا۔

اب یہاں ایک اہم نکتہ نوٹ کیجیے۔ یہ ایک بہت اہم حقیقت ہے جو نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور نگاہوں کے سامنے آجائے تو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کیا تورات اللہ کی کتاب نہیں تھی؟ اس میں تحریف کیوں ہوگئی؟ اگر اللہ نے ضمانت لی ہوتی کہ اس میں تحریف نہیں ہوسکتی تو کیا تحریف ہوسکتی تھی؟ کیا انجیل اللہ کی کتاب نہیں تھی؟ یقیناً تھی۔ اس میں تحریف کیوں ہوگئی؟ اس لیے کہ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا اور اگر اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت کا ذمہ نہ لیتا تو کیا ہم اسے تحریف کے بغیر چھوڑ دیتے؟ علامہ اقبال نے کہا تھا:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

قرآن کے ترجموں میں بھی تحریفیں ہوئی ہیں اور تفسیروں میں بھی ہوئی ہیں، ہاں ایک متنِ قرآن ہے جس میں تحریف نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر:۹) ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ'' کے الفاظ کا مصداق تورات بھی ٹھہرتی ہے، انجیل بھی اور زبور بھی۔ اللہ ہی نے سابقہ آسمانی کتب بھی نازل کی تھیں۔ خاص طور پر سورۃ المائدۃ کے ساتویں رکوع کے الفاظ ملاحظہ ہوں: اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ''ہم نے اتاری تھی تورات، اس میں ہدایت بھی تھی، نور بھی تھا''۔ پھر انجیل کے بارے میں بھی فرمایا: هُدًى

Salman Saleem 03067163117

وَّنُوْرٌ ''اس میں ہدایت بھی تھی، نور بھی تھا'' ۔غور طلب بات یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اللہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ لے لیا؟ بلکہ میں ذرا لطیف انداز میں اس بات کو آپ کے ذہن کی گہرائیوں تک لے جانے کے لیے عرض کروں گا۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ سے شکوہ کریں کہ اے اللہ! ہم بھی تیری کتابیں تھیں، قرآن بھی تیری کتاب تھی، تو ہمارے ساتھ یہ سوتیلی بیٹیوں والا سلوک کیوں ہوا کہ آپ نے قرآن کو تو تحفظ دیا، ہمیں نہیں دیا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجئے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، سابقہ کتب سماویہ کے نزول کے وقت ابھی ہدایت اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی، ابھی اسے اپنے نقطہ عروج اور نقطہ کمال تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ اس درمیانی عرصہ کے لیے، عبوری دَور کے لیے جو ہدایات آ رہی تھیں ان کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کی چنداں حاجت نہ تھی۔ جب وہ کامل اور مکمل ہدایت آ گئی اور ہدایت کی تکمیل ہو گئی تو اب یہ ہدایت "ھُدًی" نہیں رہی "اَلْھُدٰی" (The Guidance) ہو گئی۔ اب اس کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا۔

## ختم نبوت کے خلاف غلام احمد قادیانی کی دلیل اور اس کی تردید

ایک قادیانی سے جب میں نے اس معاملے پر بحث کی تو سورۃ البقرۃ میں وارد شدہ الفاظ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ط کے مصداق وہ میری دلیل کے آگے بالکل مبہوت ہو کر رہ گیا اور اس کے لیے دائیں بائیں بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ دیکھئے غلام احمد قادیانی نے اپنے فتنے کا آغاز کہاں سے کیا تھا۔ یہ سمجھ لیجئے، پہلے وہ ایک بہت اچھا مناظر تھا۔ اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کیے، جن میں فتح حاصل کی اور نتیجتاً مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا، محبوب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک شوشہ چھوڑا کہ نبوت اور وحی تو رحمت ہیں، رحمت بند کیسے ہو سکتی ہے؟ وحی تو انسانوں کی ہدایت کے لیے ہے، انسان ختم نہیں ہوئے تو وحی کیسے ختم ہو گئی! دیکھئے بظاہر یہاں بات جی کو لگتی ہے۔ یہیں سے آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا کہ بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس فتنے کا شکار کیونکر ہو گئے۔ دنیا میں ایک ہی مسلمان نام کا سائنس دان ٹاپ پر آیا ہے، اور وہ قادیانی ہے۔ ایک ہی مسلمانوں کا نام رکھنے والا انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس ہیگ کا جج بنا

Salman Saleem 03067163117

ہے، وہ بھی قادیانی ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹرز اور انجینئرز قادیانی ہیں... آخر کیوں؟ یہ بات ایسی تھی جو بظاہر دل کو اپیل کرتی ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی کا راستہ کھولا گیا تھا۔ ابھی انسان ختم نہیں ہوئے، وحی کا دروازہ کیسے بند ہو جائے گا؟ پہلے اجراءِ وحی کا شوشہ چھوڑا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اگر وحی جاری ہے تو نبوت بھی جاری ہے۔ لہٰذا پھر اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے عوام الناس کی نفسیات کو متاثر کرنے کے لیے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ دیکھو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ فوت بھی ہو گئے اور زیر زمین دفن ہیں جبکہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے اور وہ آسمان پر ہیں! اس سے تو گویا ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم حضرت محمد ﷺ سے افضل ہو گئے! حالانکہ افضلیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اصحابِ کہف اگر ۳۰۰ برس تک سوتے رہے تو اس میں کون سی افضیلت کی بات ہے! اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ۱۰۰ برس تک مردہ رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا تو اس میں افضیلت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کی قدرت ہے، اللہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن مرزا قادیانی نے عام آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے شوشے چھوڑے اور کہا کہ نہیں نہیں، غلط ہے، یہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں، رفعِ مسیح قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہے، حدیثوں کے اندر ہے، اور حدیثوں کے بارے میں ہم اطمینان نہیں کر سکتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سولی نہیں چڑھائے گئے۔ مرزا کے بقول وہ سولی چڑھائے گئے، لیکن فوت نہیں ہوئے، البتہ زخمی ہونے کے بعد صلیب سے اتار لیے گئے تھے، پھر ان کا علاج معالجہ ہوا، پھر وہ علاقہ چھوڑ کر کشمیر میں آ گئے، یہاں آ کر ان کا انتقال ہو گیا اور یہاں دفن ہوئے، یہاں کشمیر میں ان کی قبر بھی موجود ہے۔ یہ دو ایشو ہیں جو اس شخص نے خصوصی طور پر اٹھائے اور اس طرح عوام الناس کو متاثر کیا۔

ابھی میں نے جس قادیانی کا ذکر کیا اس سے میں نے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ: کیا تم یہ مانتے ہو کہ اللہ کی ہدایت قرآن میں کامل ہو گئی؟ اس نے کہا: ہاں، ہم مانتے ہیں کہ ہدایت کامل ہو گئی۔ میں نے کہا: کیا تم یہ مانتے ہو کہ قرآن محفوظ ہے، اس میں تحریف نہیں ہوئی؟ اس نے کہا: ہاں، ہم مانتے ہیں کہ قرآن محفوظ ہے، اس میں تحریف نہیں ہوئی۔ پھر میں نے پوچھا: مجھے منطقی وجہ بتاؤ کہ پھر اس وحی کی کھڑکی کو کھلے رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ وہاں سے جو آنا تھا وہ

Salman Saleem 03067163117

مکمل ہوگیا، یعنی قرآن۔ ہاں، قرآن میں اگر تحریف ہوجاتی، اس کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا گیا ہوتا تو کسی نبی کی ضرورت تھی کہ جو آکر اس کی تصحیح کرتا کہ یہ بات یوں نہیں، یوں تھی۔ منطقی اعتبار سے ایک جواز پیدا ہوتا ہے وحی اور نبوت کے جاری رہنے کا، بشرطیکہ ان دو باتوں میں سے کسی ایک کو مانا جائے.... یا تو یہ کہو کہ قرآن میں ہدایت مکمل نہیں ہوئی اور یا کہو کہ ہو تو گئی تھی لیکن قرآن گم ہوگیا یا قرآن کے اندر تحریف ہوگئی، یہ وہ اصل قرآن نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں نہیں مانتے تو مجھے بتاؤ کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس کھڑکی کو کھلے رکھنے کا کہاں کوئی جواز پیدا ہوتا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو بتایا، اس پر وہ قادیانی بالکل مبہوت ہوگیا کہ واقعتاً آپ کی دلیل بہت مضبوط ہے۔ تو تکمیل نبوت کا پہلا مظہر یہ ہے کہ وہ ہدایت، فلسفیانہ ہدایت، ایمان کی ہدایت، فکری اور نظری ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دینی تھی، وہ قرآن میں مکمل ہوگئی۔

تکمیل نبوت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ دین حق کی بھی تکمیل ہوئی ہے حضرت محمد ﷺ پر۔ جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں آیا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (آیت ۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا''۔ لیکن تکمیل دین کا پس منظر بھی سمجھ لیجیے۔ جیسے انسان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل آئے ہیں، فلسفیانہ شعور میں ترقی ہوئی ہے اور ہوتے ہوتے وہ اپنے بلوغ اور پختگی کو پہنچا ہے، ایسے ہی انسان کے اندر تمدنی طور پر ارتقاء ہوا ہے۔ ایک دَور وہ تھا جب ہمارے آباء و اَجداد غاروں میں رہتے تھے۔ کہیں کوئی سٹریٹ لائٹ کا سوال نہیں، کہیں کوئی سڑکوں کو صاف کرنے کا سوال نہیں، کہیں کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی کا سوال نہیں۔ انفرادیت ہی انفرادیت تھی۔ میں اپنی غار کا مالک ہوں، جو چاہوں کروں، میرے اوپر کوئی قانون نہیں، کوئی قدغن نہیں۔ یہ نظام تھا۔ اجتماعیت تھی ہی نہیں، انفرادیت ہی انفرادیت تھی۔ پھر قبائلی نظام قائم ہوا کہ قبیلے کا ایک سردار ہے، اس کا حکم ماننا ہوگا۔ تم فلاں قبیلے سے ہو، اس قبیلے کی یہ روایات ہیں، تمہیں ان پر عمل کرنا ہوگا۔ اب جیسے جیسے اجتماعیت آنی شروع ہوئی انفرادیت کے اوپر قدغنیں لگنی شروع ہوئیں۔ یہ نہیں کہ جو چاہو کرو۔ تمہارا تعلق اس

Salman Saleem 03067163117

قبیلے کے ساتھ ہے، اس کی یہ رسم ہے، یہ ریت ہے، اس کا یہ رواج ہے، تمہیں اس کو پورا کرنا ہوگا، اور تمہارا جو شیخِ قبیلہ ہے، سردار ہے، اس کا حکم ماننا ہوگا۔

آگے چلیے! شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ دو، تین، چار قبیلے ایک شہر میں آکر آباد ہو گئے۔ ہر قبیلہ تو اپنی جگہ پر ایک اجتماعی یونٹ ہے، اس کا سردار ہے، اس کا کہنا سب مانتے ہیں، لیکن اب ان قبیلوں کے آپس کے معاملات کیسے طے ہوں گے؟ یہاں سے دستور سازی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ کچھ اصول طے کیے جاتے تھے کہ ہمارے بین القبائلی معاملات ان اصولوں کے تحت ہوں گے۔ اب بھی یہاں ایک مثال دیتا چلوں، حضور ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ ایک قبیلے کا شہر تھا جہاں صرف قریش رہتے تھے، اور کوئی وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ یہاں یا قرشی رہے گا یا قرشی کا غلام رہے گا، وہ کوئی بھی ہو، یا قرشی کا حلیف رہے گا، یعنی باہر سے کوئی آئے گا تو کسی مکہ والے کا حلیف بن کر ٹھہر سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ لیکن مدینہ منورہ سماجی ارتقاء کے ایک بلند تر درجے پر تھا۔ وہاں پانچ قبیلے آباد تھے۔ دو تو اصل عرب قبیلے (Sons of the soil) تھے: اَوس اور خزرج۔ تین یہودی قبائل تھے جو وہاں آکر آباد ہو گئے تھے: بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر۔ ان پانچوں قبیلوں کے آپس میں معاہدات تھے۔ اَوس کا قبیلہ چھوٹا تھا، خزرج کا بڑا تھا۔ (حضور ﷺ نے بھی جب ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے تو نو خزرج میں سے تھے اور تین اوس میں سے) اَوس اور خزرج کے درمیان یہ طے تھا کہ اگر کوئی خزرجی کسی اَوسی کو قتل کر دے گا تو دیت ایک تہائی ہوگی، جبکہ اگر کوئی اَوسی کسی خزرجی کو قتل کر دے گا تو تین گنا دیت دینا ہوگی۔ یقیناً اَوسی نوجوان کا خون کھولتا ہوگا کہ کیا میرے خون اور میری جان کی قیمت اس خزرجی نوجوان کے مقابلے میں ایک بٹا تین ہے! لیکن اگر مدینے میں رہنا ہے تو اس اصول کو ماننا پڑے گا، یہ اصول یہاں طے ہو چکا ہے، اب تمہیں اس کی پابندی کرنی ہے۔

اس سے اگلا قدم کیا تھا! جیسے آپ افغانوں کو دیکھتے ہیں کہ افغان کا چہرہ تھوڑا اور پگڑ بہت بڑا ہوتا ہے، ایسے ہی جزیرہ نمائے عرب کے اوپر جو بہت بڑا پگڑ (Turban) ہے یہ شامِ عرب اور عراقِ عرب ہے۔ یہ بھی عرب ممالک ہیں۔ اس جزیرہ نما کے اوپر دو عظیم مملکتیں قائم تھیں، قیصر کی سلطنتِ روما اور کسریٰ کی سلطنتِ ایران۔ یہ تمدن کی آخری سٹیج تھی

Salman Saleem 03067163117

جبکہ حکومتیں بن گئیں، بادشاہتیں قائم ہو گئیں، محلات بن گئے، standing armies وجود میں آ گئیں۔ لاکھوں کی تعداد میں فوجیں ہیں، ٹیکس لگ رہے ہیں، دہقان محنت کر رہا ہے اور اس سے ٹیکس لیا جا رہا ہے، جاگیردار اپنا حصہ رکھ کر باقی بادشاہ کو پہنچاتا ہے۔ کرگے پر بیٹھا ہوا کوئی شخص کپڑا بن رہا ہے تو اس سے بھی ٹیکس لیا جا رہا ہے۔ عوام کو ظلم و ستم کی چکی میں پیسا جا رہا ہے اور بادشاہ عیش کر رہے ہیں، اونچے اونچے محلات بنا رہے ہیں۔ یہ زمانہ تھا جبکہ انسانیت پر ایسی پابندیاں لگیں کہ انسان مجبور و مقہور ہو کر رہ گیا۔ اس دَور میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔ اس وقت تمدنی ارتقاء اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ اجتماعیت کا دَور دورہ تھا، انفرادیت پس گئی تھی، اس کی آزادیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اب بادشاہ تھا اور بادشاہ کا نظام تھا۔ عوام میں کہیں ذرا سی بھی بغاوت ہوتی تو سلطنتِ روما کے غرقِ آہن فوجی اسے بری طرح کچل دیتے تھے۔ اسی طرح ایرانی فوجی کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتے تھے، اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نوعِ انسانی کے لیے دینِ حق کی صورت میں ایک مکمل نظامِ حیات عطا کر دیا گیا کہ سماجی سطح پر یہ ہدایات ہیں، معاشی سطح پر یہ ہدایات ہیں اور سیاسی سطح پر یہ ہدایات ہیں۔ الغرض ایک مکمل Politico-Socio-Economic System کی حیثیت سے دین کو کامل کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کر دیا گیا۔ حالانکہ دین ہمیشہ سے ایک تھا، موسیٰ علیہ السلام کا دین بھی یہی تھا، عیسیٰ علیہ السلام کا دین بھی یہی تھا، ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی تھا، نوح علیہ السلام کا بھی یہی تھا۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۱۳) میں فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ------

سب کا دین ایک تھا، لیکن ابھی دین مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی اجتماعیت محدود تھی، ابھی انفرادیت کا بول بالا تھا۔ ابھی ایک نظام کا تصور نہیں تھا۔ ابھی کوئی پولیٹیکل سسٹم وجود میں نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ standing armies کے دَور نہیں آئے تھے۔ وہ دَور جب آ گیا تو عدل و قسط پر مبنی ایک "Politico-Socio- Economic System" اسلام کی شکل میں، دینِ حق کی تکمیل کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ

Salman Saleem 03067163117

لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔

یہ تکمیل نبوت کے دو مظاہر ہیں۔ ایک یہ کہ ہدایت "ھُدًی" سے بڑھ کر "الھُدٰی" بن گئی۔ یعنی قرآن کی صورت میں کامل اور مکمل ہدایت عطا کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ دین کامل ہو گیا۔ یہ دونوں چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے عروج اور نقطہ کمال کو پہنچ گئیں۔ چنانچہ اللہ سے لینے والا حصہ جو ہے، یعنی وحی اور دین، دونوں کی تکمیل ہو گئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔

## تکمیلِ رسالت کے دو مظاہر

نوٹ کیجئے! میں نے کہا تھا کہ نبوت اللہ سے لینے والا حصہ ہے اور رسالت دینے والا حصہ ہے۔ اس دینے والے حصے کے بارے میں فرمایا: لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ تا کہ اسے غالب کر دے کُل کے کُل دین پر، پورے نظامِ زندگی پر۔ اللہ کا دین ایک مکمل "Politico- Socio- Economic System" کی حیثیت سے قائم ہو، یہ رسالت کی تکمیل ہے۔ رسالت کا ایک درجہ تبلیغ ہے۔ بہت سے نبی ہیں کہ تبلیغ کرتے ہوئے ان کی پوری زندگی گزر گئی، کہیں کوئی نظام قائم ہوا ہی نہیں۔ نظام تو صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے قائم ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا۔ تاہم تبلیغ کا حق انہوں نے ادا کر دیا، بات کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ایک ہے اتمامِ حجت۔ دین حق کے ضمن میں اتمامِ حجت یہ ہے کہ دین کو قائم کر کے اس کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کرنا۔ ورنہ کتاب میں بہت اچھی باتیں لکھی جا سکتی ہیں کہ یہ یوں ہونا چاہیے، یہ ایسا ہونا چاہیے، اس کا یہ اصول ہونا چاہیے۔ آپ اپنے دماغ سے کام لیجئے، اعلیٰ سے اعلیٰ باتیں نکلیں گی، لیکن جب تک آپ اسے قائم کر کے اس کا نمونہ نہ دکھائیں، یہ ثابت نہ کریں کہ یہ قابل عمل ہے، یہ نافذ کیا جا سکتا ہے، اس وقت تک وہ حجت اپنے درجہ اتمام کو نہیں پہنچ سکتی۔

افلاطون نے ایک کتاب لکھی تھی: "The Republic"۔ اس میں اس نے نقشہ کھینچا کہ نظام ایسا ہونا چاہیے، حکومت ایسی ہونی چاہیے، فلاں معاملات ایسے ہونے چاہئیں۔ اور وہ کتاب، ایک کتاب کی حیثیت سے، اس قدر وقیع ہے کہ ۲۳۰۰ برس سے دنیا میں موجود ہے۔ ورنہ لاکھوں کتابیں چھپتی ہیں، ختم ہو جاتی ہیں، ان کا نام ونشان تک نہیں رہتا۔ کتاب تو

Salman Saleem 03067163117

وہی باقی رہتی ہے جس کے اندر کوئی وزن ہو، جس میں کوئی ٹھوس مواد ہو۔ اور "Rebublic" آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ لیکن اس کتاب میں افلاطون نے جو نظام پیش کیا تھا وہ کہیں ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہوا۔ لہٰذا وہ حجت نہیں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یوٹوپیا ہے، ایک خیالی جنت کا نقشہ کسی نے کھینچ دیا ہے، لیکن یہ ہونے والی بات نہیں ہے بابا! کیا کہہ رہے ہو؟

اب میں بڑی سادہ سی مثال دے رہا ہوں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ((سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ)) "قوم کا سردار اُس کا خادم ہوتا ہے"۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جی ہاں، بہت اعلیٰ بات ہے، بڑی اچھی شاعری کی ہے آپ نے، لیکن یہ ہونے والی بات نہیں ہے، سردار، سردار ہوتا ہے، خادم کیسے ہوگا؟ لیکن کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عملی نمونہ دکھا دیا یا نہیں؟ کیا خلیفہ وقت کی حیثیت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اٹھا کر اس خاندان کو نہیں پہنچائی جس کے بچے بھوک کی وجہ سے بلبلا رہے تھے؟ لاکھوں مربع میل کے اوپر ان کا حکم چل رہا ہے اور اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اور دیگر سامانِ خورد ونوش اٹھا کر انہیں پہنچا کر آتے ہیں۔ غلام نے کہا بھی کہ حضور میں حاضر ہوں، مَیں لیے چلتا ہوں۔ فرمایا: نہیں، قیامت کے دن تم میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ رات کے وقت گشت کر رہے ہیں اور ایک گھر سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس کی تیمارداری کرنے والی کوئی عورت، کوئی دایہ نہیں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گھر جا کر خاتونِ اول یعنی اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر آئے اور آپؓ کی اہلیہ نے جا کر وہاں دایہ گیری کی۔ تو "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" کا نقشہ دکھایا یا نہیں؟ اسی طرح انسانی مساوات کا نقشہ پیش کر کے دکھایا یا نہیں؟ بیت المقدس کا سفر ہو رہا ہے، سرکاری سفر ہے، کوئی پرائیویٹ سفر نہیں ہے، کوئی علاج معالجے کے لیے نہیں جا رہے، معاذ اللہ، بلکہ بیت المقدس کا چارج لینے کے لیے جا رہے ہیں، اور کس شان کے ساتھ کہ صرف ایک اونٹ اور ایک خادم ساتھ لیا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دستہ ہونا چاہیے، کوئی باڈی گارڈ ہونے چاہئیں۔ آج کل کہا جاتا ہے کہ کوئی باقاعدہ گروہ ساتھ جانا چاہیے، جس کو Entourage کہا جاتا ہے۔ ایک خلیفہ وقت ہے، ایک ان کا

Salman Saleem 03067163117

خادم اور ایک اونٹ۔ چونکہ راستے کا راشن بھی اسی اونٹ پر ہے لہٰذا ایک وقت میں صرف ایک آدمی سوار ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایک منزل حضرت عمر رضی اللہ عنہ اوپر بیٹھتے ہیں اور خادم نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتا ہے۔ اگلی منزل میں خادم اوپر بیٹھتا ہے اور خلیفہ وقت نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتے ہیں۔ جب بیت المقدس میں پہنچے ہیں تو وہاں غلغلہ مچ گیا کہ ''آ گئے عمر، آ گئے عمر رضی اللہ عنہ''۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اس محاذ کے سپہ سالار تھے، وہ استقبال کے لیے آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ اونٹ کی نکیل پکڑے چلے آ رہے ہیں اور خادم اونٹ پر بیٹھا ہے، اس لیے کہ آخری منزل میں سوار ہونے کی باری اس کی تھی۔ حالانکہ اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ خدا کے لیے امیر المؤمنین، آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں، لوگ کیا کہیں گے! لیکن آپ نے فرمایا: اَلدَّوْرُ دَوْرُكَ۔ نہیں! اب باری تمہاری ہے۔ یہ حساب کا معاملہ ہے، تمہاری باری ہے، تم بیٹھو۔ راستے میں کہیں کیچڑ بھی تھا، لہٰذا جوتے اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے ہیں تو ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے ہوئے ہیں اور ایک میں اونٹ کی نکیل پکڑ رکھی ہے۔ اس دور میں یہ کہانیاں معلوم ہوتی ہیں، اَن ہونی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ مصدقہ تاریخی واقعات ہیں۔ یہ کوئی پانچ چھ ہزار سال پرانی بات نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کے اندر چودہ سو برس کیا ہوتے ہیں! یہ تمام تاریخ محفوظ ہے، ایک ایک چیز محفوظ ہے۔ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رسالت کی تکمیل اس درجے میں یوں ہوئی کہ جو دین حق آپؐ پر کامل ہوگیا، اسے آپؐ نے عملاً قائم کر کے اور نافذ کر کے دکھایا۔ یہ ہے درحقیقت تکمیلِ رسالت کا مظہرِ اول۔

تکمیلِ رسالت کا مظہرِ ثانی، جو میں بیان کرنے لگا ہوں، یہ معمولی بات نہیں، بلکہ بہت بڑی بات ہے اور سیرت کا یہ حصہ اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ ہمارے ہاں میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں، سیرت کے جلسے ہوتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مناقب بیان کیے جاتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلتیں بیان ہوتی ہیں، آپؐ کے گیسوؤں کی بات ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ تھا یا نہیں تھا، اس کی باتیں ہوتی ہیں، حالانکہ یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہیں، جبکہ اصل سیرت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر کی ہے اور اس میں معجزات کا عمل دخل نہ

ہونے کے برابر ہے۔آپ ﷺ نے تکلیفیں جھیل کر، مصائب برداشت کر کے، فاقے جھیل کر، زخم جھیل کر، اپنا خون زمین پر گرتا ہوا دیکھ کر، اپنے ۲۵۹ جان نثاروں کی لاشیں دیکھ کر اور خاک وخون سے گزر کر یہ کام کیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ بس دعا مانگی اور بیڑا پار ہو گیا۔تین برس کی شعب بن ہاشم کے اندر نظر بندی کو یاد کیجئے۔یہاں کی جیل میں کھانے کو تو ملتا ہے، وہاں کھانے کی بھی پابندی تھی۔اس دوران ایسا وقت بھی آیا کہ بنو ہاشم کے پھول جیسے بچے بھوک سے بلکتے تھے اور اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ سوکھا چمڑا ابال کر اس کا پانی ان کے حلق کے اندر ٹپکا دیا جائے۔

اور طائف میں جو نقشہ پیش آیا ہے ؎

رسوا سر بازارے آں شوخ ستم گارے

اور ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے، سو گزری — تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار!

طائف پہنچ کر آپ ﷺ نے وہاں کے تینوں بڑے سرداروں سے گفتگو کی۔اس کے جواب میں انہوں نے ایسے چبھنے والے جملے کہے جو کلیجے کو چیر دیتے ہیں۔پھر آوارہ لڑکوں کو اشارہ کیا کہ ذرا ان کی خبر لو، یہ نبی بنے پھرتے ہیں، نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔اور وہ پتھراؤ شروع کر دیتے ہیں۔ساتھ صرف ایک جان نثار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔وہ سامنے سے آکر روک بنتے ہیں، ڈھال بنتے ہیں تو پیچھے سے پتھر آرہے ہیں، وہ پیچھے کی طرف جاتے ہیں تو سامنے سے پتھر آتے ہیں۔جسم اطہر لہولہان ہو گیا ہے، خون بہہ بہہ کر جا کر جوتیوں میں جم گیا ہے۔غشی طاری ہوئی ہے، آپ ﷺ تھک کر بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آئے ہیں۔ایک نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا، دوسرے نے دوسری بغل میں ہاتھ ڈالا کہ اٹھ جاؤ۔محمد عربیؐ ہیں، سید المرسلینؐ ہیں، محبوبِ رب العالمینؐ، سیّد الاولین والآخرین ﷺ ہیں اور یہ نقشہ ہے۔یہ ہے سیرت، جسے بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔اس موقع پر حضور ﷺ کے قلب کی گہرائیوں سے جو دعا نکلی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے۔جب وہاں سے نکل کر باہر آئے اور ایک باغ میں تھوڑی سی دیر کے لیے ستانے کو بیٹھ گئے تو وہاں اب آپؐ نے مناجات کی ہے: ((اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ

Salman Saleem 03067163117

اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ)) ''اے اللہ! تیری جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں اپنے وسائل اور طاقت کی کمی کی، اور لوگوں کے سامنے جو رسوائی ہو رہی ہے اس کی''۔ کہاں جاؤں، کس سے فریاد کروں؟ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں۔ ((اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟)) ''تو نے مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے؟'' ((اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَ اَمْرِیْ؟)) ''کیا دشمن کے حوالے مجھے کر دیا ہے کہ جو چاہے کر گزرے؟'' ذرا اندازہ کیجیے! یہ الفاظ کہاں سے نکل رہے ہیں۔ لیکن پھر یہ فریاد کیا رخ اختیار کرتی ہے: ((اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ)) ''پروردگار! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے''۔ ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

یہ میں نے سیرت کا ایک نقشہ دکھایا ہے۔ وحی کے آغاز کے بعد سے حضور ﷺ کی ۲۳ برس کی زندگی دن رات کی مشقت اور محنت سے عبارت ہے۔ جو نکتہ سمجھنے کا ہے، وہ کیا ہے! اس جدوجہد میں معجزات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ کفارِ قریش کہتے تھے کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات ملے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو معجزے ملے ایسا کوئی معجزہ دکھاؤ۔ اللہ کا فیصلہ تھا کہ نہیں دکھائیں گے، ہمارا معجزہ قرآن ہے! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو دیکھ کر کون ایمان لے آیا تھا؟ کیا فرعون نے مان لیا تھا؟ کیا یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آئے تھے؟ ایسے معجزے جن سے بڑے حسی معجزے ممکن ہی نہیں ہیں۔ مردے سے کہا جائے "قُمْ بِاِذْنِ اللہِ" اور وہ کھڑا ہو جائے، چلنا شروع کر دے یا یہ کہ گارے سے ایک پرندے کی شکل بنائی، اس میں پھونک ماری اور وہ اڑتا ہوا پرندہ ہو گیا۔ احیائے موتیٰ اور تخلیقِ حیات سے آگے کوئی شے ہے؟ باقی یہ کہ مادرزاد اندھے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کی بینائی آ گئی، یہ تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں۔ تو کیا مُردوں کو زندہ ہوتے دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے آئے؟ نہیں، بلکہ لوگوں نے کہا یہ جادوگر ہے اور جادو کفر ہے، لہٰذا کافر ہو گیا، مرتد ہو گیا، واجب القتل ہے، اس کو سولی پر چڑھا دو۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں طے کیا کہ اب معجزے نہیں دکھائے جائیں گے۔ کوئی ہدایت کا طالب ہے تو قرآن موجود ہے، جو سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اور کوئی ہدایت کا طالب نہیں ہے

Salman Saleem 03067163117

تو بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے گا۔

خاص طور پر یہ بھی نوٹ کیجیے کہ جب بنی اسرائیل کو صحرا میں بھوک لگی تھی اور کھانے کو کچھ نہیں تھا تو من وسلویٰ نازل ہوئے تھے یا نہیں؟ لیکن یہاں جیش العسرہ، سفرِ تبوک کے دوران بھوک کا یہ عالم اور رسد کی کمی کا یہ حال کہ تین تین مجاہدین کو چوبیس گھنٹوں کا راشن ایک کھجور دی گئی۔ پہلے ایک شخص نے اسے منہ میں رکھا اور چوس لیا، پھر دوسرے کو دے دیا، اس نے چوس لیا، پھر تیسرے کو دے دیا۔ اس سے تینوں کو کچھ گلوکوز مل گیا، کچھ انرجی حاصل ہوگئی۔ بتایئے! من وسلویٰ کیوں نازل نہیں ہوا؟ کیا بنی اسرائیل اللہ کو زیادہ محبوب تھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں سے؟ کیا موسیٰ علیہ السلام زیادہ عزیز تھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے؟ غزوۂ خندق کے اندر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ کئی کئی وقت کا فاقہ ہے، کمریں دوہری ہوئی جارہی ہیں تو کمر سے پتھر باندھ لیے ہیں۔ پیٹ کے اوپر پتھر رکھا اور چادر سے کس لیا تاکہ کمر سیدھی رہے۔ پھر صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر فریاد کی کہ حضور! اب یہ فاقہ کشی ناقابل برداشت ہورہی ہے، دیکھئے ہم نے یہ پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا کرتہ مبارک اٹھا کر دکھاتے ہیں، وہاں دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ سارے نقشے سیرت کے ہیں، لیکن ہمارے ہاں سیرت کے جلسے ہوتے ہیں تو ان کا موضوع کیا ہوتا ہے؟

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری    آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تمام انبیاء کو جو خوبیاں دی گئیں وہ ساری کی ساری تنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے دی گئیں۔ یوسف علیہ السلام بہت حسین تھے، ان سے بڑھ کر حسن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کر دیا گیا۔ دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا جیسے معجزات آپ کو عطا کر دیے گئے!..... لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث آپ کو کوئی نہیں سنائے گا کہ "تمام نبیوں پر جو تکالیف آئی ہیں، میں نے تنہا وہ ساری جھیلی ہیں"۔ بہرحال اس پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو انقلاب برپا کیا یہ معجزوں سے نہیں ہوا، یہ دعاؤں سے نہیں ہوا۔ یقیناً دعائیں بھی ہوئی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، اللہ کی مدد بھی آئی ہے، مثلاً غزوۂ بدر میں اللہ کی مدد آئی ہے اور مدد کا دروازہ آج بھی بند نہیں ہے۔

Salman Saleem 03067163117

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

مدد تو اب بھی آئے گی۔ معجزہ صرف نبیوں کے لیے ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی بعض معجزے ہیں۔ بعض مواقع پر تھوڑا سا کھانا بہت سے لوگوں کے لیے کفایت کر گیا۔ ایسی کرامات کی نوعیت کی چیزیں ضرور ہوئی ہیں، لیکن ایسے معجزات نہیں آئے جیسے ہم بنی اسرائیل کے معاملے میں دیکھتے ہیں کہ دھوپ پریشان کر رہی ہے تو ساتھ کے ساتھ بادل چل رہا ہے: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط بنی اسرائیل چھ لاکھ تھے جو مصر سے نکلے تھے۔ اندازہ کیجیے کہ یہ قافلہ جب چلتا ہوگا تو کتنا بڑا ایریا ہوتا ہوگا، اور اس کے اوپر سائبان کی طرح مسلسل ابر ساتھ ساتھ جا رہا ہوتا۔ یہاں تو نہیں ہوا! یہاں جو کچھ ہوا ہے، زمین پر قدم بقدم چل کر ہوا ہے، عام انسانی سطح پر ہوا ہے، محنت اور مشقت سے ہوا ہے، تکلیفیں جھیل کر اور مصائب برداشت کر کے ہوا ہے، آزمائشوں اور امتحانات سے گزر کر ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا خون دو مرتبہ گرا ہے۔ اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی خواہش تو یہ تھی:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، لَوَدِدْتُّ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ))
(صحیح البخاری)

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میری شدید خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔“

لیکن اللہ کے رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ رسول اور نبی میں فرق ہے۔ ایک فرق یہ نوٹ کر لیجئے کہ نبی تو قتل ہو سکتا ہے لیکن رسول قتل نہیں ہو سکتا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف نبی تھے، قتل ہو گئے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف نبی

نہیں تھے، رسول بھی تھے (وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ) لٰہذا وہ قتل نہیں ہو سکتے تھے، وہ سولی نہیں چڑھائے جا سکتے تھے، انہیں زندہ آسمان پر اٹھایا گیا، اور وہ دوبارہ آئیں گے۔ بہر حال یہ ہے میرے نزدیک تکمیل رسالت کا دوسرا مظہر۔

## معراجِ انسانیت کا مظہرِ اَتم

تکمیل رسالت کے دوسرے مظہر کے لیے میں نے یہ عنوان مزید قائم کیا ہے۔ دیکھئے اللہ نے انسان کو پیدا کیا، آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، خلیفۃ اللہ بنایا، مسجودِ ملائک بنا دیا، تمام فرشتے ان کے سامنے جھکا دیے۔ قرآن حکیم میں ایک سے زائد مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ یہاں جمع کے تین اسلوب ہیں: فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ "تمام فرشتوں نے سجدہ کیا"۔ کُلُّہُمۡ "سب نے کیا"۔ اَجۡمَعُوۡنَ سب نے مل کر کیا۔ لیکن اس انسان کے اندر اللہ نے کیا کیا قوتیں رکھی ہیں، اس کا کامل ترین مظہر شخصیت محمدیؐ ہے۔ انسانیت کی عظمت کو دیکھنا ہو، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ محمد عربی ﷺ ہیں۔ علامہ اقبال نے غالب کے بارے میں ایک شعر کہا تھا: ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

اے غالب! تیری شخصیت اور تیرے اشعار سے انسان کی سوچ پر یہ بات کھلی کہ انسان کا تخیل کہاں تک جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان میں اللہ تعالیٰ نے کتنی طاقت رکھی ہے۔ لٰہذا معراجِ انسانیت کا ظہور اور اس کا مظہرِ اَتم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

## تکمیل رسالت کا منطقی نتیجہ

تکمیل رسالت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے رسول آئے وہ کسی قوم کے لیے، کسی علاقے کے لیے یا کسی شہر کے لیے آئے، پوری نوعِ انسانی کے لیے کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا۔ محمد عربی ﷺ اللہ کے واحد رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں

Salman Saleem 03067163117

ارشاد ہوا: اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ ''ہم نے نوح کو بھیجا اس کی قوم کی طرف''۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ آپؑ قومِ عاد کے لیے بھیجے گئے: وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًاط اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام قومِ مدین کی طرف بھیجے گئے: وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًاط

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اشکال پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اس وقت پوری دنیا میں ہیں اور ساری نسلوں کے لوگ ہیں۔ مشرقِ بعید میں چلے جایئے، عیسائیت موجود ہے۔ تاریک براعظم افریقہ کے گھنے ترین جنگلات میں کانگو کے تاس میں پہنچ جایئے، وہاں آپ کو عیسائی مل جائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائی مشنریز نے تبلیغ کے ضمن میں بہت کارنامے کیے ہیں اور عیسائیت کو جہاں جہاں پہنچایا ہے، عام انسانوں کا وہاں پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ کے ملک میں جیکب آباد میں عیسائی مشن قائم ہیں۔ وہاں اتنی شدید گرمی ہے کہ ہم بھی وہاں پر جاتے ہوئے گھبراتے ہیں، لیکن وہاں انہوں نے اپنے مشن قائم کیے۔ تو اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہو، لیکن اس نکتے کو سمجھ لیجیے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اور منصوص اور منقول ہونے کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں کہا گیا: وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ''وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ قرآن کی اس نصِ قطعی کے علاوہ خود انجیل میں موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں''۔ پھر جب آپؑ نے اپنے بارہ حواریوں کو بھیجا کہ جاؤ، اب جو چیز تمہیں مجھ سے ملی ہے اسے تقسیم کرو، لوگوں میں پہنچاؤ، تبلیغ کرو، تو ساتھ ہی فرمادیا کہ تمہیں Gentiles میں تبلیغ نہیں کرنی ہے۔ یہ Goyems اور Gentiles یہود کی اصطلاحیں ہیں۔ یہودی سمجھتے ہیں کہ دراصل انسان تو صرف ہم یہودی ہیں، باقی جو مختلف نسلوں کے انسان ہیں، یہ انسان نما حیوان ہیں۔ ان کی شکلیں انسانوں کی سی ہیں، حقیقت میں یہ حیوان ہیں اور ان کے لیے یہودی Goyems اور

Gentiles کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ انجیل میں موجود ہے کہ Gentiles کو تبلیغ کرنے سے حضرت مسیح علیہ السلام نے روکا۔ بلکہ انجیل میں جو الفاظ ہیں وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ نہیں ہو سکتے، اس میں یقیناً کسی اور نے نمک مرچ ملا دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ "کوئی شخص بھی اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتے کے آگے نہیں ڈالتا۔"

بہر حال یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور انجیل سے بھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ یہ تو اصل میں سینٹ پال تھا، جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دین کو ختم کر دیا اور مسیحیت کے نام پر اپنا خود ساختہ مذہب دنیا میں پھیلا دیا، جیسے ہمارے ہاں عبداللہ بن سبا یہودی، اسلام کا شدید دشمن، ایک موقع پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آ گیا اور اس نے مسلمانوں کے اندر رخنہ پیدا کیا، بنواُمیہ اور بنو ہاشم کی پرانی چپقلش کو زندہ کیا اور کہا کہ اللہ کے رسولؐ کے وصی تو علی ہیں، خلافت ان کا حق ہے، یہ عثمان جو بیٹھا ہے یہ غاصب ہے، اور اس سے پہلے ابوبکر اور عمر بھی غاصب تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، نقلِ کفر، کفر نباشد) بہر حال اسی کے پھیلائے ہوئے فتنے کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔ پھر ساڑھے چار برس تک مسلمان آپس میں لڑتے رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے دوران ساڑھے چار سال میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے ختم ہوئے۔ تو وہ جو اسلامی فتوحات کا سیلاب پوری طرح دنیا پر چھا رہا تھا، جس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں ع

تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

وہ سیلِ رواں تھم گیا۔ اسلام کی جو پیش قدمی دائیں اور بائیں دونوں طرف ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ ورنہ اُسی وقت پوری دنیا میں اللہ کے دین کا بول بالا ہو چکا ہوتا۔

اسی طرح نام نہاد سینٹ پال کا معاملہ تھا۔ جب تک حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں موجود رہے وہ آپؑ کا شدید ترین مخالف رہا۔ جب حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ نے اٹھا لیا تو اب وہ منافقت کا لبادہ اوڑھ کر آ گیا کہ مجھے مکاشفہ ہوا ہے، مسیح علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہے اور اب میں مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا ہوں اور مسیح علیہ السلام نے مجھے یہ حکم دیا ہے، یہ مقام

Salman Saleem 03067163117

عطا کیا ہے۔ پھر وہ متبعین مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا لیڈر بن گیا اور اس نے مسیحیت میں وہ تبدیلیاں کیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دین کو یکسر ختم کر دیا۔ عبداللہ بن سبا بھی ہمارے دین کو ختم کر دینا چاہتا تھا، لیکن یہ آخری دین تھا، اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی ہے، جبکہ سینٹ پال نے توفی الواقع حضرت مسیح علیہ السلام کے دین کو ختم کر دیا۔ سب سے بڑا کام یہ کیا کہ توحید کو تثلیث سے بدل دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے کسی قول کے اندر تثلیث موجود نہیں ہے۔ آپ چاروں اناجیل پڑھ جایئے، اگرچہ یہ تحریف شدہ اناجیل ہیں پھر بھی کہیں بھی آپ کو تثلیث کا جملہ نہیں ملے گا۔ یہ سینٹ پال کی ایجاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شریعت کو ساقط کر دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام یہ کہہ کر گئے تھے کہ جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہے وہ تم پر بھی نافذ رہے گی، لیکن اس نے شریعت موسوی کو ساقط کر دیا۔ تیسرے یہ کہ مسیحیت کی تبلیغ کا دائرہ Gentiles یعنی غیر اسرائیلیوں کے اندر وسیع کر دیا، ورنہ از روئے قرآن اور از روئے انجیل، حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے قول کے مطابق آنجناب ؑ کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور آخری رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون قرآنِ مجید میں پانچ مرتبہ، مختلف الفاظ میں، آیا ہے۔ سب سے واضح انداز میں سورۂ سبا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا (آیت ۲۸) ''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○ (آیت ۱۰۷) ''ہم نے آپ کو (کسی ایک قوم یا کسی ایک علاقے کے لیے نہیں بلکہ) تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ نبوت و رسالت ہمیشہ سے رحمت ہے، مگر آپ ؐ پر آ کر یہ رحمت ''رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ'' بن گئی ہے، یہ تکمیل رسالت کا ایک مظہر ہے۔ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا گیا: قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا ''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ڈنکے کی چوٹ) کہہ دو: اے لوگو! (اے بنی نوعِ آدم!) میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

## تکمیل رسالت کا تشنۂ تکمیل مظہر

اب دیکھیے، مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات! ختم رسالت کا یہ پہلو اور یہ مظہر تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اللہ نے بھیجا حضرت محمد ﷺ کو غلبہ دین کے لیے (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ) تا کہ دین حق کو غالب کر دیں تمام ادیان پر اور بھیجا پوری نوعِ انسانی کے لیے۔ ان دونوں باتوں کو جوڑیے، صغریٰ کبریٰ ملا دیجیے تو بعثتِ محمدی ﷺ کا مقصد یعنی تکمیل رسالت کا آخری مرحلہ وہ ہوگا کہ جب کل نوعِ انسانی پر اللہ کا دین غالب آجائے۔ علامہ اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' میں بڑی پیاری بات کہی ہے:

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے! نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!!

یہ کام ابھی نہیں ہوا۔ پوری نوعِ انسانی تک تو یہ دین نہیں پہنچا۔ پوری نوعِ انسانیت پر اللہ کے دین کا غلبہ نہیں ہوا۔ لیکن نوٹ کر لیجیے کہ یہ ہو کر رہنا ہے۔ ''نویدِ خلافت'' نامی کتابچے میں وہ احادیث درج ہیں جن میں حضور ﷺ نے یہ خبریں دی ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے زمانے سے لے کر تا قیامِ قیامت پانچ ادوار گنوا دیے ہیں: (۱) دورِ نبوت (۲) خلافت علیٰ منہاج النبوۃ، یعنی خلافت راشدہ (۳) ظالمانہ ملوکیت (۴) غلامی والی ملوکیت (۵) پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔ اس وقت نوعِ انسانی اس پانچویں دَور کی دہلیز تک پہنچی ہوئی ہے، گویا یہ دَور آیا چاہتا ہے، زیادہ دُور نہیں ہے۔ ''نوید خلافت'' نامی کتابچہ ہم نے لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے۔ موجودہ ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے جو حالات ہیں، ان سے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

اس نااُمیدی کے چکر سے نکلنے اور ''دامانِ خیالِ یار'' کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے ان احادیث کو حرزِ جان بنائیں، انہیں پڑھیں، یاد کریں، انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اپنے طور پر اس کتابچے کو چھاپیں اور تقسیم کریں۔

Salman Saleem 03067163117

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا، وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَازُوِیَ لِیْ مِنْھَا)) (صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا) تو میں نے اس کے تمام مشرق اور تمام مغرب دیکھ لیے۔ اور سن رکھو! میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو سکیڑ کر اور لپیٹ کر مجھے دکھا دیے گئے۔''

کوئی شک ہے؟ کیسے ہوسکتا ہے کہ دنیا ختم ہو جائے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تکمیل رسالت کا یہ مظہر پورا نہ ہو کہ کل روئے ارضی پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین، دین الحق اسی طرح غالب ہو جائے جیسے آپؐ کے دست مبارک سے جزیرہ نمائے عرب میں جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ ط کی شان سے غالب ہوا تھا۔ اس کے لیے آپؐ نے تکلیفیں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں، قربانیاں دیں، سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ایک ایک صحابی کی جان ہم جیسے لاکھوں کی جانوں سے بڑھ کر قیمتی ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جان کی قیمت کا ہم کیا اندازہ لگائیں گے! یہ جانیں دی گئیں تب دین غالب ہوا۔ اور اسے پوری دنیا پر غالب ہونا ہے، ورنہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تکمیلِ رسالت کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ دنیا ختم ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تکمیلِ رسالت کا یہ تقاضا کہ کل روئے ارضی پر آپ کا لایا ہوا دین نافذ ہونا ہے، پورا نہ ہو!

ایک اور حدیث جو حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ ....)) (مسند احمد)

''اس روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ ہی کمبلوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ بچے گا جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے۔''

یہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی وقت واقعتاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت بمعنی

Salman Saleem 03067163117

تکمیلِ نبوت و تکمیلِ رسالت کا بتمام و کمال ظہور ہوگا۔ علامہ اقبال نے نبی اکرم ﷺ کی احادیث کے مضامین کو بھی اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ جیسے کہ اپنے بے شمار اشعار کے اندر قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے۔ چنانچہ اس آنے والے دور کے بارے میں کہتے ہیں:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

دیکھیے یہ کام پہلے جب ہوا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے جزیرہ نمائے عرب میں دین کا غلبہ ہو گیا۔ پھر آپؐ کے بعد اس کی توسیع ہوئی۔ اسلامی افواج مشرق و مغرب میں نکل کھڑی ہوئیں۔ مشرق میں عراق سے ہو کر ایران پہنچیں اور پھر یہ پورا ملک جو اس زمانے کا خراسان تھا، فتح ہوا اور پھر چین تک بات پہنچ گئی۔ مغرب میں اسلامی افواج شام اور جزیرہ نمائے سینا کو فتح کرتے ہوئے مصر اور لیبیا جا پہنچیں اور ہوتے ہوتے بحر اوقیانوس تک بات پہنچ گئی۔ از کجا تا بہ کجا! کہاں سے کہاں تک! وہ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا سبائی فتنے نے اندرونی خلفشار پیدا کیا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا جس سے ان کی قوت ٹوٹ گئی۔ جیسے کسی اونچائی پر ٹرک چڑھ رہا ہو اور کہیں موشن ٹوٹ جائے تو اس کے بعد مزید چڑھائی چڑھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت کہ ع ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!'' یکسر تبدیل ہو گئی، ہمارا وہ سیلِ رواں تھم گیا اور reversal شروع ہو گیا۔ اب بھی یہی ہوگا کہ کسی ایک خطے میں اللہ کا وہ نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایسا ہونا ہے، یہ یقینی ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ کب ہوگا! یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کتنی قربانیاں دے کر ہوگا، یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ابھی کتنے نشیب و فراز آئیں گے، ہم نہیں کہہ سکتے۔ میرے مشاہدے میں کچھ اشارات ہیں کہ اب غلبہ اسلام کا آغاز پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان سے ہوگا۔ اگرچہ موجودہ حالات بڑے تباہ کن ہیں، افسوس ناک ہیں، افغانستان میں طالبان کی

Salman Saleem 03067163117

قائم کردہ اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، جہادِ کشمیر پر ریورس گیئر لگ چکا ہے۔ اللہ نہ کرے، لیکن بش صاحب نے اپنی سیکرٹ ایجنسیوں کو ایسی تیاریاں مکمل کرنے کا حکم دے دیا ہے کہ اگر ذرا سا بھی اندیشہ ہو کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں تک بنیاد پرستوں کی رسائی ہو سکتی ہے، تو ان پر فوراً قبضہ کر لیا جائے۔ سود کے خاتمے کے بارے میں ہمارے یہاں جو پیش رفت ہوئی تھی، اب اس پر بھی ریورس گیئر لگ گیا ہے اور اس ضمن میں ربع صدی کی مساعی پر خطِ تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔ تو حالات بڑے نامساعد اور ناموافق ہیں۔ لیکن ؎

اور بھی دَور فلک ہیں ابھی آنے والے — ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

اور ع جو تھا، نہیں ہے، جو ہے، نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!

ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی حالات ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان شاء اللہ العزیز اسی خطہ ارضی سے غلبہ اسلام کا آغاز ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے چار پانچ سو سال سے اس کی تمہید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت میں پاکستان سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہے۔

## پس چہ باید کرد؟

ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اللہ کے دین کے غلبے اور اس کی اقامت کے لیے کمر کس لے۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے، کیا نہیں ہوتا، یہ میرے اور آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں اس کے بارے میں جواب دہ ہوں، آپ جو کچھ کر سکتے ہیں، جو بھی آپ کے اختیار میں ہے اس کے لیے آپ عند اللہ مسئول ہیں، ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت محمد رسول اللہ ﷺ کی وفاداری کے ساتھ مشروط ہے۔ ع "کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں!" چنانچہ جن کو محمد ﷺ کے ساتھ وفا کا دعویٰ ہے وہ اپنے سر پر کفن باندھ کر اور یہ عہد کر کے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۲) "یقیناً میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔" اللہ کے دین کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے اُٹھ کھڑے

Salman Saleem 03067163117

ہوں۔اس لیے کہ تکمیل رسالت محمدیؐ کا آخری مرحلہ ابھی باقی ہے، جس کی خبر دی ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ یہ ہونا ہے۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کا تقاضا بتمام وکمال پورا نہ ہو اور دنیا ختم ہو جائے!

دنیا کے خاتمے سے پہلے چہار دانگ عالم پر، کُل عالمِ انسانیت پر اللہ کا دین نافذ ہوگا۔ اسی کام کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ ہم نے اللہ سے پکار پکار کر، چیخ چیخ کر دعائیں کی تھیں کہ اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے، ہم تیرے نبی کے دین کا بول بالا کریں گے، پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ہم پاکستان میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے اور اسی لیے ہمیں معجزے کے طور پر یہ ملک ملا تھا، لیکن افسوس، صد افسوس! اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی۝ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی۝ ۵۵ برس گزر گئے لیکن اسلام یہاں نہیں آیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ اللہ تعالیٰ نے پہلے ۲۵ برس ہمیں مہلت دی تھی۔ جب ہم نے اسلام نافذ نہیں کیا تو اللہ نے عذاب کا ایک کوڑا ہماری پیٹھ پر برسایا۔ ہندوستان کے ہاتھوں ۱۹۷۱ء کی شکست عظیم یاد ہے؟ ہمارے ۹۳ ہزار فوجی اس ہندو کے ہاتھوں جنگی قیدی بنے جس پر ہم نے کہیں ہزار برس حکومت کی تھی، کہیں چھ سو برس اور کہیں آٹھ سو برس۔ اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے اور اس نے یہ بھی کہا کہ:

"We have avenged our thousand years defeat."

کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔

غور کیجیے کہ اللہ کے عذاب کا یہ کوڑا کیوں پڑا؟ اس لیے کہ ہم نے اللہ کے دین کے ساتھ بے وفائی کی، اللہ کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور اللہ کے دین کو نافذ نہیں کیا۔ اور اب جو حالات ہیں وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ ہم امریکہ کے ہاں گروی رکھے جا چکے ہیں، ہمارے Bases اس کے کنٹرول میں ہیں۔ ایف بی آئی، سی آئی اے اور موساد پاکستان میں موجود ہے۔ ہمارے ایئرپورٹس پر ان کے معین حصے ہیں، ہماری خود مختاری گویا گروی رکھ دی گئی ہے۔ دوسری طرف بھارت کی دھمکی آمیز روش اور اس کی رعونت کو دیکھئے کہ کتنے

Salman Saleem 03067163117

بڑے پیمانے پر اس نے ہماری سرحدوں پر فوجیں لا کھڑی کی ہیں اور ہم اس سے معذرت کر رہے ہیں کہ دراندازی بالکل بند ہو چکی ہے۔ حالانکہ پہلے ہم کہہ رہے تھے کہ یہ تو مجاہدین آزادی ہیں، آزادی کی جدوجہد ان کا حق ہے، لیکن اب ہمیں اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑا ہے۔ یہ حالات ہیں جس میں اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ کے عذاب کا بڑا کوڑا ہماری پیٹھ پر نہ برس جائے۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کے علم میں ہوگا کہ آج سے کوئی سال بھر پہلے امریکہ کے ایک بہت بڑے تھنک ٹینک کی طرف سے یہ بات آ چکی ہے کہ ۲۰۲۰ء میں پاکستان کے نام سے کوئی ملک دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو! اللہ تعالیٰ ان کے عزائم کو خاک میں ملانے پر قادر ہے، لیکن اگر ہمارے چلن یہی رہے تو شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لے۔ ہم نے موٹروے بنالی، ہم نے بڑے بڑے محل بنالیے۔ کراچی، لاہور اور پشاور کی ڈیفنس سوسائٹیاں ذرا جا کر دیکھئے کہ کیسے کیسے محلات تعمیر کیے گئے ہیں۔ اسلام آباد کے بنگلے دیکھئے کہ دو دو، تین تین کروڑ کا ایک ایک بنگلہ ہے، لیکن ہم اسلام نافذ نہیں کر سکے۔ یہ جرم ہمارا ایسا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس پر اللہ آخری سزا دے دے اور ہوسکتا ہے کہ ابھی کچھ مہلت باقی ہو۔ بہرحال ایک بات محاورے کے طور پر کہی جاتی ہے کہ ''جب تک سانس تب تک آس''۔ جب تک اللہ نے مہلت دے رکھی ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ کرنا کیا ہے، یہ جان لیجیے!

میرے اب تک کے بیان سے بھی یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ اسلامی نظام کا قائم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس راہ میں اپنے دندانِ مبارک شہید کروانے پڑے، اپنے خون کا فوارہ چھٹروانا پڑا، اور ۲۵۹ صحابہ کی جانوں کا نذرانہ دینا پڑا، جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی۔ آج بھی یہ کام آسان نہیں ہے۔ ع ''لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!'' آج اسلام کے نفاذ کے لیے ہماری تنظیم اسلامی کا جو طریقہ کار ہے، وہ میں اب آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

(۱) پہلا مرحلہ یہ ہے کہ خود اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اسلام نافذ کیا جائے۔ سب سے مشکل کام یہی ہے۔ ع ''منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!'' ہمارے عوام کی

Salman Saleem 03067163117

عمومی روش یہ ہے کہ ہم سے نعرے لگوا لو، چندے لے لو، جلوس نکلوا لو، جلسے کروا لو، لیکن ہماری زندگی کا جو نقشہ ہے وہ نہیں بدلے گا۔ اگر سودی کاروبار ہے تو وہ جاری رہے گا، اگر سودی قرضہ لے کر محل بنایا ہے تو وہ باقی رہے گا، اگر گھر میں شرعی پردہ نہیں ہے تو نہیں آئے گا، تو اسلام کیسے آجائے گا؟ لہٰذا جس کا بھی ارادہ ہو، جسے بھی اللہ تعالیٰ آپ میں سے قبول فرمالے اسے پہلا فیصلہ یہ کرنا ہوگا کہ مجھے اپنی زندگی سے حرام کو نکال دینا ہے، فرائض و واجبات کی پابندی کرنی ہے، ارکانِ دین کی بجا آوری تمام شرائط کے ساتھ کرنی ہے۔ پھر یہ کہ اپنے وجود پر اور اپنے گھر پر شریعت کا مکمل نفاذ کرنا ہے۔

(۲) شریعت پر کاربند ہونے کا عزم کر لینے والے پھر مل جل کر ایک طاقت بنیں۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) یعنی اللہ کی تائید اور اللہ کی نصرت جماعت کے ساتھ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول تو یہاں تک ہے: ((لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ)) ”جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں ہے“۔ چنانچہ جماعت کی شکل اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی بنائی۔ ہمارا سیاست کا کھیل کھیلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو اپنی زندگی کے دس سال جماعت اسلامی کی تحریک کی نذر کر کے پھر وہاں سے نکلا تھا، اور اسی بنیاد پر نکلا تھا کہ آپ نے جو الیکشن کا راستہ اختیار کیا ہے اس سے آپ عام معنی میں سیاسی جماعت بن گئے ہیں، اب آپ وہ انقلابی جماعت نہیں رہے جس میں مَیں نے شمولیت اختیار کی تھی۔ ہماری دعوت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں آنے والے لوگ پہلے اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اللہ کے دین کو نافذ کریں، جو بڑا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری رفتار بڑی کمزور ہے۔ لوگ نعرے لگانے کو تیار ہیں، کسی کو کافر کہلانا ہو تو نعرے لگا دیں گے، کسی کے خلاف کوئی مہم اٹھانی ہو تو اٹھا دیں گے، مگر خود اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (الرعد:۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو نہ بدلے۔ تو پہلا قدم اپنے آپ کو بدلنا اور دوسرا قدم مل جل کر جماعت بنانا ہے۔

Salman Saleem 03067163117

دنیا میں جماعت سازی کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ایک دستوری طریقہ ہے کہ اگر آپ کو کسی جماعت کا دستور منظور ہے تو آپ اس کے رکن بن گئے، پھر ارکان جو ہیں وہ صدر یا امیر کا ایک معین مدت دو سال، چار سال یا چھ سال کے لیے انتخاب کریں گے۔ پھر اس امیر یا صدر کے لیے شوریٰ یا مینیجنگ کمیٹی ہو گی۔ اس میں طے کیا جائے گا کہ کتنے اختیار امیر کے پاس ہیں اور کتنے شوریٰ یا مینیجنگ کمیٹی کے پاس ہیں۔ یہ طریقہ کار میرے نزدیک مباح ہے، جائز ہے، حلال ہے، حرام نہیں ہے، لیکن مسنون نہیں ہے۔ جماعت سازی کا مسنون طریقہ بیعت پر مبنی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت علی الموت لی، کہ اپنی جانیں دے دیں گے لیکن یہاں سے نہیں ہلیں گے۔ غزوۂ احزاب میں خندق کھودی جا رہی تھی تو کئی کئی وقتوں کے فاقے کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب پھاوڑے چلا رہے تھے تو ان کی زبان پر ایک شعر تھا، جسے وہ آواز ملا کر پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدَا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدَا

”ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی بیعت کی ہے، اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک جان میں جان ہے۔“

جب جان نکل جائے تو ہماری ذمہ داری ختم ہو جائے گی، جب تک جسم میں جان ہے، یہ جہاد جاری رہے گا۔

اب آپ بیعت کے بارے میں یہ متفق علیہ روایت ملاحظہ کیجئے جس کے راوی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس حدیث میں مذکورہ بیعت نو نکات پر مشتمل ہے اور اسی کو ہم نے تنظیم اسلامی میں اختیار کیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

”ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول سے اس پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم

Salman Saleem 03067163117

سنیں گے اور اطاعت کریں گے، چاہے مشکل ہو چاہے آسانی ہو، چاہے
ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں چاہے ہمیں طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے، چاہے
دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے (ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم آپ کے
پرانے خادم تھے اور آپ نے ایک نو وارد کو ہمارے اوپر امیر کیوں بنا دیا؟
بلکہ یہ آپ کا اختیار ہوگا جسے آپ چاہیں امیر بنائیں) جنہیں امیر مقرر کیا
جائے گا ان سے جھگڑیں گے نہیں (ان کی بھی اطاعت کریں گے) البتہ ہر
موقع پر جو صحیح رائے ہوگی وہ ضرور پیش کر دیں گے، اللہ کے معاملے میں ہم کسی
ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔"

یہ بیعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لی تھی۔ ہم نے اس کو ایک لفظ (فِي الْمَعْرُوف) کے اضافہ کے ساتھ اختیار کر لیا۔ اس لیے کہ امیر تنظیم اسلامی کی بیعت مطلق نہیں ہے، شریعت کے دائرے کے اندر اندر ہے۔ امیر تنظیم شریعت کے کسی حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتا، البتہ اس دائرے کے اندر اندر جو حکم دے گا وہ واجب التعمیل ہے۔

(۳) جو لوگ یہ بیعت کر لیں اور وہ اپنے گھر پر، اپنی ذات پر اللہ کا دین حتی المقدور نافذ کر چکے ہوں اب وہ یہی کام کریں کہ یہ دعوت لوگوں تک پہنچائیں.... زبان سے، کتابوں سے، رسالوں سے، ویڈیوز سے، آڈیوز سے، گفتگو سے اور خطاباتِ عام سے یہ پیغام عام کر دیں، تا کہ لوگ اس جماعت میں شامل ہوں، اور ان کی معتد بہ تعداد ہو جائے۔ پھر ان کی تربیت ہو۔ اور جب تک تعداد اتنی کافی نہ ہو جائے کہ پورے نظام کو چیلنج کیا جاسکے اس وقت تک یہی کام باللسان کرنا ہے، زبان سے نیکی کی بات کرنی ہے، زبان سے برائی سے روکنا ہے اور ساتھ ساتھ تربیت کا عمل جاری رکھنا ہے اور جب طاقت کافی ہو جائے، منظم بھی ہوں، واقعتاً اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار بھی ہوں، تو اب ہم چیلنج کریں گے کہ ہم یہ فلاں حرام کام یہاں نہیں ہونے دیں گے، یا ہم نہیں یا یہ نہیں! گھیراؤ کریں گے، پکٹنگ کریں گے، جلوس نکالیں گے، دھرنے ماریں گے، اپنے سینے کھول کر کہیں گے کہ چلاؤ ہم پر گولی!

Salman Saleem 03067163117

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن  نہ مالِ غنیمت! نہ کشور کشائی!

جو کام ایرانیوں نے کیا وہ یہاں کرنا ہوگا۔ انہوں نے بیس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان جانیں دے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہنشاہ آریا مہر کو جان بچا کر بھاگنا پڑا اور آیت اللہ خمینی پیرس سے نازل ہو کر وہاں کا حکمران بن گیا۔ یہ تو ہماری زندگیوں میں ہوا ہے، کوئی بہت پرانا معاملہ نہیں ہے، ابھی اس کو ربع صدی بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کوئی ازمنہ قدیمہ کی تاریخ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں غلطی یہ ہوئی کہ کچھ لوگوں نے سوچا کہ چلو الیکشن کا راستہ دیکھتے ہیں، ہمیں زیادہ ووٹ مل جائیں گے، حکومت ہماری ہو جائے گی تو ہم اسلامی نظام قائم کر دیں گے۔ لیکن یہ راہِ یسیر راہِ عسیر بن گئی، یہ شارٹ کٹ Longest کٹ بن گئی۔ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ الیکشن میں حصہ لیا تھا، اب ۲۰۰۲ء میں لے رہے ہیں، لیکن ان ۵۱ برسوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ اور سوچیے، کیا آیت اللہ خمینی کی حکومت ایران میں الیکشن کے ذریعے قائم ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں، ناممکن! اس اعتبار سے یہ نہ سمجھئے کہ میں آیت اللہ خمینی کی پوری دعوت اور ان کے عقائد کی تائید کر رہا ہوں۔ نہیں، وہ شیعہ ہیں، ہمارا ان کا بڑا اختلاف ہے، لیکن یہ کہ انقلاب برپا کرنے کے لیے اس وقت دنیا میں آخری قدم الیکشن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ کسی طرح کی دہشت گردی کر کے اور کسی چھاپہ مار جنگ سے بھی اسلام نہیں آئے گا۔ لوگوں نے یہ راستے اختیار کر کے دیکھ لیے ہیں، لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوئی، نہ الجزائر میں نہ مصر میں، حالانکہ بہت سے لوگوں نے جانیں دی ہیں اور خلوص کے ساتھ دی ہیں۔

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے دو ہی راستے ہیں، بیلٹ یا بلٹ۔ لیکن ان دونوں کے علاوہ تیسرا راستہ وہ ہے جو ایرانیوں نے دکھایا۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا هُوَ اَحَقُّ بِهَا)) یعنی حکمت کی بات، دانائی کی بات، عقل کی بات، سمجھ کی بات وہ تو مؤمن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے، جہاں سے بھی مل جائے مؤمن اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ چنانچہ جہاں سے ملے لے لو! شیعہ حضرات نے تو پاکستان میں بھی اپنا مطالبہ منظور کروا کے دکھا دیا تھا۔ ضیاء الحق

Salman Saleem 03067163117

صاحب نے زکوٰۃ آرڈی نینس نافذ کیا تھا جس پر شیعہ بپھر گئے تھے کہ ہم حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اندازہ کیجیے کہ مارشل لاء کی حکومت تھی، اور مارشل لاء ابھی بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء آیا تھا اور ابھی ۱۹۸۰ء تھا۔ اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا، لیکن پچاس ہزار افراد نے اسلام آباد میں جمع ہو کر مرکزی سیکریٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا اور دھرنا مار کر بیٹھ گئے کہ ہمیں زکوٰۃ آرڈی نینس سے مستثنیٰ کیا جائے۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ناک زمین پر رگڑی گئی اور اس نے یقین دہانی کرائی، تب وہ اٹھے۔ یہ طریقہ ہے کام کرنے کا۔ اگر گولی چلتی تو وہ جانیں دیتے۔ ایران میں گولیاں چلی ہیں اور مظاہرین نے جانیں دی ہیں۔ یہاں ضیاء الحق سمجھ دار آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیعوں کے ایسے ہجوم پر اگر گولی چلا دی گئی تو پاکستان میں طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ شیعہ آفیسرز آرمی میں، پولیس میں، بیوروکریسی میں اور ذرائع ابلاغ میں، ہر جگہ موجود ہیں۔ کہاں نہیں ہیں؟ اس لیے اس نے اپنی ناک نیچی کر لی اور ان کا مطالبہ مان لیا۔ یہ طریقہ ہے آج کی دنیا میں مطالبات منوانے کا! لیکن جیسا کہ میں نے کہا، اس کے لیے وہ لوگ تیار ہو جائیں جو خود دین پر کاربند ہو چکے ہوں۔

اس وقت دنیا کے جو حالات ہیں ان میں عالمِ اسلام خصوصاً ہمارے ملک میں شدید مایوسی کی کیفیت ہے۔ اس مایوسی کے ازالے کے لیے ہمیں ان احادیث کی ضرورت ہے جن کا میں نے حوالہ دیا ہے کہ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روشنی کی کرنیں دکھائی ہیں... چنانچہ نہ بش صاحب اترائیں، نہ شیرون اترائے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ ایک ایک یہودی قتل ہو گا، اور عظیم تر اسرائیل بنانے کا جو یہ خواب دیکھ رہے ہیں، وہ ان کا عظیم تر قبرستان بنے گا۔ اس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اور یہ ہو کر رہے گا۔ ابھی حالات ذرا خراب ہیں، لیکن درحقیقت جتنے بھی حالات خراب ہیں، اتنے ہی اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے مواقع زیادہ ہیں۔ حالات آسان ہو جائیں تو نیکی کا وہ اجر و ثواب نہیں ہوتا جو مشکل حالات میں کی گئی نیکی کا اجر و ثواب ہوتا ہے۔ مشکل حالات تو اہلِ ہمت کی ہمت میں مزید اضافہ کرتے ہیں ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ۔۔۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

ان حالات میں ہمارے لیے موقع ہے کہ ہم تن من دھن اللہ کی راہ میں لگائیں اور

Salman Saleem 03067163117

اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے عظیم سے عظیم تر اجر وثواب پائیں۔

یہ ہے تنظیم اسلامی کی دعوت جو میں نے پیش کر دی ہے۔ میری گفتگو کا خلاصہ ایک مرتبہ پھر دیکھ لیجیے۔ ختمِ نبوت کے دو مفہوم: (۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں۔ (۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہو گئی.... تکمیلِ نبوت کے دو مظہر: (۱) ہدایتِ خداوندی قرآن مجید میں مکمل ہوئی اور اسے محفوظ کر دیا گیا۔ (۲) دین حق کامل کر دیا گیا اسلام کی شکل میں: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ.... تکمیلِ رسالت کے دو مظہر: (۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کو قائم کر کے دکھا دیا، وہ صرف نظری بات نہیں تھی، صرف کتاب میں لکھی ہوئی شے نہیں دی، بلکہ عملی نمونہ پیش کیا، حجت قائم کی۔ (۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت تمام دنیا کے لیے ہے۔ آفاقی اور گلوبل رسالت صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، نہ عیسیٰ کی تھی، نہ موسیٰ کی تھی اور نہ ابراہیم کی تھی (علیہم الصلوٰۃ والسلام).... لیکن اس آخری بات کے کچھ عملی تقاضے ہیں۔ اس وقت تو حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں ہم یہ کہہ سکیں کہ پورا اسلام نافذ ہے اور دنیا کو دعوت دے سکیں کہ آؤ دیکھ لو، اپنی آنکھوں سے اسلام کی برکات کا مشاہدہ کر لو کہ یہ اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا جو گلوبل تقاضا ہے یعنی پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ، اس کے لیے محنت و مشقت اور جدوجہد جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی تھی، ہمیں بھی کرنی ہوگی۔ صحابہؓ نے مشقتیں جھیلیں، مصیبتیں اٹھائیں، آزمائشوں میں سے گزرے، عملاً امتحانات کی بھٹیوں میں سے گزرے، تب یہ کام کیا ہے۔ اسی کے لیے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

(بحوالہ ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہم'')

Salman Saleem 03067163117

ڈاکٹر اسرار احمدؒ (۱۹۳۲ء تا ۲۰۱۰ء) مفکر مفسر، داعیِ اسلام.... نہ صرف وطن عزیز بلکہ عالم اسلام کا سرمایہ تھے۔ 50 سال سے زائد عرصہ انہوں نے خدمتِ اسلام اور خدمتِ قرآن میں گزارا۔ ساری زندگی امت مسلمہ کو جگانے اور متحد کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہے تاکہ نشاۃِ ثانیہ کے عمل کا آغاز ہو سکے۔ سیرتِ مبارکہ پر ان کے خطبات عوام وخواص میں بہت مقبول ہوئے۔ زیرِ نظر کتاب انہی خطبات کی تحریری شکل ہے۔

RS. 995/-

**DUA PUBLICATIONS**
Al-Hamd Market, Urdu Bazar,
Tel: 042-37233585 | Cell: 0300-9476417
Email: duapublications@gmail.com

House # 7 Street # 26 Muhallah
Ghani Near Ghani Masjid
Sanat Nagar Lahore.
Cell: 0309-5005471